مسلم ہندوستان

کا

زراعتی نظام

مصنّف

ڈبلو۔ ایچ۔ مورلینڈ

مترجم

جمال محمّد صدّیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ا، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

Muslim Hindustan ka Zara'ati Nizam

***By* : W.H. Morland**

© قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت :

پہلا اڈیشن : 1982

دوسرا اڈیشن : 2003 تعداد 1100

قیمت : =/92

سلسلۂ مطبوعات : 249

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

دیباچہ 7

مقدمہ 10

باب 1 : پچھلے حالات

(1) ہندوؤں کا مقدس قانون

(2) بنیادی رشتہ میں تبدیلیاں

(3) اسلامی نظام

باب 2 : تیرہویں اور چودہویں صدیاں 39

(1) دہلی کی مسلم بادشاہت

(2) تیرہویں صدی

(3) علاء الدین خلجی (1296 – 1316ء)

(4) غیاث الدین تغلق (1320 – 1325ء)

(5) محمد تغلق (1325 – 1351ء)

(6) فیروز شاہ (1351 – 1388ء)

(7) خلاصہ

باب 3 : سید اور افغان سلطانوں کے خاندان 88

(1) فیروز سے بابر تک (1388 – 1526ء)

(2) شیر شاہ اور اس کے جانشین (1541 – 1555ء)

باب 4 : اکبر کا عہد حکومت (1556 – 1605ء) 103

(1) تمہید

(2) تشخیص کے طریقے

(3) جاگیریں

(4) محصلین

(5) نظامِ ضبط کا طریقِ عمل

(6) آخری صورتِ حال

باب 5: سترہویں صدی 151

(1) جہانگیر اور شاہجہاں (58 – 1605ء)

(2) اورنگزیب کے احکام (1669 – 1665ء)

(3) اسلامی تصوّرات کا اطلاق

(4) کسانوں کی قلّت

(5) اورنگزیب اور اس کے جانشینوں کے تحت درمیانی اشخاص

باب 6 : شمالی ہندوستان میں دورِ آخر 185

(1) تمہید

(2) موضوع کی تنظیم

(3) کسانوں کی ادائگیاں

(4) درمیانی اشخاص

(5) اختتامی مشاہدات

باب 7 : دور دراز خطّے 211

(1) دکن

(2) بنگال

باب 8 : خلاصہ 233

ضیمہ جات 241

دیباچہ

اس مقالہ کے مقاصد اور حدود کو تعارف کے عنوان کے تحت بخوبی بیان کیا گیا ہے اور یہاں تفصیلات کے صرف چند ایسے نکتوں کا ذکر ضروری ہے جو قارئین کے لئے معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

میں نے متعدد ماخذ سے مستعار اور اکثر مبہم اصطلاحی زبان کے استعمال سے جو ہندوستان میں زرعی موضوعات کے لئے عام طور پر استعمال کی جاتی ہے گریز کرتے ہوئے انگریزی زبان میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا کرنے کے لئے مجھے متعین اصطلاحیں وضع کرنا پڑی ہیں جن کے لئے میں نے وہی نام منتخب کئے جن کی کم از کم گمراہ کن تعبیریں ممکن ہوں۔ میں نے جن اصطلاحوں کو استعمال کی غرض سے منتخب کیا ہے وہ پوری کتاب میں شروع کے بڑے حرف کے ساتھ طبع کی گئی ہیں جن کا مقصود اشارتاً یہ یاد دلانا ہے کہ ان اصطلاحوں کا وہ متعین مفہوم ہے جو ان کے سب سے پہلے موقع استعمال پر واضح کر دیا گیا ہے۔

بہر حال فارسی الفاظ اور محاوروں کے استعمال سے مکمل پرہیز ناممکن نہ ہو سکا کیونکہ ان کے معنی پر اکثر بحث کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ایسی صورت میں موضوع بحث کا اظہار ضروری ہو جاتا ہے ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان میں نقل کرتے وقت میں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی کونسل کے منظور شدہ نظام کو بطور بنیاد استعمال کیا ہے۔ اس نظام میں حروف علت کا وہی مفہوم ہے جو براعظم (یورپ) میں پایا جاتا ہے اور حروف صحیح کو حسب ضرورت لکیروں اور نقطوں کو ان کے نیچے رکھ کر ممیز کیا گیا ہے۔ یہ لکیریں اور نقطے جو لسانیات کے طالب علم کے لئے تو ناگزیر مگر بدقسمتی سے عام قارئین کے لئے ناگوار ہوتے ہیں اور یہ صحیح طباعت کو بہت زیادہ دقت طلب بنا دیتے ہیں۔ چونکہ میں خاص طور پر ایسے طالب علموں کے لئے لکھ رہا ہوں جو لسانیاتی تفصیلات سے دلچسپی نہیں رکھتے لہذا میں نے حسب ذیل صورت اختیار کر لی ہے۔

(۱) متن میں ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان میں نقل کرنے کے سلسلے میں عمل کو آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حروف علت کا وہی مفہوم لیا گیا ہے جیسا کہ براعظم (یورپ) میں ہے۔ ہم نے حروف علت پر معمول کے مطابق نشان لگائے ہیں لیکن حروف صحیح کو ممیز کیا گیا ہے۔ بجز اس کے کہ حروف '۹' کو جسے ایک حلق سے نکلنے والے مخصوص عربی لفظ کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے بصورت دیگر کام میں نہیں لایا گیا۔ الا عربی لفظ میں، ان صورتوں میں ظاہر کرتا ہے جہاں اس کا اظہار ضروری معلوم ہوا۔

(2) اس طور پر متن میں مندرج الفاظ کی انگریزی میں صحیح نقل، آسان طریقہ کی تقلید کرتے ہوئے فرہنگ وضیمہ میں ملادی گئی ہے۔

(3) ضمیوں میں، الفاظ کی انگریزی میں صحیح نقل اس وقت کی گئی ہے جب زیر بحث اصطلاحوں یا محاورں کے لئے ایسا ضروری معلوم ہوا۔

(4) اسم خاص محض اپنی سادہ شکل میں دئے گئے ہیں۔ لسانیات کے طالب علموں کو یاد دلانا ضروری نہیں کہ مثلاً محمد (MUHAMMAD) کا 'ح' ہمایوں (HUMAYUN) کے 'ہ' سے مختلف ہے جبکہ عام پڑھنے والے اس فرق سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

میں نے مسلم یا مغل' ایسے الفاظ یا کلکتہ یا لاہور ایسے نام جو انگریزی زبان میں شامل ہو چکے ہیں، کے عام املا کو قائم رکھا ہے۔

یہ دیکھا جائیگا کہ الفاظ کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کا میرا آسان طریقہ اس طریقہ کے بہت قریب ہے۔ جسے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کی جلدوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ یہ مشابہت الفاظ کو انگریزی زبان میں نقل کرنے تک ہی محدود نہیں بلکہ عہدِ متعلقہ کی اہم شخصیتوں اور خاص مأخذ کے متعلق ان دونوں تصنیفوں میں جو رائے قائم کی گئی ہے وہ بھی ایک معقول حد تک یکساں ہے۔ بس اس امر کی وضاحت مناسب ہوگی کہ سرولزے ہیگ کی ضخیم جلد کے طبع ہونے کے قبل اس عہد کے متعلق میرے ابواب طباعت کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ نقطۂ نظر کی یکسانی اور کہیں کہیں لفظی مطابقت کا سبب نقالی یا باہمی صلاح ومشورہ نہیں بلکہ ایک ہی ماخذ کے آزادانہ مطالعہ کا نتیجہ ہے چند ایسی صورتوں میں جہاں نزعی موزوعات پر عبارتوں کی سرولزے ہیگ کی تعبیر اور میری تعبیروں میں اختلاف ہے میں نے ان شہادتوں کی دوبارہ جانچ کی۔ لیکن مجھے اپنے سابقہ نظریات میں ترمیم کرنے کا جواز نہ ملا۔

مأخذ کے حوالہ دینے کا طریقہ ان امور سے متاثر ہوا ہے کہ ان کے نام عام طور پر طویل اور کبھی کبھی یکساں ہیں۔ اس خیال سے کہ فٹ نوٹ کی جسامت ایک معقول حد سے تجاوز نہ کرے۔ میں نے اہم ماخذ کے لئے خود ساختہ کلیدی الفاظ منتخب کئے ہیں اور ضمیمہ "ش" میں انہیں کلیدی الفاظ کے تحت ان ماخذ کے پورے نام درج کئے گئے ہیں۔

اس قدر زیادہ مختلف النوع ماخذ سے حاصل کی ہوئی معلومات کو یکجا کرنے میں مجھے لازماً مختلف میدانوں میں کام کرنے والے محققین کے تعاون پر انحصار کرنا پڑا۔ مخصوص مسائل پر امداد کے لئے میں آنجہانی رائٹ آنریبل سید امیر علی اور مسٹر سی۔ اے کیر کنن

سراتول چیٹرجی[2]، مسٹر ڈبلو کرسٹی[3]، مسٹر جی۔ال۔ ایم کلاڈسن[4]، مسٹر یو۔ ایم۔ داؤد پوٹا[5]، مسٹر ای۔ ایڈورڈس[6]، مسٹر ولیم فوسٹر[7]، پروفیسر ایس۔ ایچ ہوڈی والا[8]، سر والٹر ہوز[9]، مسٹر ایس۔ جی کین ہیر[10]، سر ایڈورڈ میکلاگن[11]، مسٹر سی۔ ای۔ اے۔ ڈبلو اولڈھم[12] اور مسٹر کینو کس ٹریچ[13] کا رہین منت ہوں۔ ڈاکٹر ال۔ ڈی بارنیٹ[14] نے ازراہ کرم پہلے باب کی پروف خوانی کی اور مجھے ہندو عہد کے متعلق تحریروں کے گرانقدر حوالے فراہم کئے، مسٹر آر پیجٹ ڈیوہرسٹ[14A] نے ضمیمہ 'ج' کے ایک اچھے خاصے حصہ کو لکھنے کے علاوہ فارسی سرگذشتوں کے غیر واضح محاوروں کی وضاحت کرنے میں انتہائی فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ سر رچرڈ برن[15] نے مجھے ضمیمہ 'ذ' کے مسودے پر ایک تنقیدی یادداشت فراہم کرنے کے علاوہ میری دوسرے متعدد طریقوں سے بھی مدد کی۔ مسٹر بی۔ سی برٹ[15A] نے ہندوستانی ذخیروں سے توضیحی دستاویزات کی تلاش میں میرا بہت ہاتھ بٹایا۔ میں نے بعض ان غیر مطبوعہ یادداشتوں سے آزادی کے ساتھ استفادہ کیا ہے جو مسٹر عبداللہ یوسف علی کے صلاح و مشوروں سے اس وقت تیار کی گئی تھیں جب ہم دونوں نے ایک ساتھ چند برسوں تک عہد اکبری کے ماخذ پر کام کیا تھا۔ آخر میں، میری پوری تصنیف کے دوران، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے عملہ کی مسز آر ڈبلو فریزر[16] اور مس ایف۔ ایچ۔ لیٹمر کے بطیب خاطر تعاون کا اعتراف مجھ پر واجب ہے۔

جولائی سنہ 1929ء

ڈبلو۔ ایچ۔ مورلینڈ

(1) C.E. CARRINGTON
(2) ATUL CHATTRJEE
(3) W. CHRISTIE
(4) G.L.M. CLAUSON
(5) U.M. DAUDPOTA
(6) E. EDWARDS
(7) WILLIAM FOSTER
(8) S.H. HODIVALA
(9) WALTER HOSE
(10) S.G. KANHERE
(11) EDWARD MACLAGAN
(12) C.E.A.W. OLDHAM
(13) G. CHENEWIX TRENCH
(14) L.D. BARNETT
(14A) A.R. PAGET DEWHURUST
(15) RICHARD BURN
(15A) B.C. BURT
(16) R.W. FRAZER

مقدمہ

اس کتاب کو ادارتی تاریخ کے موضوع پر ایک مقالہ کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں مسلم حکومت کے اہم دور میں جو تیرہویں صدی سے شروع ہو کر اٹھارویں صدی پر ختم ہوتا ہے۔ بادشاہت کے تین ضروری اجزاء تھے: بادشاہ جو اس پر حکومت کرتا تھا، فوج جو تخت کو طاقت فراہم کرتی تھی اور کسان جو دونوں کی کفالت کرتا تھا اور ان تینوں اجزاء کے درمیان پائے جانے والے رشتہ کو ابتدائی ایام میں مروّج اس کہاوت میں: "فوج اور کسان بادشاہت کے دو بازو ہوتے ہیں" بخوبی ادا کیا گیا تھا۔ اس عہد کے بادشاہوں کی خاندانی اور فوجی تاریخ تک طالب علموں کی اب اچھی خاصی دسترس ہو گئی ہے لیکن موجود تحریروں میں کسانوں کے حکومت کے ساتھ تعلق کا ایک عمومی یا مربوط مشاہدہ کرنا ناممکن ہے اور اس خلاء کو میں اس تصنیف کے ذریعہ پُر کرنے کی کوشش کروں گا۔

میرے مقالہ کے موضوعات پر ممکن ہے ان قارئین کو کچھ حیرت ہو جو بنیادی طور پر زمانۂ حال کے زرعی مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں اور جو اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ اس میں خاص طور پر زمین داروں اور ان کے کاشتکاروں کے ان حقوق پر بحث ہو گی جو انھیں حاصل ہوں یا جن کے وہ دعویدار ہوں۔ لیکن تعینِ حق کے مسئلہ نے ہندوستان کی زرعی تاریخ میں زمانۂ حال میں اہمیت اختیار کی ہے اور اس کا تعلق تقریباً کلی طور پر برطانوی عہد سے ہے ہندو عہد کے ہندوستان کے مثل مسلم عہد کے ہندوستان میں زرعی نظام حقوق کا نہیں بلکہ فرائض کا ایک معاملہ تھا اس کا مدار اس تصور پر تھا کہ زمین کی کاشت کرنا اور اپنی پیداوار کے حصہ کو حکومت کو ادا کرنا کسانوں کا فرض تھا۔ نجی حقوق یا دعوے جس حد تک تسلیم کیے جاتے تھے وہ اسی بنیادی ذمہ داری کے تحت تھے۔ لہٰذا میرے مقالہ

کا خاص موضوع ان طریقوں پر جن کے تحت کسان کی پیداوار سے حکومت کے حصّہ کی تشخیص اور وصولی کی جاتی تھی اور ان انتظامات پر جن کے تحت پیداوار کے کچھ حصّے ان طبقوں کے حق میں منتقل کیے جاتے تھے جنھیں ہم نے مجموعی طور پر درمیانی طبقہ بیان کیا ہے بحث ہوگی۔

اس مقالہ کے حدود میں مسلم نظام کے موجودہ نظام میں منتقل ہونے کی تفصیلات پر بحث شامل نہیں ہے لیکن جو اہم عوامل کارفرما رہے ہیں ان کا ایک مختصر سا حوالہ اس لیے ضروری ہے کہ ان عوامل کے ایک باشعور اخراج ہی سے ہم ان حالات کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں جو ابتدائی دور میں پائے جاتے تھے۔ تاریخ کا یہ ایک جانا بوجھا واقعہ ہے کہ انیسویں صدی کے دوران شمالی ہندوستان میں اس درجہ داخلی امن و امان رہا جیسا کہ اس کے قبل نہ پایا جاتا تھا اور یہ کہ اس کے نتیجہ میں آبادی میں تیزی سے اضافہ اور زرخیز زمین کے حصّوں کے لیے مسابقت کا بڑھنا نظر آیا۔ مسلم عہد میں نسبتاً چھوٹے علاقوں کے علاوہ اور کہیں اس قسم کی مسابقت کا وجود مشکل ہی سے پایا جاتا تھا اور ہمیں اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ملک کے بیشتر حصّوں میں زمین ایسے لوگوں کی منتظر رہا کرتی تھی جو کاشتکاری کے لیے مطلوبہ وسائل کے مالک ہوں۔ انیسویں صدی کا ایک دوسرا عطیہ وہ چیز تھی جو رسمی طور پر قانون کی حکومت کے نام سے موسوم ہے اور جس نے بتدریج مسلم عہد کی شخصی حکومت کو بے دخل کیا اور تیسرا عنصر جو دوسرا یا انسانی ہمدردی کے تصوّرات کی اشاعت تھی مگر اسے شاید کم عمومیت کے ساتھ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ اس صدی کی ایک ایسی امتیازی خصوصیت تھی جو ہندوستان ہی تک محدود نہیں بلکہ پوری مہذّب دنیا میں پائی جاتی تھی۔ ان عوامل کی کارفرمائی پر بحث برطانوی عہد کے مورّخ کا کام ہے۔ میرے ان عوامل کے یہاں ذکر کرنے کا مقصد محض اس نکتہ کی اہمیت کو واضح کرنا ہے کہ مسلم نظام کا ایک صحیح اندازہ لگانے کے لیے ہمیں بہ احتیاط انھیں اپنے جائزہ سے باہر رکھنا چاہیے۔ بہ الفاظ دیگر ہمیں زمین کے لیے مسابقت، تحریری قانون، یا نظیر کے احترام اور دورِ حاضر کے انسانی ہمدردی پر مبنی نظامِ حکومت کے تصوّرات سے دور رہنا چاہیئے۔

میرے مقالہ کے حدود اوپر بیان کیے گئے۔ لیکن طریقِ مطالعہ کی وضاحت کے لیے مقالہ کی تخلیق کے متعلق تھوڑا سا لکھنا ضروری ہوگا۔ چند برس گذرے عہدِ اکبری میں ہندوستان کے اقتصادی حالت کے خاکہ کے لیے ضروری مواد یکجا کرنے کے دوران اس موضوع کی اہمیت نے مجھے بڑی شدّت سے متاثر کیا۔ یہ حقیقت کہ مغلیہ عہد میں، حکومت زمین کی مجموعی پیداوار کے ایک تہائی سے لے کر نصف حصّہ تک کا خود انتظام کرتی تھی۔ اسے قومی آمدنی کی تقسیم میں قوی ترین

عامل کا درجہ عطا کرتی تھی۔ ساتھ ساتھ تقسیم کے سلسلہ میں اس کے عمل کا پیداوار پر اثر انداز ہونالازمی تھا۔ یہاں تک کہ ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوگئے کہ موسم کے بعد انتظامیہ ملک کی اقتصادی زندگی کا غالب عنصر تھا۔ چنانچہ میں نے قبل کی دو تصانیف "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر" "اکبر سے اورنگ زیب تک" میں انتظامیہ اور کسانوں کے درمیان پائے جانے والے رشتوں کے بیان کے خلاصہ کو شامل کیا ہے۔ یہ بیانات خاص طور پر ہمعصر مآخذ پر مبنی تھے لیکن مبہم اور پیچیدہ تحریر کی تعبیر کے سلسلے میں میں نے اپنے سے قبل کے محققین کی تحریروں کی تقلید کی ہے جو میرے خیال میں موضوع متعلقہ کی فنی مصطلحات میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔ میں نے معمولاً ان کے وضاحتوں کو قبول کرتے ہوئے زرعی نظم و نسق کے اہم خطوط کو پیش کیا ہے اور بعض دقتوں کو جو جزدیات کے درجہ میں معلوم ہوئیں بعد کے مطالعہ کے لیے محفوظ رکھا ہے۔

اصل موضوع کے طرف واپس ہونے پر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان واضح تفصیلات کی زیادہ قریب سے جانچ کرنے پر ان کی اہمیت میں اضافہ ہوگیا اور میں بتدریج اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوا ہوں کہ بلاکمین، جیرٹ، ڈاؤسن اور پچھلی صدی کے دیگر مصنفین جنھیں میں نے اپنا رہبر تسلیم کیا تھا چونکہ وہ ایک بالکل ہی غیر معروف میدان کی دریافت میں معروف تھے لہذا وہ اس عہد کی تحریروں میں استعمال ہونے والی اصطلاحوں پر پوری مہارت حاصل نہ کر سکے اور انھوں نے ہندوستان کے موجودہ دستور العمل یا بعض اوقات یورپ کے عہد وسطیٰ کے دستور العمل سے ایسی فنی اصطلاحوں یا مرصع محاوروں کو مستعار لے لیا تھا جو بالعموم اصل صحیح مفہوم کو ادا نہ کرتے بلکہ کبھی کبھی تو شاید غلط فہمی کا موجب بنتے۔ پس مصطلحات کا از سر نو مطالعہ ضروری معلوم ہوا اور اس مقصد سے میں نے اس عہد کی مطبوعہ تحریروں نیز موضوع سے متعلق ان مخطوطات پر جو مجھے اس ملک میں دستیاب ہوئے توجہ دی۔ میں نے ہر اس عبارت کا جس میں فنی اصطلاح ملی اقتباس کیا ان عبارتوں کو یکجا کرنے کے بعد ہر اصطلاح کے مختلف ادوار یا ہندوستان کے مختلف حصّوں میں ایک یا ایک سے زاید جو معنی ہوتے تھے اخذ کئے۔

اس مطالعہ کے دوران جو نتائج برآمد ہوئے وہ اس مقالہ کی بنیاد ہیں اور میرے طریقہ کی کافی وضاحتیں فٹ نوٹوں اور ضمیموں میں ملیں گی لیکن ابتدا ہی میں اس امر کی اہمیت کو واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ اس زمانہ کی تحریروں میں استعمال کی گئیں مصطلحات غیر منتقل ہیں اور کسی بھی عبارت کی تعبیر اس کے زمان و مکاں سے متاثر ہو سکتی ہے۔ مسلم ہندوستان میں استعمال ہونے

والی فارسی زبان میں مترادفات کی افراط تھی اور بیشتر مآخذ میں وہ طرز بیان اختیار کیا گیا ہے جسے ہم اسلوب کا تنوع کہہ سکتے ہیں یا بالفاظ دیگر ان کے مصنفین لفظی تکرار سے بچنے کے لیے کوئی بھی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ایک ہی چیز کا ذکر مختلف ناموں سے آئے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں مسلم عہد کی ابتدا ہی سے دفتری حکومت اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل میں پائی جاتی تھی۔ اور سرکاری دفتروں میں بالکل ایسے ہی جیسے ان دنوں صورت ہے پہلے سے عمومی استعمال میں آنے والے الفاظ واضح فنی اصطلاحوں کے طور اختیار کر لیے گئے تھے چنانچہ عمومی اور فنی مفہوم دونوں ساتھ ساتھ پائے جا سکتے تھے۔ بلاشک ہم بعض اوقات دیکھتے ہیں کہ مختلف شعبہ ایک ہی لفظ کو مختلف مفہوم میں استعمال کر سکتے تھے جیسا کہ مال کے ایسے مانوس لفظ کے ساتھ صورت تھی۔ ایک عام مصنف اس لفظ سے جائداد یا مملوکات کے معنی لیتا تھا۔ لیکن فوجی شعبہ میں یہ جنگ میں حاصل کیے گئے " مالِ غنیمت کو اور مالیاتی دفتروں کی بول چال میں " مالگزاری زمین " کو کہتے تھے۔ لہٰذا کسی عبارت میں اس لفظ کے مفہوم کو سیاق سے اخذ کرنا پڑتا ہے۔ یہ فنی اصطلاحیں بعض صورتوں میں صدیوں تک باقی رہا کرتیں اور بعض صورتوں میں تبدیل ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً پرانی چیزیں نئے ناموں کے ساتھ ظاہر ہوتی تھیں۔ دوسری طرف طریقوں کی تبدیلیاں ایک قدیم اصطلاح کو ایک معقول حد تک نیا معنی بھی عطا کر سکتی تھیں۔ مقامی اعتبار سے جو اختلافات پائے جاتے تھے وہ بھی اہم ہیں اور خاص طور پر یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ دو صدی قبل کلکتہ اور دہلی کی زرعی زبانوں میں معنوی حیثیت سے فرق پایا جاتا تھا جو آگے چل کر شمال میں برطانوی منتظمین کے لیے غلط فہمی کا سبب بنا۔

مصطلحات کا یہ عدم استقلال مورخ کے لیے اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ یہاں ایک ایسی وضاحت جس کے سلسلہ میں اہم واقعات کے متعلق کوئی تنازعہ نہیں ہے پیش کر دینا مناسب ہوگا۔ تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں ہندوستان کے فارسی مصنفین عربی لفظ دیوان کو ایک مخصوص مفہوم میں " جو شعبہ یا وزارت " کی موجودہ اصطلاحوں کے قریب قریب بالکل مماثل تھا استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ وزیر کے دیوان کا مفہوم وزارتِ مال تھا کیونکہ وزیر کا خاص کام مالیات سے متعلق تھا اور جب بھی کوئی نیا شعبہ قائم کیا جاتا، جیسا کہ وقتاً فوقتاً پیش آتا تو اسے انتظامیہ کی اس مخصوص شاخ کا دیوان کہتے جس کے ساتھ اسے منسلک کیا جاتا تھا۔ پندرھویں صدی کے متعلق تحریریں تھوڑی ہیں اور مجھے اس کا علم نہیں کہ یہ تبدیلی کب واقع

ہوتی۔ لیکن عہدِ اکبری کے شروع ہوتے ہوتے لفظ دیوان کے معنی کوئی ادارہ نہیں بلکہ ایک شخص ہوگیا انتظامی سطح پر دیوان کی حیثیت اب وزیرِ مال کی تھی اور چونکہ وزیر مالیاتی کاموں کو انجام دیا کرتا، لہٰذا تھوڑے عرصہ کے لیے وزیر اور دیوان دونوں الفاظ عملاً قریب قریب ہم معنی ہوگئے۔ نجی کاموں میں دیوان، بہ اعتبار تمثیل ایسے شخص کے مصداق تھا جو ایک اونچے عہدہ دار کے مالی معاملات کا منتظم ہو اور بخیال سہولیت اس کا ترجمہ "اسٹیورڈ (STEWARD) "کیا جا سکتا ہے۔ وزارتِ مال کا نام اب دیوانی ہوگیا تھا۔ دیوان کی اصطلاح ابتدائی تحریروں میں نہیں ملتی۔ مغل عہد میں اس لفظ کا اطلاق مالگزاری کا کام کرنے والی وزارت کے علاوہ کسی اور وزارت پر نہ کیا جاتا تھا۔

انتظامی تنظیم میں ترقی کے ساتھ ساتھ ہمیں دو مزید تبدیلیاں ملتی ہیں۔ وزارت کے اندر ہر شعبہ جاتی سربراہ اب دیوان پکارا جانے لگا اور اس کے باہر، ہر صوبہ میں ایک دیوان یا حاکم مال مقرر کیا گیا اور ان صوبہ جاتی نظاموں کو مرکزی وزیر کی براہِ راست ماتحتی میں لائے جانے کے بعد اس لفظ کا ایک نیا مفہوم پیدا ہوگیا سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں دیوانی یا نظم ونسق کو مجموعی طور پر نظامت یا فوجداری سے ممیز کیا گیا۔ ان دو آخری اصطلاحوں سے انتظامِ عامہ کا مفہوم تھا جس کا بنیادی تعلق قیامِ امن سے ہوا کرتا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی بحیثیت صوبہ بنگال کے دیوان کی تقرری سے ایک مزید تبدیلی پیش آئی۔ نئے دیوان نے انصاف کی اپنی خود عدالتوں کو قائم کرنا مناسب خیال کیا۔ انھیں دیوانی عدالت یا "دیوانی کورٹ" کا باضابطہ نام دیا گیا اور بعد میں پیش آنے والی تبدیلیوں کے نتیجہ میں نظم ونسق مال جو دیوانی کا قدیم مفہوم تھا تقریباً بالکل ہی ختم ہوگیا اور موجودہ بول چال میں اس سے مراد دیوانی کی قانونی عدالتیں ہیں۔ بعض ہندوستانی ریاستوں میں وزیر کے مترادف کے طور پر دیوان کے لفظ کا استعمال چلا آرہا ہے۔ یہاں بڑے وزیر کو اس نام سے پکارتے ہیں۔ دیگر مقامات پر یہ حکومت کا عطا کیا ہوا یا بعض فرقوں کے سربرآوردہ افراد کا خود اختیار کیا ہوا امتیازی خطاب ہے۔ پس اس لفظ نے اس وقت کے بعد سے جب ایک وزیر "دیوان میں بیٹھا ہوا" کہہ سکتے تھے ایک طویل مسافت طے کی ہے۔

اوپر بیان کیے ہوئے طریقِ مطالعہ کے جواز میں زیادہ لکھنے کو میں ضروری خیال نہیں کرتا۔ اس کا جواز ان امور میں ملتا ہے: اوّل تو یہ کہ اس کی کوئی دوسری متبادل صورت نہیں اور دوسرے یہ کہ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس سے اہم نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں لیکن ان نتائج کو

معقول شکل میں پیش کرنے میں ایک عملی دقت محسوس ہوتی ہے ۔ تمام برمحل عبارتوں کو اس قدر کافی سیاق کے ساتھ درج کرنا کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے اور پھر تشریح کرکے دکھاتا کہ یکے بعد دیگرے امکانی صورتوں کو اس وقت تک کیونکر حذف کرتے رہنا چاہیئے جب تک کہ اخراج کے عمل کے ذریعہ ہم حتمی یا امکانی مفہوم تک پہنچ جائیں ۔ اپنے نتائج کو اس تہج سے اس وقت تک پیش کرتے رہنے کے لیے جب تک پورے موضوع کا احاطہ نہ ہو جائے ۔ کئی جلدیں درکار ہوں گی جب کہ میرا مقصد یہ ہے کہ میں ان نتائج کو امکانی اختصار کے ساتھ اور اگر ممکن ہو تو ایک ایسی شکل میں جو بالکل ہی اکتا دینے والی نہ ہو پیش کروں ۔ میں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ اس طور پر ہے ۔ پہلے کسی چیز کی نوعیت کو متعین کرلینے کے بعد میں نے اس کا مترادف ایک انگریزی لفظ منتخب کیا ہے ۔ ایسا کرتے وقت میں نے اس مترادف کو ترجیح دی ہے جس کی کم از کم گمراہ کن تعبیریں ممکن ہوں ۔ اور ہر اصطلاح کی اس کے پہلے موقع استعمال پر وضاحت کی گئی ہے اور پھر اسے ایک واحد مفہوم میں استعمال کرنے کی پوری پابندی کی گئی ہے ۔ ان میں فیصلہ کن عبارتیں جہاں کہیں بھی مل سکیں یا ان کی غیر موجودگی میں متعدد تشریحی عبارتیں جو مجھے امید ہے کہ تنقیدی طالب علموں کے لیے کافی ہوں گی شامل ہیں ۔ دوسری طرف عام قارئین کی راہ میں موضوع کی نوعیت کے پیش نظر جس قدر بھی کم از کم دقتیں ممکن ہو سکیں پیدا کی گئی ہیں ۔

مقالہ کی ترتیب موضوع کے اعتبار سے نہیں بلکہ تاریخی سلسلہ کے اعتبار سے ہے ۔ ایک بار مجھے آخر الذکر راہ اختیار کرنے کی ترغیب ہوئی تھی اور خیال ہوا کہ میں پہلے تشخیص کا پھر جاگیر وغیرہ کا ایک مربوط بیان لکھوں ۔ لیکن مختلف موضوعات ایک دوسرے سے اس قدر زیادہ گتھے ہوئے ہیں اور معاملات کا مطلق العنان حکمرانوں کی شخصیت پر اس قدر زیادہ انحصار ہے کہ چند تجربوں کے بعد میں نے ادوار جو حقیقتاً بہت واضح ہیں کی ترتیب ہی کی طرف مراجعت کی ۔ ابواب 6 اور 7 کے سلسلہ میں، میں نے مسلم زرعی نظام کی برطانوی زرعی نظام میں منتقلی کے پہلے مرحلہ کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، برطانوی زرعی نظام کا تفصیلی بیان ہمارے موجودہ مقاصد میں شامل نہیں ہے ۔ علاوہ اس کے مذکورہ بالا منتقلی کے سلسلہ میں بھی ان علاقوں پر جہاں سکھ یا مرہٹوں کی حکومت کا دور رہ چکا ہے، میں نے بحث نہیں کی ہے ۔

تعارف کے اختتام پر میں یہ بات بالکل واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں اس مقالہ کو موضوع

متعلقہ پر بطور ایک مستحکم تحریر کے پیش نہیں کرتا۔ ہندوستان میں اب بھی غالباً تحریروں کا ایک ایسا مجموعہ موجود ہے جنھیں اگر یکجا کر کے چھان بین کی جائے تو ان سے بعض ان موضوعات پر روشنی حاصل ہوگی جن کے سلسلہ میں، میں نے مواد کی کمی کو بہت شدّت سے محسوس کیا ہے۔ باوجودیکہ اس سلسلہ میں بعض حلقوں میں مایوسی پائی جاتی ہے، لیکن میرا اپنا یہ یقین ہے کہ معافیوں، جاگیروں، اور آراضی داری کی دیگر شکلوں اور نیز زرعی نظم و نسق کے بعض دوسرے پہلوؤں سے متعلق بہت سے ایسے دستاویزات یہاں وہاں منتشر حالت میں خصوصاً ذاتی طور پر لوگوں کے پاس ضرور موجود ہوں گی جنھیں اگر روشنی میں لایا جائے تو مستقبل میں کسی طالب علم کے لیے ممکن نہ ہو سکے گا کہ میری فروگذاشتوں کی تصحیح اور میری معلومات کے خلاؤں کو پُر کرنے کے بعد اس مقالہ کو تاریخ کی ایک کتاب میں منتقل کر سکے۔ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ ایسے دستاویزات یچ یچ بہت کثیر تعداد میں ضرور موجود رہے ہوں گے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میں سے تھوڑے اس صدی میں ظاہر ہوئے ہیں لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ اب بھی کس قدر بچ رہے ہیں۔ اس بات کا ہمیں ضرور یقین ہے کہ ان میں سے بچے ہوئے سال بہ سال ضائع ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں اب ایسے دستاویزات کی تلاش میں عملی طور پر شرکت نہیں کر سکتا۔ لیکن میں اس موقع کو تاریخ پر کام کرنے والی مقامی انجمنوں اور نیز ہندوستان میں اس نوعیت کا کام کرنے والی دیگر جماعتوں سے اس بات کی اپیل کئے بغیر ہاتھ سے نہ جانے دوں گا کہ وہ اس مسئلہ کو مستعدی کے ساتھ حل کریں اور خاص طور پر ان خاندانوں کے بیش بہا ذخائر کا سراغ لگانے کی کوشش کریں جن کے ساتھ قانون گویان یا مقامی نظم و نسق میں دوسری حیثیتوں سے سرکاری ملازمت کرنے کی ایک طویل روایت وابستہ ہے۔ اس طور پر ہو سکتا ہے کہ دریافتیں بہت تھوڑی ہوں لیکن ایسے دستاویزات کی قدر و قیمت ان کی کمیابی کے تناسب سے بڑھ جاتی ہے اور ان کے جائے وقوع کے متعلق کوئی پیش بینی نہیں کی جا سکتی۔ اکبر کی زمینوں کے متعلق خیراتی معافیوں کی شکل و مقدار کے بارہ میں ہماری معلومات میں گجرات کے ایک پارسی خاندان کے پاس محفوظ قدیم کاغذات کے ایک مجموعہ کی دریافت کے بعد اچھا خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا علاقہ ہے جہاں کوئی بھی شخص مشکل ہی سے مغلیہ دستاویزات کی تلاش کا ارادہ کرے گا۔ لیکن اس کے باوجود ہم ابھی اسی نوعیت کی دوسری دریافتوں کی امید کر سکتے ہیں جو مستقبل کے مورخ کے لیے ہندوستان کے زرعی نظام بلکہ یہاں کے لوگوں کی پوری زندگی پر بے اندازہ قدر و قیمت کا مواد فراہم کرے گا۔

باب 1

پچھلے حالات

۔ ہندوؤں کا مقدس قانون

مسلم ہندوستان کے زرعی نظام کے ارتقاء کو بیان کرنے والے مصنف کو شروع ہی میں کسی نقطۂ آغاز کی غیر موجودگی کے باعث پیش آنے والی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ ابتدائی مسلم فاتحین نے اپنی ہندوستانی رعایا پر کوئی کلیتہً غیر ملکی نظام عائد نہیں کیا اور دوں کے تسلسل کو برقرار رکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے کم از کم کچھ مروّجہ نظاموں کے اجزاء کو اختیار کر کے جیسے جیسے وقت گذرتا گیا انہیں بدلتی ہوئی ضروریات سے ہم آہنگ کیا۔ ایسی صورت میں بارہویں صدی کے دوران ہندو نظام کے نظری اور عملی پہلوؤں کا بیان، ایک مثالی نقطۂ آغاز ہوگا۔ لیکن اس قسم کی کسی چیز کا وجود علم میں نہیں ہے اور اس عہد کے حالات کے تحت، یہ قرینِ قیاس نہیں کہ انھیں کبھی بھی قلمبند کیا گیا ہوگا۔ ایسا سوچا جاسکتا ہے کہ قدامتی تحقیقات کی ترقی کے نتیجہ میں بالآخر، متعلق سندات کی تحریروں اور کتبات پر مبنی، ہندو نظام کے نشوونما کا ایک تاریخی نظام مرتّب کیا جاسکے۔ لیکن علم داں مجھے یقین دلاتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے فی الوقت کافی مواد موجود نہیں

ایسے تذکروں یا بیانات کی غیر موجودگی میں زیادہ سے زیادہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندو نظام کے بنیادی پہلوؤں کو پیش کر کے، ان کے ابتدائی مسلم حکمرانوں کے اداروں کے ساتھ اگر تاریخی بنیاد تو

منطقی تعلق کو واضح کر دیا جائے۔ میں اس باب میں یہی واضح کرنے کی کوشش کروں گا لیکن شروع میں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ فنی امور میں ترجمے بسا اوقات غلط رہنمائی کرتے ہیں۔ مسلم عہد کے مطالعہ کے سلسلے میں بعض سنگین ترین دقتوں کا سبب بیان و واقعہ کے درمیان وہ تبدیلیاں ہیں جو احاطۂ تحریر میں نہیں آسکیں اور اشوک اور مسلم تسلّط کی درمیانی صدیوں کی دستیاب تحریروں کے سرسری مطالعہ کے سلسلہ میں ہم مسلسل اس شک میں مبتلا ہوتے ہیں کہ شاید یہاں بھی ان تحریروں کی تعبیر پر پردہ ڈالنے والی اسی نوعیت کی تبدیلیاں راہ پاگئی ہوں۔ چنانچہ ہندو نظام کے ابتدائی اصولوں کے متعلق میرا بیان لازمًا قیاسی ہے، بحرحال ایسا ہونا ضروری بھی تھا تاکہ میری اختیار کی ہوئی اصطلاحات کی وضاحت ہو سکے اور ممکن ہے یہ ماہرین کو تحریروں کے ان پہلوؤں پر متوجہ کرنے میں معاون ثابت ہو جن پر ابھی کافی تحقیقات نہیں کی گئی ہے۔

ہندو زرعی نظام کے دیرپا اور اساسی پہلوؤں کے سلسلہ میں ہمیں دھرم یا مقدّس قانون کی جانب متوجہ ہونا چاہئے۔ ان کے ضابطوں میں مصنفین یکے بعد دیگرے موشگافیاں اور حاشیہ بندی تو کر سکتے تھے۔ لیکن یہ اصول قانون سازی یا کسی انتظامی عمل کے ذریعہ رسمی طور پر تبدیل نہ کئے جا سکتے تھے۔ یہ مقدّس قانون ایک ایسی زرعی حالت کو تصوّر کرتا ہے جس کے اصل اجزاء مسلم عہد کے آغاز پر پائے جانے والے نظام کے مماثل تھے اور جو اس عہد کے اختتام پر مروّجہ نظام سے زیادہ مختلف نہ تھے۔ ہم بادشاہ کو اس کی راجدھانی میں اور کسان کو اس کے موضع میں پاتے ہیں اور بحرحال بادشاہ اور کسان کے درمیان پایا جانے والا تعلق (زرعی) نظام کا ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔ عہدِ حاضر کے مصنّفین ابھی تک ہندو بادشاہ کو معمولاً ایک ایسے مطلق العنان حکمران کے طور پر پیش کرتے آئے ہیں جو دیوتائی شخصیت کا مالک، مقدّس قانون کا پابند اور رائے عامہ کے زیرِ اثر لیکن ہر انسانی ادارہ سے آزاد ہوتا ہے لیکن اب زیادہ قریبی زمانہ میں بعض ہندوستانی علماء نے اِسے دورِ حاضر کے ایسے آئینی حکمرانوں کی حیثیت میں پیش کیا ہے جو کونسلوں یا اسمبلیوں کے پابند ہوں۔ ان دونوں صورتوں کا فرق جس پر بحث کرنے کا میں بالکل اہل نہیں، ہمارے موجودہ مقصد سے غیر متعلق ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مقدّس قانون، بادشاہ کے لقب کے تحت ایک اصطلاحی مفہوم کے حکمران کا تصوّر کرتا ہے۔ یہ امر کہ بادشاہ کا عمل خود مختارانہ تھا یا وہ وزیروں یا کونسلوں کے مشوروں کا پابند تھا، آنے والے بیان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

میں نے اس تعلق کے دوسرے فریق کے لیے پیزنٹ (PEASANT) کسان کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ بمقابلہ کسی دوسرے موجود مترادف کے، فی الجملہ اس اصطلاح میں غلط فہمی کا کم خطرہ محسوس ہوتا ہے[1]۔ کسان وہ شخص ہوتا ہے، اس کی آراضی داری کے حقوق و ذمہ داریاں خواہ کچھ بھی ہوں، جو کسی آراضی کی کلیتہً یا بیشتر اپنے اہلِ خاندان کی محنت سے اپنے نفع کے خاطر اور اپنی ذاتی ذمہ داری پر کاشت کرے۔ اُسے ایک طرف تو اس درمیانی شخص سے جو پیداوار میں اپنے حصّہ کا دعویدار ہو لیکن پیداوار کے عمل میں موثر طور پر دلچسپی نہ لیتا ہو اور دوسری طرف اس زرعی غلام (سرف) سے جس کے لیے وہ خوراک فراہم کرتا ہے یا اجرت کے مزدور سے جسے وہ مزدوری ادا کرتا ہے، مختلف تصوّر کرنا چاہیئے۔

مقدّس قانون[2] بادشاہ اور کسان کو ایک دورُخی تعلق میں وابستہ پیش کرتا ہے جس میں حقوق سے زیادہ فرائض کو زیادہ قطیعت کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ کسان کا پہلا فرض پیداوار کا اُگانا اور دوسرا بادشاہ کو اس کا حصّہ ادا کرنا ہے۔ ان فرائض کی ادائیگی کے بعد، وہ بادشاہ کی طرف سے حفاظت کی توقع کر سکتا ہے اور اپنی بقیہ پیداوار کو لازمی طور پر اپنی ضروریات پر مقدّس قانون کے معینہ ضابطوں کے تحت استعمال کر سکتا ہے۔ بادشاہ کا اوّلین فرض اپنے رعایا کی حفاظت کرنا ہے اور ایسی صورت میں وہ، کسان کی "پیداوار" میں ایک حصّہ کا حقدار ہوتا ہے جسے مقدّس قانون کے تحت خرچ ہونا چاہیئے۔ اس بیان میں "پیداوار" کا لفظ اپنے اصلی مفہوم یعنی اخراجات پیداوار کی کسی منہائی کے بغیر زمین کی مجموعی پیداوار کے لیے استعمال ہوا ہے۔ بعد کے ایک عہد میں ہمارے سامنے چند ایسی مثالیں آئیں گی جن میں استثنائی خرچ کے لیے تھوڑی سی گنجائش رکھی گئی تھی، لیکن برطانوی عہدِ حکومت کے قبل۔ میں کسی ایسی صورت کا پتہ نہ چلا سکا جس میں خالص آمدنی پر مالگزاری کی باضابطہ تشخیص کی گئی ہو[3]۔

اس امر کی نشاندہی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ جو بات ابھی لکھی گئی ہے اس کا تعلق قبضہ زمین کے حقوق سے نہیں ہے۔ قانون کا رخ قبضہ کے حق کی طرف نہیں بلکہ پیدا کرنے کے فرض کی طرف ہے۔ اس مسئلہ پر کہ آیا زمین کا مالک بادشاہ تھا یا کسان، جدید مصنّفین جانبداری کی طرف مائل معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ ایسا کرنے میں انتہاپسندی اختیار کرتے ہیں لیکن اس مسئلہ پر جو مجھے ایک گذرا ہوا موضوع معلوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ آیا مقدّس قانون کے وضع کئے جانے کے وقت زرعی زمین کی ملکیت کا تخیل وجود میں آچکا تھا یا نہیں، کوئی اصولی بحث

میری نظر سے نہیں گذری۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منفرد اشخاص یا خاندان، زمین کے مخصوص قطعات پر قابلِ وراثت اور قابلِ انتقال حقوق کے ساتھ قابض رہ سکتے تھے کیونکہ اصل تحریروں میں حقِ وراثت اور بذریعہ ہبہ، بیع و رہن انتقالات پر بحث کی گئی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا وراثت یا انتقال کے ذریعہ حاصل کیے ہوئے حقوق، عام معنوں میں بمنزلہ حقوقِ ملکیت کے تھے یا یہ محض ایسے حقوقِ قبضہ تھے جو بادشاہ کی مرضی کے تابع ہوا کرتے۔ اس بات کو دوسرے الفاظ میں اس طور پر پیش کیا جا سکتا ہے: جس مسئلہ پر مجھے کوئی قطعی اطلاع نہ مل سکی وہ یہ ہے کہ کیا نجی حق کے تخیل کی سیاسی اطاعت سے، غلامی کا عمل اس قدر ترقی کر چکا تھا کہ ہندو عہد میں موجود کسی اداروں میں سے کسی ایک پر بھی "ملکیت" کے لفظ کا اطلاق حق بجانب ہوگا۔ میں ان سوالوں کو چھیڑ سکتا ہوں، لیکن ان کا جواب دینا میرا کام نہیں۔ زیر بحث حقوق کے بادشاہ کی مرضی پر موقوف حقوقِ قبضہ داری کے ہونے کی صورت میں، ہندو عہد اور مسلم عہد میں مکمل تسلسل پایا جائے گا۔ اگر ہندو عہد میں ملکیت کا وجود اپنے موجودہ مفہوم میں موجود تھا تو اس امر کی وضاحت ضروری ہوجاتی ہے کہ مسلم عہد کے آغاز ہی پر یہ کیونکر ختم کر دیا گیا۔ مطلق العنان حکمراں، ہندو زرعی نظام کے اکثر عناصر کو برقرار رکھتے ہوئے ملکیت کے ادارہ کو بیشک مسترد کر سکتے تھے لیکن یہ بات کہ وہ اس تصور کو بھی فنا کر سکتے تھے ایک مختلف مسئلہ ہے۔

کسان کے حقوق کی نوعیت جو بھی رہی ہو، حالات مذکورہ بالا میں اس کا فوری مفاد ان دو سوالوں کے جواب پر مرکوز تھا: بادشاہ اس کی پیداوار کے کس قدر حصہ پر دعویدار تھا؟ اور اس حصہ کی تشخیص اور وصولی کیسے ہوتی تھی؟ پہلے سوال پر تحریروں میں اختلاف پایا جاتا ہے جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایک ہی طریقہ کار نہ تھا۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تحریروں کے مصنفین چھٹویں حصہ کو مناسب شرح تصور کرتے تھے جو غالباً گھٹ کر بارہویں حصہ تک اور ہنگامی حالات میں بڑھ کر ایک چوتھائی یا ایک تہائی تک پہنچ جاتی تھی۔ دوسرے سوال پر تحریریں عملاً خاموش ہیں اور ہم قدرتی طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ان مسائل کو مقدس قانون کے حدود کے باہر اور منفرد بادشاہوں کے اختیارِ تمیزی کے اندر تصور کیا جاتا تھا۔ ان تحریروں کی بنا پر جیسا کہ یہ ترجموں سے ظاہر ہوتی ہیں، دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں پیداوار کی واقعی تقسیم کو وزن یا پیمائش کے ذریعہ تصور کیا گیا ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں سوچتا کہ ان تحریروں کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ اس طریقۂ تقسیم کو مختصر کرنے کی انتظامی

تدبیریں جنھیں ہم مسلم عہد میں رائج پاتے ہیں لازمی طور پر خارج از بحث ہیں۔

پس بنیادی ہندو نظام جیسا کہ میں سمجھتا ہوں، یہ تھا کہ کسان اپنی پیداوار کا ایک حصہ بادشاہ کو دیتا تھا۔ بادشاہ حصہ کی مقدار کو بعض حدود کے اندر اور اس سے متجاوز بھی اور تشخیص اور وصولی کے طریقوں کو متعین کرتا تھا۔ تیرہویں صدی کے بعد سے مسلم عہد میں جو نظام چل رہا تھا اس کی بنیاد ٹھیک یہی ہے۔ لیکن ہم معمولات میں متعدد تبدیلیاں پاتے ہیں جو فی الواقعی ہندوستان میں اس وقت تک مروج تقریباً تمام آراضی داریوں کی اصل ہیں۔ اگلے باب میں ہم ان تبدیلیوں کے اس نظام کی بنیادی ساخت کے ساتھ منطقی رشتوں پر بحث کرنے کی کوشش کریں گے۔

2۔ بنیادی رشتوں میں تبدیلیاں

ہر کسان کی پیداوار کو تقسیم کر کے بادشاہ کے حصہ کی وصولی کا قدیم طریقہ زمینداروں اور کاشتکار کے مابین شمالی ہندوستان میں ابھی دورِ حاضر تک اس پیمانہ پر رائج تھا کہ اس کی خوبیوں اور خامیوں کا ٹھیک اندازہ کرنا ممکن ہے۔ یہ طریقہ بہترین طور سے اس وقت کام کرتا ہے جب زیرِ عمل رقبہ اس قدر کم ہو کہ دعویدار بذاتِ خاص اپنے معاملات انجام دے سکے۔ لیکن اس کے استحقاق کے علاقہ میں اضافہ کے ساتھ اس طریقہ کی کارکردگی تیزی سے گھٹ جاتی ہے۔ ہم اس طریقہ پر بعض ان طبعی اسباب کی بنا پر پہنچتے ہیں جو اس تاریخی دور میں کم و بیش مسلسل کارفرما رہا ہے اور جن کی وجہ سے وسیع علاقوں میں فصلیں بیک وقت پک جاتی ہیں اور پکنے اور اکٹھا کرنے کے درمیانی وقفہ میں پیداوار بہت تیزی کے ساتھ خراب ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ نتیجہ بلا تردد اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایک وسیع علاقہ رکھنے والے بادشاہ کو وہی دقتیں پیش آتی تھیں جو ایک بڑے زمیندار کو فی زمانہ پیش آتی ہیں۔ اسے یا تو فصل کے کٹائی کے دوران چند ہفتوں کے لیے غیر طلب اور خسارہ آمیز عملہ کو رکھنا پڑتا تھا یا تقسیم کے انتظار میں پیداوار کے خراب ہو جانے کے باعث اپنے حق کے بڑے حصہ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا اور ہم معمولات میں تقریباً تمام تبدیلیوں کو جن سے ہمارا تعلق ہے، ایک زیادہ اطمینان بخش طریقہ کی دریافت کی کوشش سے منسوب کر سکتے ہیں۔

مطالعہ کی غرض سے مختلف تبدیلیوں کو دو زمروں میں تسلیم کرنا سہولت کا باعث ہوگا۔ اول زمرہ میں حکومت اور منفرد کسان کے درمیان بلا واسطہ رشتہ برقرار رہتا ہے لیکن حکومت کے حصہ کی تشخیص کو وصولی سے جدا کر دیتے ہیں۔ دوسرے زمرہ میں حکومت منفرد کسان اور

ختم ہو جاتا ہے اور یہ مختلف اقسام کے درمیانی واسطوں سے کام کرتی ہے۔

الف۔ انفرادی تشخیص

اس عنوان کے تحت ہمیں دو طریقوں پر غور کرنا ہے، تخمینہ لگانا (کنکوت) اور پیمائش جن کا ہم تیرہویں صدی تک کی ہندوستان میں تصنیف شدہ فارسی تحریروں میں سراغ لگا سکتے ہیں اور تیسرا طریقہ جو بہت بعد کی تحریروں میں ملتا ہے۔ کنکوت میں، حکومت کے حصّہ کی مقدار کو کھڑی فصل کے معائنہ کے بعد تعین کرتے ہیں، کسان کی ذمہ داری پیداوار کے پکنے کے قبل مقرر کی جاتی ہے اور اس کی وصولیابی موزوں ترین وقت پر کی جا سکتی ہے۔ زمیندار اور کاشتکار کے درمیان یہ طریقہ دورِ حاضر میں بھی چلا آتا ہے۔ اس کا فائدہ اس عمل کو زیادہ مدت تک پھیلانے میں ہے۔ لیکن مثل پیداوار کی تقسیم کے، اس طریقہ کی کارکردگی میں مالک کی ذاتی نگرانی ایک اہم عنصر ہوتی ہے اور ماتحت عملہ کے اس عمل کو ایک بڑے علاقہ پر انجام دینے کی صورت میں، یہ خطرہ مسلسل قائم رہتا ہے کہ تشخیص کنندگان حکومت یا زمیندار کو دھوکہ دینے کی غرض سے کسانوں کے ساتھ سازباز کر لیں۔

کنکوت اور تقسیم کے عمل ایک دوسرے سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کہنا درست ہوگا کہ انیسویں صدی کے آغاز پر جہاں کہیں بھی ادائیگیوں کا انحصار فصل پر ہوتا وہاں کنکوت کے قاعدہ پر عمل ہوتا اور تقسیم (پیداوار) کو معمولاً ایسی شاذ صورتوں میں اختیار کرتے تھے جہاں کنکوت کے متعلق نزاع ہو اور غالباً یہ ایک قدیم رواج تھا، لہٰذا ان دونوں عمل کو شریک داری کے عنوان سے موسوم کرنا، سہولیت کا باعث ہوگا اور اب میں اسی اصطلاح کو استعمال کروں گا اور تقسیم اور کنکوت میں اس وقت امتیاز قائم کروں گا جب سلسلۂ عبارت کے تحت اس کی ضرورت پیش آئے۔

پیمائش اصلاً قابلِ تصدیق حقائق کی پابندی کر کے ان بندشوں کو دفع کرنے کی ایک کوشش معلوم ہوتی ہے جو شریک داری کی صورت میں پیش آتے تھے۔ اس کے تحت، رقبہ کی ایک اکائی کی ہر پیداوار کے لیے حکومت کے حصّہ کے طور پر ایک اوسط یا معیاری ہندسہ ہمیشہ کے لیے یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس وقت تک کے لیے جب تک کہ حکومت اسے دوبارہ متعین کرنے کا فیصلہ نہ کرے مقرر کر لی جاتی تھی اور ہر فصل میں اس پیداوار کے رقبہ کی پیمائش کر کے صحیح مطالبہ کو تشخیص کرتے تھے۔ مثلاً اگر رقبہ کی اس اکائی پر جسے ایک بیگہ کہتے تھے حکومت کا حصّہ

۱۰۰ پونڈ، مقرر کیا گیا ہو تو گیہوں کی کاشت کے ہر بیگہ پر مقدارِ تشخیص یہی ہوگی، خواہ واقعی پیداوار کچھ بھی ہو۔ پیمائش کی صحت کو فصل کے کھیت میں کھڑے رہنے کے دوران کسی وقت بھی جانچ سکتے تھے اور پھر اس کے بعد معاملہ محض ریاضی کا رہ جاتا تھا۔

تیرہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک تشخیص کے ان دونوں طریقوں یعنی شریک داری اور پیمائش کو ایک دوسرے کے مقابل اور بعض اوقات ساتھ ساتھ رائج پاتے ہیں۔ اس بات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ عملاً ان میں کا کوئی ایک دوسرے سے بہت زیادہ واضح طور پر برتر نہ تھا۔ اس عہد میں، آگے چل کر ہمیں ایک دوسرے طریقہ کی اطلاع ملتی ہے جسے ہم ٹھیکہ کے نام سے بیان کریں گے۔ اس کے تحت کسان خواہ وہ کوئی پیداوار اگائے تشخیص کرنے والے عہدہ دار سے اپنی آراضی داری کے لیے ایک معینہ سالانہ رقم ادا کرنے کا اقرار کرتا تھا اور ہمیں اسے اس طریقہ کی جو فی الوقت ملک کے بیشتر حصہ میں زمیندار کاشتکار کے مابین رائج ہے بنیاد تصور کرنی چاہیے۔

ب۔ درمیانی اشخاص کے ذریعہ تشخیص

میں نے ان تمام طبقوں کے لیے جنھیں بادشاہ اس امر کا اختیار یا اجازت دیتا تھا کہ وہ اس کے حصہ کو وصول کر کے اس کا جزو یا مسلّم اپنے پاس رکھ لے، درمیانی اشخاص کی اصطلاح منتخب کی ہے۔ انھیں سرداروں، نمائندوں۔ جاگیرداروں۔ معافیداروں اور اجارہ داروں کے طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

سرداران۔ مسلم عہد کے آغاز پر ہم دیکھتے ہیں کہ غیر ملکی بادشاہوں کے زیرنگیں وسیع علاقے ہندو سرداروں کے تصرف میں قائم ہیں اور وہ ان کے لیے نقدی خراج ادا کرتے ہیں اور یہ کہ شاہی عہدہ داران، ان علاقہ کے کسانوں کے ساتھ معمولاً معاملات نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے اندرونی انتظام میں دخیل ہوتے ہیں۔ بالکل شروع شروع کی تحریروں میں، ان میں زیادہ اہم سرداران، رانا، رائے یا راؤ پکارے جاتے ہیں۔ یہ خطابات اب تک قائم ہیں۔ ان کے اس عہد میں استعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سرداران اگر عملاً نہیں تو نظری طور پر خود اپنے استحقاق کی بنیاد پر حکمران تھے اور انھوں نے بیشتر اپنے سابقہ اختیارات کو برقرار رکھتے ہوئے نئے بادشاہوں کی اطاعت قبول کی تھی۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ، سرداروں کو مجموعی طور پر زمیندار کہا جانے لگا اور گو کہ ان کے حقوقِ ملکیت کی شرائط میں اہم تبدیلیاں پیش آئی ہیں، لیکن پھر بھی ان سرداروں

اور موجودہ دور کے بعض زمینداروں کے درمیان ایک تاریخی تسلسل پایا جاتا ہے۔ ماضی میں سرداروں کی طرف سے مال کی ادائیگی جن خطوط پر متعین ہوتی تھی ان کے متعلق صحیح تحریریں نہیں ہیں۔ غالباً ہر سردار، جیسا حالات اجازت دیتے، معاہدہ کے ذریعہ یا حکماً خود اپنے لیے یہ فیصلہ کیا کرتا کہ اسے کسانوں سے حکومت کا حصہ کس طور پر وصول کرنا چاہیے۔ اس کا حقِ آراضی داری اس کی وفاداری پر منحصر رہا کرتا تھا۔ وفاداری کا بنیادی مفہوم، خراج کا پابندی کے ساتھ ادا کرنا تھا۔ اس مرحلہ پر ہمارے سامنے یہ تصور آتا ہے جو غالباً اب تک ہندوستان میں کلیتہً متروک نہیں ہوا ہے یعنی یہ کہ عدم ادائیگی اور غداری ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ عدم ادائیگی کے نتیجہ میں معمولاً تعزیری مہم پیش آتی اور اس کے کامیاب ہونے کی صورت میں، سردار کی بے دخلی یا پھر نئی شرائط پر اس کی بحالی عمل میں آتی۔

نمائندے :۔

مسلم عہد کی زیادہ مدتوں کے دوران ہر گاؤں کو بادشاہ کے حصہ کے طور پر جو رقم ادا کرنی ہوتی تھی، اسے عام طور پر، فصل بہ فصل یا سال بسال سرکاری تشخیص کنندہ اور کسانوں کے نمائندہ مکھیا کے درمیان طے کر لیتے تھے۔ اس سلسلہ میں کاشت یا متوقع کاشت کے رقبہ کا دیگر حالات کے ساتھ ساتھ لحاظ رکھتے تھے۔ لیکن تشخیص ایک مجموعی رقم کی شکل میں ہوتی تھی جسے مکھیا بعد میں کسانوں پر تقسیم کر دیتا تھا۔

یہ طریقہ جسے میں تشخیصِ مجموعی کے تحت بیان کروں گا ہو سکتا ہے کہ سرداروں کے ذریعہ تشخیص کے طریقہ کے بہت قریب ہو، خصوصاً ایسی صورت میں کہ سردار کے اختیارات ایک موضع تک محدود ہوں اور جب یہ تشخیصِ مجموعی، چودھری یا پرگنہ کے مکھیا کے ساتھ ایک پورے پرگنہ کے لیے عمل میں آئی ہو تو یہ قربت اور بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن بلحاظ مدت ایک فرق پایا جاتا تھا۔ تشخیصِ مجموعی صرف ایک فصل یا ایک سال کے لیے کی جاتی تھی، جب کہ سردار کی ادائیگی کی رقم بندھی ہوئی ہوتی تھی۔ یہ رقم اس مفہوم میں بندھی ہوئی نہ تھی کہ یہ ناقابلِ تغیر ہو بلکہ ایسا اس وقت تک کے لیے ہوتا جب تک کہ حکام اسے تبدیل کرنے کا فیصلہ نہ کریں۔

جاگیرداران :۔

اس لفظ کا عمومی تصور یہ ہے کہ نقد ادائیگی کے بجائے حکومت کسی حقدار کے لیے

ایک متعین علاقہ کی پیداوار میں بادشاہ کے حصّہ کو مخصوص کر کے اس کے مستقبل کے مالی حقوق کا انتظام کرتی تھی۔ اس کے ساتھ کم از کم اس قدر انتظامی اختیارات عطا کیے جاتے تھے جو جاگیردار کو واجب رقم کی تشخیص اور وصولی کے لیے کافی ہوں۔ یہ ادارہ مسلم زرعی نظام کا سب سے اہم عنصر ہے۔ علاقہ ہو سکتا ہے کہ ایک مسلّم صوبہ یا محض ایک موضع ہو۔ جس مطالبہ کے عوض، جاگیر دی جاتی تھی، وہ فوج کے اخراجات یا فوجی۔ یا غیر فوجی خدمات کی تنخواہ کے بقدر ہو سکتا تھا اور عام دنوں میں اس طور پر حکومت کے کسانوں پر بیشتر مطالبات جاگیر میں دے دیے جاتے تھے۔

معافیداران:-

اسی طور پر کسی مخصوص علاقہ کے محاصل میں حکومت کے حصّہ کو حقداروں کے بڑے طبقوں میں سے کسی ایک کو بطور کسی سابقہ خدمت کی پنشن، نیک چلنی یا کسی ادبی یا فنی کارگذاری کے انعام کے طور پر یا مستحق افراد یا مذہبی یا علمی یا خیراتی اوقاف کے اخراجات یا اس قسم کے دیگر کاموں کے لیے عطا کر سکتے تھے۔ معافیدار کی حیثیت جاگیردار کے مثل ہوتی تھی۔ ان 2 دو طبقوں میں فرق یہ تھا کہ جاگیرداری کے ساتھ مستقبل میں خدمات کی شرط لگی رہتی تھی، جب کہ معافی دار کے ساتھ یہ صورت نہ ہوتی لیکن یہ دونوں طبقے، بادشاہ کی مرضی (اس فقرہ کے لفظی معنوں میں) کے دوران اپنے اپنے عطیوں پر قابض رہتے اور معافی یا جاگیر بادشاہ کے ایک سرسری حکم کے ذریعہ ختم کی جا سکتی تھی۔

اجارہ داران:-

بادشاہ کے حصّہ کو اجارہ پر اٹھانے کے طریقہ کے پیچھے یہ تصوّر کارفرما معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عہدہ دار جو کسی صوبہ یا اس سے چھوٹے علاقہ کے انتظام پر مامور کیا جائے وہ اپنے سپرد کیے ہوئے علاقہ کی خالص مالگزاری کے مساوی ایک مقررہ سالانہ رقم ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کر کے، نظم و نسق کے کام کو بہت مختصر کر دے اور اس طور پر انتظامی عہدہ داران اس علاقہ کی جملہ تفصیلی مالی ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائیں۔ ایسی صورت میں بھی اس طریقہ کی ایک بڑی مملکت کے اندر ایسے ایام میں جب کہ رسل و رسائل کے ذرائع سست رفتار اور ان میں رخنہ پڑنے کے امکانات اکثر پائے جاتے ہوں، فی الفور مذمت نہ کرنی چاہیے۔ لیکن مسلم ہندوستان میں مثل دیگر ملکوں کے، یہ طریقہ

سٹہ بازوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا رجحان رکھتا تھا، اور اپنے عہدہ کی مختصر مدت میں ان کی نفع اندوزی کی کوششوں سے انتظامیہ کو نقصان پہنچتا تھا۔ لہٰذا عملی نقطۂ نظر سے ہمیں ایک ایسے گورنر جس کو بنیادی طور پر اپنی سیرت و صلاحیت کی وجہ سے اجارہ دیا گیا ہو اور ایسے سٹہ باز اجارہ دار کے درمیان جو خاص طور پر یا محض اپنی بولی کے سب سے زیادہ اونچی ہونے کے باعث منتخب کیا گیا ہو امتیاز برتنا چاہیئے۔

ہر جسامت کے اجارے دئے جا سکتے تھے، ایک صوبہ یا صوبوں کے ایک مجموعہ سے لے کر ایک واحد موضع تک کے اور ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ بعض حالات میں دیگر مختلف آراضی داریوں کے اجارہ کی شکل کو اختیار کرنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ خالص مالی نکتۂ نگاہ سے، ایک سردار اجارہ دار ہوتا تھا جس کی میعاد غیر متعین ہوا کرتی اور اس لحاظ سے مکھئے بھی جو کسی ایک موضع یا پرگنہ کی جانب سے معاملہ کرتے تھے، اصطلاحاً اجارہ دار ہوتے تھے۔ تنخواہ دار تشخیص کنندگان اور محصلین کم و بیش ہونے والی وصولیوں کے بجائے یک مقررہ رقم کی ذمہ داری قبول کر کے آسانی کے ساتھ اجارہ دار بن سکتے تھے۔ اس طور پر متعدد ادارے جنھیں تجزیہ کی خاطر ایک دوسرے سے مختلف تصوّر کرنا چاہیئے، باعتبارِ عمل ایک دوسرے سے مخلوط ہو سکتے تھے جس کے نتیجہ میں بعض ادوار میں زرعی نظام ایک ایسا مسلسل متغیر ہونے والا منظر پیش کرتا ہے جس میں سرداران اور اجارہ داران، مکھئے اور محصلین میں سے ہر ایک دوسرے کی ظاہری شکل اختیار کر سکتا تھا۔

تقسیم پیداوار کے قدیم طریقہ میں گو تاریخی نہیں لیکن منطقی تبدیلیوں کے تسلسل کے متعلق غالباً کافی لکھا جا چکا ہے۔ اب اس میں حکومت کا حصّہ جس شکل میں فی الواقعی وصول کیا جاتا تھا، اس کے بیان کا تھوڑا اضافہ ہونا چاہیئے۔ مذکورہ بالا ہر طریقہ پر جہاں تک کسان کا تعلق تھا، نقدیا جنس میں عمل ہو سکتا تھا۔ پیداوار میں بادشاہ کے حصّہ کی مالیت کا تعین، جب اسے مناسب تصوّر کرتے، مختلف طریقوں سے مقرر کی ہوئی شرحوں کے مطابق کرتے تھے۔ دوسری طرف درمیانی اشخاص کے ذمہ واجب رقوم کی تشخیص اور ادائیگی، بہر حال مسلم حکومت کی پہلی صدی سے بمقدار نقد کی جاتی تھی۔ کسان اور بادشاہ (یا اس کے نمائندے) کے درمیانی نقدی رشتے کے پہلے پہل وجود میں آنے کے زمانہ کا مجھے علم نہیں۔ لیکن اس خیال کو کہ یہ ایک دورِ حاضر کا طریقہ ہے، غیر تاریخی ہونے کی بنا، پر مسترد کر دینا چاہیئے۔ جیسا کے اگلے باب میں آئے گا، دہلی کے نواحی علاقہ کے کسان معمولاً اپنے حصّہ کو بہر حال تیرھویں صدی کے آخری حصّہ میں نقد ادا

کرتے تھے۔

اس مسئلہ کی تحقیق کہ یہ مختلف تبدیلیاں کب وجود میں آئیں، خاص طور پر ہندو عہد کے طالب علموں کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ اگر ان میں سے سب نہیں تو بیشتر مسلم فتوحات کے قبل کی ہیں۔ لیکن میں یہاں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ بعض پہلوؤں کی جو غالباً یا یقیناً ملکی ہیں، ان کی نشاندہی کر دوں۔ اس کے سب سے زیادہ واضح مثال مذہبی یا خیراتی اوقاف کے عطیات ہیں جن کا وجود اس وقت کے موجود کتبات سے ثابت ہوتا ہے جن میں عطیات کے دستاویزوں کی تاریخیں، مسلم تسلّط سے بہت پیشتر کی ہیں۔ تنخواہ کے عوض میں جاگیروں کو خود مقدّس قانون بظاہر تسلیم کرتا تھا، کیونکہ منو میں درج ہے کہ اس عہدہ دار کو جس کے سپرد ایک سو مواضعات کا انتظام ہو، ایک موضع کی مالگزاری ملنی چاہئے۔ یہ ضابطہ مسلم عہد کے معروف ادارۂ جاگیر کی مدّت کو ہندو تمدّن کے بالکل ابتدائی دور تک پہنچاتا ہے۔ اگر ہم چینی سیّاح کے اس قول کو کہ "حکومت کے وزراء اور عام عہدہ داران سب اپنے اپنے حصّہ کی زمین رکھتے ہیں اپنی جاگیر کے شہروں پر ان کی گذران ہے" درست تسلیم کریں تو کم از کم ہرش کے تحت قنوج میں، خدمت کے عوض میں جاگیروں کا قاعدہ تھا۔ بقول پروفیسر اینگر، جنوب میں چولوں کے نظم و نسق میں بھی یہ نظام رائج تھا: "اونچے اور نیز نچلے درجہ کے عہدہ داروں کو عطیات زمین یا مالگزاری کی جاگیروں کے ذریعہ تنخواہیں دی جاتی تھیں"۔

وجے نگر کی ہندو مملکت میں اجارہ داری کی شرائط کے ساتھ صوبہ داروں کی تقرری کا رواج تھا اور اس کا امکان ہے کہ اس مملکت کے تحت اجارہ داری، صوبوں سے لے کر موضعوں تک میں رائج رہی ہو جیسا کہ اس مملکت کے خاتمہ کے بعد قطعاً صورتِ حال تھی۔ یہ امر قابل توجّہ ہے کہ سترہویں صدی کے دوران علاقہ وجے نگر کا زرعی نظام عملاً، گولکنڈہ کی مسلم مملکت کے مماثل تھا اور یہ بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اوّل الذکر نے، موخر الذکر سے ایک نیا نظام مستعار لیا ہو بلکہ زیادہ ممکن یہ ہے کہ تیرہویں صدی کے اختتام تک جنوب میں اجارہ داری ہندو زرعی نظام کے اہم ترین ستون کے طور پر قائم ہو چکی ہو اور یہ کہ علاء الدین خلجی نے اسے اس علاقہ کی تسخیر کے وقت جو بعد میں دکن کی مملکتوں کے نام سے موسوم ہوا اختیار کر لیا ہو۔

لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معافیداران، جاگیرداران اور غالباً اجارہ داران بھی ترقی یافتہ ہندو نظام سے متعلق تھے۔ میرے علم میں کوئی بلاواسطہ شہادت ایسے سرداروں یا سابق بادشاہوں

کی موجودگی کو ثابت کرنے والی نہیں ہے جو کسی بر تر طاقت کو مالگزاری ادا کرتے ہوں۔ لیکن ہندو عہد میں بادشاہوں کی تعداد اور جنگوں کی کثرت قدرتی طور پر ایسے ادارے کے وجود میں آنے کے لیے سازگار ماحول فراہم کرتی تھی اور ارتھ شاستر ماتحت بادشاہوں اور ان کے جانب سے ٹیکسوں یا امدادی رقوم علی کی ادائیگیوں کے وجود یا کم از کم امکان کو تسلیم کرتا ہے۔ اس تصنیف سے مسلّم مواضعات سے وصول کئے گئے ٹیکسوں کی اطلاع ملتی ہے جس سے مسلم عہد کی تشخیص مجموعی کے قسم کی کسی چیز کی نشاندہی ہوتی ہے اور آخر میں پیمائش کے لازمی عنصر یعنی، مزروعہ رقبہ کی فی اکائی پر غلہ کی ایک معینہ تعداد کی ادائیگی کا ذکر جنوبی ہند کے کتبوں میں بار بار آتا ہے جن کی تاریخ مسلمانوں کے شمالی ہند پر تسلّط سے بہت پہلے کے عہد کی ہے۔

اس سلسلہ میں راجپوت ریاست، اودے پور کے موجودہ طریقہ کا حوالہ دینا مناسب ہوگا یہ علاقہ مسلم نظم و نسق کے کبھی ماتحت نہیں رہا اور ممکن ہے کہ یہاں ہندو ادارے اپنی اصل حالت میں قائم رہے ہوں۔ مسٹر جی چینیوکس ٹرینچ (MR. G. CHENEVIX TRENCH) جنھیں حال میں اس ریاست کی دوبارہ تشخیص کے کام پر مامور کیا گیا ہے کی اطلاع کے مطابق یہاں تشخیص کے تین طریقے، شریک داری، پیمائش اور ٹھیکہ ساتھ ساتھ رائج تھے اور بعض اوقات تو ایک واحد موضع کے حدود کے اندر ایسا پایا جاتا تھا۔ شریک داری پر معمولاً تخمینہ کے ذریعہ پیداوار کی ایک تہائی یا نصف کی شرح پر (ابواب کے علاوہ) عمل ہوتا تھا لیکن کسانوں کو کھلیان میں پیداوار کی واقعی تقسیم اور وزن کشی کرانے کا اختیار حاصل رہا کرتا تھا۔ بعض مواضعات میں پیمائش کا عام رواج تھا، جب کہ گنّے پوستہ یا سبزیوں کے ایسی فصلوں کے لیے جن کا معاملہ کھلیان پر نہیں ہوتا، جس مدت کی تحریریں ملتی ہیں، یہ ایک مستقل قاعدہ تھا۔ نظام ٹھیکہ کی قدامت، بعض صورتوں میں چار صدیوں تک کے پرانے کاغذات سے ثابت ہے جو اس کے طویل قیام کا مظہر ہے۔ ریاست میں تشخیص مجموعی عام ہے: اجارہ داری ابھی تقریبًا نصف صدی قبل ترک کی گئی ہے اور عہدہ داروں کے نام جاگیریں ابھی زمانۂ حال تک نظم و نسق کے معمولات میں داخل تھی۔

یہ ہے صورت حال، شمالی ہندوستان کے اس حصہ کی جو مسلم رواج کے زیر اثر کم سے کم تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ امور مذکورہ بالا کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنا معقول ہوگا کہ جب کبھی مسلم عہد میں ہمیں کوئی بظاہر جدید ادارہ نظر آئے تو اسے بے تامّل مسلمانوں کی جدّت

تصوّر کر لینا ایک عاجلانہ فیصلہ ہوگا۔ اس امکان کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ وقائعوں میں درج کیے جانے کے قبل ایک غیر معین مدّت سے وجود میں رہا ہوگا۔ کوئی طالب علم جو ہندوستان پر اپنی توجہ کو محدود رکھتا ہے، اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی ترغیب ہوتی ہے کہ مسلم حکمرانوں نے اپنے تسلط کے وقت جن اداروں کو موجود پایا انھیں مجموعی طور پر قبول کر لیا۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فاتحین اپنے ہمراہ خود اپنے زرعی نظام کے تخیلات لائے تھے جن کے اہم خطوط، اسلامی قانون نے معین کیے تھے اور نظری اعتبار سے انھیں بادشاہ یا فقہا، تبدیل نہ کر سکتے تھے۔ اگلی فصل میں فاتحین کے اپنے ہمراہ لائے ہوئے تخیلات کا خاکہ اور ان تخیلات کا ان اداروں سے رشتہ جنھیں انھوں نے موجود پایا، بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

3 - اسلامی نظام

ابتدائی اسلامی نظام کا مستند ترین بیان ایک کتاب میں ملتا ہے جس میں آٹھویں صدی کے دوران ہارون الرشید کے دورِ خلافت میں بغداد کے قاضی القضاۃ ابو یوسف یعقوب کے نظریات درج ہیں۔ اس کے بیان کیے ہوئے نظام کی بنیاد وہ فرق ہے جو عشری زمین اور خراجی زمین میں قائم کیا گیا ہے۔ عشری زمین ابتدائی طور پر ملک عرب کا وطنی علاقہ تھا اور اس میں مفتوحہ علاقہ صرف اس وقت شامل کیا گیا جب فاتحین نے پرانے باشندوں کو بے دخل کر کے زمین کو اپنے مسلم پیرؤں میں تقسیم کیا۔ اس طریقہ پر ہندوستان میں زیادہ عمل نہیں کیا گیا۔ زمین پر ہندو باشندوں کا قبضہ برقرار رہنے دیا گیا لہٰذا یہ علاقہ اصطلاحاً خراجی یا خراج ادا کرنے والی زمین پر مشتمل تھا یعنی اس کے قابض پر ذاتی ٹیکس (جزیہ) اور اس کی کاشت کی ہوئی زمین پر خراج واجب الادا ہوا۔ ابتدائی تصوّر یہ تھا کہ یہ خراج عمومی مسلمانوں کے مفاد کے لیے وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن اسلام میں خود مختار حکمراں حکومتوں کی نشوونما کے بعد، کسی مخصوص حکومت کا وصول کیا ہوا خراج اگر نظری اعتبار نہیں تو عملی اعتبار سے، حکمراں کی آمدنی تصوّر کیا جانے لگا اور کم از کم ہندوستان میں خراج کا صحیح ترجمہ مالگزاری زمین یا زیادہ مختصر طور پر مالگزاری کیا جا سکتا ہے۔

یہ مالگزاری اصلاً زمین کی پیداوار کا ایک حصّہ ہوتی تھی۔ اسلامی قانون صحیح حصّہ کا تعین نہیں کرتا اور ابو یوسف (59، 95) تشخیص کی زیادتی کے باعث پیداوار میں رکاوٹ پیدا

ہونے کے خطرہ کے علاوہ کسی اور حد کو تسلیم نہیں کرتا۔ حکمراں مقامی حالات کے لحاظ سے مقدارِ مطالبہ کا خود فیصلہ کرتا تھا۔ مگر ہمیشہ شرط یہ ہوتی کہ اس مطالبہ کے نتیجہ میں کسانوں کی فراری یا ان کی کاشت کے رقبہ میں کمی نہ واقع ہو۔ طریقۂ تشخیص کا فیصلہ بھی حکمراں کے سپرد ہوتا اور ابو یوسف کی تصنیف[44] میں ہم دو طریقوں کا ذکر پاتے ہیں جنھیں ہم پہلے شرکت داری اور پیمائش کے نام سے بیان کر چکے ہیں۔

ابو یوسف کا تصور تھا کہ صوبیدار (والی) اور کسانوں کے درمیان بلاواسطہ تعلق قائم ہوا اور وہ درمیانی اشخاص کے متعلق کچھ نہیں لکھتا۔ اس نے (159، 160) اجارہ داری کے ایک ظالمانہ طریقہ ہونے کے باعث اس کی مذمت کی ہے۔ لیکن اس کی تحریریں شاہد ہیں کہ وہ اس سے عملاً مانوس تھا۔ وہ اسے ایسی صورت میں کہ کسان اپنے ذمہ مجموعی مطالبہ کو طے کرنے کے لیے اپنے کسی نمائندہ کو مجاز کر دیں، جائز تصور کرتا ہے۔ یہ انتظام عملاً اس طریقہ کے مماثل ہے جسے ہم نے تشخیص مجموعی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ میں ابو یوسف کی تصنیف میں سرداروں کی وساطت سے تشخیص یا معافیوں یا جاگیروں کی موجودگی کی براہِ راست سند کا سراغ نہ چلا سکا، لیکن یہ ایک یقینی امر ہے کہ دہلی میں پہلی سلطنت قائم کرنے والے مسلمان ان اداروں سے واقف تھے۔ مذہبی کاموں کے لیے اوقاف کا قیام، اسلامی قانون کا جزوِ اعظم تھا۔ بارھویں صدی میں افغان بادشاہ جاگیریں پابندی کے ساتھ عطا کرتے تھے اور غور کا سردار، ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت اختیار کرنے کے قبل غزنی کو مالگزاری (خراج) ادا کرتا تھا[45]۔

چنانچہ مسلم فاتحین جس نظام کو افغانستان سے ہندوستان اپنے ہمراہ لائے تھے معتد بہ حد تک اس نظام کے مماثل تھا۔ جسے انھوں نے ہندوستان میں رائج پایا۔ وہ زمین کی پیداوار میں اپنا حصّہ طلب کرنے کے لیے پہلے سے تیار تھے اور انھوں نے دیکھا کہ کسان اسے ہر اس شخص کو جو اسے وصول کرنے کی مقدرت رکھتا ہو ادا کرنے کے عادی ہیں۔ وہ بذریعہ شرکت داری یا پیمائش، تشخیص کرنے کے لیے آمادہ تھے اور انھوں نے ان دونوں طریقوں کو ملک کے اندر موجود پایا۔ انھیں ایسے سرداروں کا علم تھا جو اپنے علاقوں کے لیے مالگزاری ادا کرتے تھے اور انھوں نے ان کو اس پر آمادہ بھی پایا۔ وہ معافیوں اور جاگیروں کے اداروں سے جو ہندوستان میں پہلے سے معروف تھے اور اجارہ داری سے جو غالباً یہاں رائج تھی، مانوس تھے۔ اور ایک بار جب مسلمانوں نے بزورِ اسلحہ اپنی حکومت قائم کر لی تو پھر ایسے دو نظاموں کے درمیان جو ایک

دوسرے سے اس قدر قریبی مماثلت رکھتے تھے باہمی امتزاج کے لیے کوئی زیادہ رکاوٹ نہ ہوسکتی تھی۔ ہندو اور مسلم نظاموں کے درمیان صرف دو فرق قابلِ لحاظ ہیں۔ اوّل تو مسلمانوں کا پورے معاشیاتی لگان پر دعویٰ ہندو مقدس قانون کی مسلمہ پیداوار کے چھٹیں حصّے (یا کوئی اور کسر) کی حسابی حد بندی سے مختلف تھا۔ لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، یہ حد بندی تھوڑی بہت لچکدار تھی اور ایسے فاتحین کی راہ میں جو اپنے مطالبات کو بزورِ طاقت منوا سکتے تھے کوئی سنگین رکاوٹ نہ پیش کرتی تھی۔ دوسرے یہ کہ مطالبۂ مالگزاری کی شرح میں فرق تھا۔ اگر میں ماخذ کو صحیح سمجھ سکا ہوں، تو ہندو مقدس قانون میں مندرجہ شرح میں یکسانیت تھی، یعنی ہر پیداوار میں برابر کا حصہ طلب کیا جاتا تھا، جب کہ مسلم شرح تفریقی تھی یعنی اس میں مقدار پیداوار اور وسیلۂ آبپاشی کے فرق کا لحاظ رکھتے تھے، مثلاً، ابویوسف (ص ص ۷۴ تا 76) یہ مطالبات تجویز کرتا ہے: گیہوں و جو، قدرتی آبپاشی کی صورت میں $\frac{2}{5}$، چرخ سے آبپاشی کی صورت میں $\frac{3}{10}$ کھجور، انگور کی بیلیں، ہری پیداواریں اور باغات، $\frac{1}{3}$، موسم گرما کی پیداواریں $\frac{1}{4}$ آیا یہ کہ دہلی کی مسلم سلطنت میں اس قسم کی تفریقی شرحیں شروع کرنے کی کوئی ابتدائی کوشش کی گئی یا نہیں، ایک ایسا سوال ہے جس کا میں جواب نہیں دے سکتا۔ اس کا یہ سبب ہے کہ مجھے 1300ء کے قبل مطالبات کی شرحیں نہ مل سکیں۔ لیکن علاءالدین خلجی نے اسی سال کے لگ بھگ بجھوتو میں نصف حصہ کے یکساں مطالبہ کے طریقہ کی جسے میں ہندوؤں کا رواج تصوّر کرتا ہوں تقلید کی۔ بعد کے زمانہ میں شیر شاہ اور اکبر نے بھی ہندو رواج اختیار کیا۔ مسلم ہندوستان میں سب سے پہلی تفریقی شرح جس کی واضح شہادت مجھے مل سکی وہ ہے جسے وسط سترہویں صدی میں مرشد قلی خاں نے دکن میں رائج کیا تھا۔

یہ درست کہ ایک سنسکرت تصنیف 'سکرنیتی' میں ایک تفریقی درجہ بندی کی سفارش کی گئی ہے۔ اس تحریر کو اس نظریہ کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ یہ طریقہ مقدس قانون کا جزو تھا۔ یہ نظریہ نسبتاً جدید ہے۔ اس میں مندرج توپ خانہ کے حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ اپنی موجودہ شکل میں، مسلم عہد سے متعلق ہے اور جہاں تک میری دریافت کا تعلق ہے اس کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو اس نظریہ کے متناقض ہو کہ اس کی تدوین سترہویں صدی کے دوران جب کہ ہندوستان میں واقعتہً تفریقی شرح شروع ہو چکی تھی: عمل میں آئی، میرے خیال میں، اس کی عبارت کی بہترین تعبیر یہ ہوگی کہ اس میں دونوں طریقوں کا مرکب

پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چھٹیں حصہ کی روایتی شرح کو باضابطہ محفوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن اس کے اطلاق کو بنجر اور چٹانی زمینوں تک محدود رکھا گیا ہے۔ جب کہ زیادہ زرخیز زمینوں کے لیے، ذرائع آبپاشی کے مطابق، چوتھائی سے لے کر نصف حصہ تک اونچی شرحیں، تشخیص کی بنیاد کے طور پر تجویز کی گئی ہیں۔ یہ غالباً ایسے مصنف کی تحریر ہے جو مقدس قانون سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جدید طریقہ کا بھی علم رکھتا تھا۔

بہرحال مذکورہ بالا اختلافات جزوی معاملات ہیں اور یہ کہنا درست ہوگا کہ چودہویں صدی کے دوران ہم جس زرعی نظام پر عمل ہوتا ہوا پاتے ہیں، وہ اپنے اہم اجزاء میں اسلامی قانون اور نیز ہندو مذہب کے مقدس قانون سے ہم آہنگ تھا۔ چنانچہ فاتحین کو اس کے علاوہ اور کچھ نہ کرنا پڑا کہ وہ ان اداروں کے جنھیں انھوں نے موجود پایا عربی و فارسی نام رکھ دیں۔ اور اس پر بھی پابندی کے ساتھ عمل نہیں کیا گیا، کیونکہ بعض صورتوں میں، فوری طور پر ہندوستانی نام اختیار کر لیے گئے اور بعض میں ان ناموں نے درآمد کئے ہوئے ناموں کو بالآخر بیدخل کر دیا۔ اس ارتقائی عمل کی تھوڑی تفصیل ضروری ہوگی کیونکہ تبدیل ہوتی ہوئی اصلاحات، ابتدائی وقائع کے ادراک کی اہم رکاوٹوں میں سے ایک ہے۔

سب سے اوّل ہم اس نظام کی اہم ترین شخصیت کو لیتے ہیں۔ شروع میں منفرد کسان کے لیے کوئی مقررہ اصلاح نہ تھی، لیکن عموماً کسان کو پابندی کے ساتھ عربی لفظ 'رعیت' سے موسوم کرتے تھے جسے اب انگریزی میں بطور 'RYOT' کے اپنا لیا گیا ہے۔ اس لفظ کے معنی ان تمام جانوروں کا ایک گروہ ہوتا ہے جو روزی فراہم کرنے کا ذریعہ ہونے کے باعث حفاظت کے مستحق ہوتے ہیں، مثلاً ریگستان کے اونٹ، چراگاہی ملک کے مویشی اور زرعی زمین کے کسان۔ جہاں تک میری دریافت ہے، ہندوستان میں اس لفظ کے مفہوم کا 'گروہ' سے تبدیل ہو کر 'منفرد' ہو جانا جلد از جلد اٹھارہویں صدی کے قبل واقع نہ ہوا اور پورے مسلم عہد کے دوران اسے معمولاً اسم جمع تصوّر کرنا چاہیے اور اس کے جمع کے صیغوں سے "کسانوں" کا نہیں بلکہ گروہوں کا مفہوم لینا چاہیے۔

'سردار' کے سلسلہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رواج کی تکمیل بتدریج عمل میں آئی۔ منہاج السراج نے تیرہویں صدی کے وسط کی اپنی تحریروں میں 'رائے' یا 'رانا' ایسی مخصوص ہندوستانی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ اس کے ایک صدی بعد ضیاء برنی نے سردار کے لیے معمولاً 'خوط' کا لفظ

استعمال کیا ہے۔ میں نے اس لفظ کو شمالی تحریروں میں کہیں اور نہیں پایا۔ اس نے زمیندار کا لفظ محض چند عبارتوں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن اگلے وقائع نویس شمس عفیف نے زمیندار، کو اکثر استعمال کیا ہے اور اس کے بعد سے یہ مستقلاً استعمال میں ہے۔

گاؤں کے لیے ہمیں شروع ہی سے فارسی لفظ دیہہ ملتا ہے جس میں بعد میں عربی لفظ موضع کا اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن مواضعات کے مجموعہ کو جسے ہندی میں پرگنہ کہتے ہیں مختلف نام دیئے گئے۔ ابتدائی ترین مصنفین عموماً عربی لفظ قصبہ کا استعمال کرتے تھے (جو ابھی تک قصبہ (ٹاؤن) کے موجودہ ہندوستانی مفہوم کے لیے مخصوص نہ ہوا تھا) لیکن اس کا ہندی نام اولاً شمس عفیف میں ملتا ہے جو اس کے بعد پرگنہ معمولاً ایک فارسی اصطلاح ہو جاتی ہے۔ گو قصبہ کا لفظ بطور ایک کبھی کبھی استعمال ہونے والی اصطلاح کے اپنا مقام برقرار رکھتا ہے۔

ہندو عہد میں پرگنوں اور مواضعات کے لیے چودھری اور حساب کنندہ تھے۔ یہ عہدے مسلمانوں کے تحت بھی برقرار رہے۔ لیکن دو پرانے ناموں کو اختیار کرنے کے علاوہ دوسرے ناموں کے لیے متبادلات کا استعمال شروع ہوا۔ پرگنہ کا سربراہ چودھری اور گاؤں کا حساب کنندہ، پٹواری رہا۔ دوسری طرف، گاؤں کے چودھری کو مقدم کا نیا نام دیا گیا۔ اور پرگنہ کا حساب کنندہ قانون گو کہلایا۔

میرا خیال ہے کہ رواج کا یہ اختلاف ان حالات سے مخصوص ہے جن کے تحت ہندو اور مسلم نظاموں کا امتزاج عمل میں آیا۔ جہاں تک ہمیں پتہ چل سکا، نئے نام رکھنے کی کوئی منظم کوشش نہ کی گئی۔ کسی عربی یا فارسی مترادف کے بروقت دستیاب ہو جانے کی صورت میں اسے استعمال کر لیتے تھے جب کہ ایک موزوں ہندی نام چلتا رہتا تھا۔ کسی پہلے رکھے ہوئے فارسی نام کی جگہ بعد میں ہندی نام آسکتا تھا اور ایک فارسی نام کی جگہ دوسرا فارسی نام لے سکتا تھا۔ یہ واقعات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس اتحاد کے پیچھے قانون کے نظری ماہروں کا نہیں بلکہ عملی اشخاص کا ہاتھ رہا ہے۔ یہ لوگ وہ تھے جن کا فوری مقصد مالگزاری کی وصولیابی ہوتی اور جن کے متعلق ہمیں شبہ ہے کہ وہ قاضیوں اور اسلامی قانون کے دیگر مسلمہ شارحین سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے ایسی راہ کو پسند کرتے جس میں کم از کم مزاحمت پیش آئے۔

دہلی کے ابتدائی مسلمان بادشاہوں کے رویّہ کے متعلق ہماری جو اطلاعات ہیں اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ہمیں اس معاملہ پر صدی کے نصف اوّل کے متعلق صحیح معلومات حاصل

نہ ہو سکیں لیکن بلبن کے متعلق جو پہلے نائب مملکت اور اس کے بعد تقریباً چالیس سال کی مجموعی مدت تک حقیقتاً بادشاہ رہا ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ انتظامی امور میں اپنے فیصلوں پر عمل کرتا تھا خواہ یہ اصلاحاً قانونی ہوں یا نہ ہوں۔ علاء الدین خلجی مبینہ طور پر ایسی ہی آزادی کا قائل تھا اور اس پر پابندی کے ساتھ عمل کرتا تھا۔ محمد تغلق خلیفۂ وقت کی غیر معمولی اطاعت کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون کی دانستہ اور شدید خلاف ورزی کرتا تھا۔ فیروز ایسا تنہا حکمراں تھا جو اسلامی قانون کے ماہرین سے پابندی کے ساتھ رہنمائی حاصل کرتا اور ان کے فتووں کے مطابق اپنی پالیسی مرتب کیا کرتا۔ جیسا کہ اگلے باب میں آئے گا، ہمارے پاس ایسی تحریریں نہیں ہیں جن سے یہ پتہ چلے کہ مسلم فاتحین واقعتہً کن حالات میں مالیاتی اقتدار پر قابض ہوئے لیکن واقعات مذکورہ اس نقطۂ نظر کو تقویت فراہم کرتے ہیں کہ مالیاتی معاملات باریک بین علماء کے تابع نہ تھے۔

اب قارئین کے ذہن میں غالباً یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ آیا ہندو اور مسلم نظاموں کا ہم عصر ہونا کوئی اتفاقی امر تھا یا یہ کہ تاریخی بنیادوں پر اس کی توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ میں اس سوال کا کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتا لیکن مجھے آخر الذکر صورت زیادہ امکانی معلوم ہوتی ہے۔ عشری زمین، قطعی طور پر ملکِ عرب کا ایک رواج ہے لیکن خراجی زمین کے متعلق قاعدے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی مشرقی فتوحات سے پیدا ہونے والی صورت حال سے نپٹنے کے لیے بنائے گئے تھے اور اگر ان خطوں کے اور ہندوستان کے مقامی رواج ایک دوسرے کے مشابہ ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ بہر حال، اس سوال کا حل، فارس اور عراق کی قبل اسلامی دور کی تاریخ کے طالب علم پر چھوڑ دینا چاہیئے جس کے متعلق مجھے کوئی واقفیت نہیں۔

باب 1

حوالہ جات

INDIA AT THE DEATH OF AKBAR　x

FROM AKBAR TO AURANGZEB　xx

۱؎ امکانی متبادلات 'فارمر' (FARMER) 'کلٹی ویٹر' (CULTIVATOR) 'رعیت' (RYOT) ہیں۔ فارمر کا لفظ بھی ہندوستانی ایسے ملک میں جہاں مالگزاری کا ٹھیکہ (FARMING) ایک طویل عرصہ تک زرعی نظام کا ایک نمایاں عنصر رہا ہے' غیر واضح ہے۔ کلٹی ویٹر (CULTIVATOR) کو جو ہندوستان کی ایک عام اصطلاح ہے بیشتر انگریزی بولنے والی قومیں' کاشت کا ایک جدید آلہ تصور کرتی ہیں۔ "رعیت" مسلم دور حکومت کے بعد ہندوستان کے بعض حصوں میں اپنا معنی تبدیل کر چکا ہے اور یہ اب اراضیاری کی ایک مخصوص شکل کے مصداق ہے جبکہ ملک کے دوسرے حصوں میں اس کا زیادہ مفہوم ہے' لہٰذا یہ بھی غیر واضح ہے۔

۲؎ تین مندرجہ بیانات 'SACRED BOOKS OF THE EAST' سیریز میں مطبوعہ ترجموں کی حسب ذیل جلدوں پر مبنی ہیں: منو (XXV)' وشنو (VII)' اپسں تنبہ اور گوتم (II)' وششٹھ اور بودھانیہ (XIV) نارد اور برہسپتی (XXXIII)۔

۳؎ اس عبارت کی تحریر کے بعد ڈاکٹر بالکرشن نے 'INDIAN JOURNAL OF ECONOMICS' جولائی 1927ء میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ ہندو نظام میں تشخیص خالص آمدنی پر ہوتی ہے۔ ان کے دلائل مجھے معقول نہیں معلوم ہوتے لیکن میں اس مسئلہ کی تحقیق کو اس عہد کے طالب علموں کے سپرد کرتا ہوں۔

۴؎ تحریروں میں متعدد اشخاص کے درمیان ایسے حقوق پر بحث کی گئی ہے۔ لیکن وہ ان کی صحیح نوعیت یا ان کے بادشاہ سے تعلق پر بہت ہی تھوڑی اطلاع فراہم کرتی ہیں۔ لیکن چند عبارتوں میں ایک بالادست اقتدار کے وجود کا ذکر آتا ہے خصوصاً برہسپتی (XXXIII، 353) کی ایک عبارت میں جہاں بادشاہ کے ایک شخص سے زمین کو لے کر دوسرے کو دینے کے عمل کو اسی قدر لازمی قرار دیا گیا ہے جس قدر دریا میں طوفان کی آمد کو۔ پھر ارتھ شاستر (حصہ 50) میں سستی اور نااہلی کی بنا پر کسانوں کی بے دخلی کی قطعی طور پر سفارش کی گئی ہے۔ میری دلیل یہ نہیں ہے

کہ ایسی عبارتیں تحتی ہیں بلکہ میرا کہنا صرف اس قدر ہے کہ ملکیت کی بحث کے ضمن میں ان کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔
یہاں ارتھ شاستر کے ایک شارح (صـ140) کے نقل کئے ہوئے ایک اشلوک کا بھی حوالہ دیا جا سکتا ہے، جس کا مفہوم
یہ ہے کہ زمین اور پانی نجی ملکیت کی اشیاء نہیں ہیں۔

5. منو 25 (236) میں پیداوار کا آٹھواں، چھٹا یا بارہواں حصہ آتا ہے۔ لیکن آگے چل کر (427) یہ اجازت دی
جاتی ہے اگر بادشاہ، بشرطیکہ وہ رعایا کی اپنے مقدور کے مطابق حفاظت کرتے، پریشانی کی صورت میں پیداوار کا ایک
چوتھائی بھی وصول کرلے تو اس پر کوئی الزام نہیں۔ گوتم 2 (227) میں دسواں، آٹھواں یا چھٹا حصہ اور وششٹھ 14 (8)
اور بودھاینہ 14 (199) میں چھٹا حصہ درج ہے۔ نارد 33 (221) میں ہمیں الفاظ "جو زمین کی پیداوار کا چھٹا حصہ
کہا جاتا ہے" ملتے ہیں۔ اس فقرہ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ حقیقت اور قول میں فرق رہا ہوگا۔ بالکل اسی طور پر جیسے
بعض اوقات لفظ "عشر" کا مفہوم 1/10 سے مختلف ہوتا ہے، ویسے ہی چھٹا حصہ "فی الواقعی ایک مختلف کسر رہی ہوگی۔
ارتھ شاستر کا ایک شارح (صـ108 نوٹ) واضح طور پر کہتا ہے کہ جس لفظ کا ترجمہ "چھٹا حصہ" کیا گیا ہے، اس میں
ایک چوتھائی یا ایک تہائی شامل ہے۔ اور اس تصنیف کی اس عبارت (صـ293) میں، ہنگامی حالت میں ایک تہائی
ایک چوتھائی عائد کرنے کی اجازت ہے۔ شمالی ہندوستان میں ہندو عہد کے متعلق واحد بیان جس کا مجھے علم ہو سکا
وہ قنوج میں ہرش کے متعلق ہے: بادشاہ کے کاشتکار پیداوار کا چھٹا حصہ بطور لگان ادا کرتے ہیں (T. WALTERS
ON YUAN CHANG'S TRAVELS IN INDIA, I,176) لیکن یہ ممکن ہے کہ چینی سیاح نے اس وقت کی صحیح صورتحال کو نہیں
بلکہ متن کے خیالی اعداد کے متعلق اپنے مخبر کے بیان کو نقل کیا ہو۔ جنوب کے متعلق مسٹر سی ایچ راؤ (INDIAN ANTIQUARY
اکتوبر، نومبر 1924ء) کا قول ہے کہ چھٹے حصہ کے تناسب سے عملاً کافی بڑھ جاتا تھا۔

6. میں سرداری اصطلاح اس لحاظ سے استعمال کرتا ہوں کہ اس سے کم از کم غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ زمیندار کے لفظ کا
مفہوم تاریخ کے مختلف ادوار میں تبدیل ہوا ہے اور فی الوقت اس کے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف
معنی ہیں۔ لہٰذا یہ بہتر معلوم ہوا کہ کسی عمومی بحث کے دوران اس کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔

7. تحریروں میں بعض ایسی صورتیں ملتی ہیں، جن میں کسی صوبہ کی مالگذاری کا ایک حصہ بمقدار اشیاء درج ہے، مثلاً
بنگال سے ہاتھی۔ لیکن یہ بیّن طور پر مستثنیات ہیں۔

8. آئنگر صـ184، (176) (حوالۂ سابقہ)، بیٹرس (234) 25، 'SACRED BOOKS OF THE EAST'
ارتھ شاستر کا مصنف بظاہر اس نظام پر معترض تھا (صـ299) لیکن اس کے وجود کی اسے واقفیت تھی (صـ67)۔

9. سولہویں صدی کے آغاز پر وجے نگر کی صورتحال کی وضاحت ایک پرتگیزی سیاح NUNIZ نے کی ہے۔ اس نے
اپنے مشاہدات کو مفصل لکھا ہے (SEWELL A FORGOTTEN EMPIRE 373)۔ وہ صوبہ کے نچلے علاقوں کا ذکر نہیں کرتا۔

لیکن اگلی صدی میں ہندو سرداران جو اس وقت سابقہ دیہی علاقہ پر قابض تھے اپنی مالگذاریوں کو اگر خالصۃً نہیں تو اجارہ داری سے وصول کرتے تھے اور میں یہ ممکن تصوّر کرتا ہوں کہ یہ صورت اس مملکت کے نظام کا ایک سلسلہ تھا۔ ان واقعات پر میری کتاب 'FROM AKBAR TO AURANZEB' کے باب 8 میں تفصیلی بحث آئی ہے۔

10ـہ ملاحظہ ہو کتاب ص 6، 7 اور خصوصاً ص 109۔

11ـہ اینگر 150، 175

12ـہ ابویوسف، کتاب الخراج' ملاحظہ ہو نیز انسائی کلوپیڈیا آف اسلام' میں خراج پر مقالہ۔ میرا انحصار عربی تصانیف کے ترجموں پر ہے۔

13ـہ ضمیمہ الف میں، مالگذاری زمین کی مختلف اصطلاحوں پر بحث آئے گی۔

14ـہ ملاحظہ ہو (مثلاً) ص 56۔ زمین کے پیمائش کے بعد رقبہ کی ہر اکائی پر کچھ نقدی اور کچھ جنسی مطالبہ قائم کرتے تھے۔ میں نے اسے پیمائش کا طریقہ کہا ہے اسی طور پر (ص ص 74، 76) وہ پیداوار کے ایک حصّہ کی تجویز کرتا ہے جس کا تعین یا تخمینہ کرکے مروّجہ قیمتوں کے لحاظ سے اس کی مالیت قائم ہونی چاہیئے۔ یہ شرکت داری ہے۔

15ـہ طبقاتِ ناصری۔ ہندوستان کے باہر کی اور سلطنت دہلی کے قیام کے قبل کی جاگیروں کے لئے ملاحظہ ہو ص ص 86، 87، 107، 121، 132۔ مالگذاری ادا کرنے والے غور سرداروں کے لئے، ملاحظہ ہو ص ص 40۔ 49 ہماری اطلاع ہے کہ سردار نے سبکتگین کے خلاف بغاوت کرنے کے بعد واجب خراج کی ادائیگی کو روک دیا۔

16ـہ مسٹر ایشوری پرشاد لکھتے ہیں (MEDIVAL INDIA P.46) کہ آٹھویں صدی میں عربوں نے سندھ میں تعلق شرح شروع کی تھی۔ مجھے دعائیوں میں اس انتظام کی تفصیلات نہ مل سکیں اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کتنی مدّت تک قائم رہی۔ میرا خیال ہے کہ اسے محض ایک منفرد واقعہ تصوّر کرنا چاہیئے۔

17ـہ ترجمہ از ایس۔ کے۔ سرکار' الہ آباد' 1914ء ص 148۔

18ـہ طبقاتِ ناصری: رائے کا لفظ اس قدر شروع میں یعنی ص 8 پر اور اکثر اس کے بعد ملتا ہے اور یہی صورت 'رانا' کی ہے۔

19ـہ برنی، خوط کا لفظ بہت سی عبارتوں میں حوالہ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ زمیندار' سلطنت کے باہر کے سرداروں کے لئے ص 326 پر ملتا ہے اور ص 539 پر یہ بار اوّل بادشاہ دہلی کے ماتحت سرداروں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ 'خوط' پر ضمیمہ ج میں بحث آئی ہے۔

عفیف: پہلا استعمال' ص 90 پر ہے۔

20ـہ چودھری اور پٹواری' برنی 288 میں ملتے ہیں۔ لفظ مقدم' کا اختصاص بظاہر تبدیجاً عمل میں آیا۔ برنی کی بعض عبارتوں میں اس کا مفہوم قطعاً موضع کے مکھیئے کا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعض عبارتوں میں یہ اپنے 'سربرآوردہ اشخاص' کے

عمومی مفہوم کو برقرار رکھتا ہے۔ یہ قطعی طور پر سولہویں صدی میں ایک مخصوص مفہوم میں استعمال ہونے لگا تھا۔ قانون گو کے بارے میں پہلا حوالہ مجھے تاریخ شیر شاہ [ایلیٹ (4) 414] میں ملتا ہے۔ لیکن وہ وہاں ایک پہلے سے قائم کئے ہوئے عہدہ کے طور پر نظر آتا ہے۔

سنہ 21 بلبن کے رویّہ کے لئے، ملاحظہ ہو 47 ، علاء الدین کے لئے ایضاً ص 290 و مابعد، محمد تغلق کے لئے، ایضاً 461، 492 فیروز کے لئے، عفیف 99، 129 و جابجا۔

باب 2

تیرہویں اور چودہویں صدیاں

I - دہلی کی مسلم بادشاہت

دہلی کی مسلم بادشاہت کا زمانہ 1206ء سے جب غزنین کے بادشاہ کا مامور کیا ہوا صوبیدار، قطب الدین سلطان کا لقب اختیار کرکے تخت نشین ہوا، شروع ہوتا ہے۔ اس وقت، بہرحال ہندوستان میں[1] مسلم حکومت کا کچھ نہ کچھ تجربہ ہوچکا تھا: سندھ میں عربوں کی حکومت کے علاوہ ہندوستان میں ایک صدی زائد سے افغان بادشاہوں نے اپنے صوبیدار مقرر کر رکھے تھے اور چونکہ مالگزاری کی وصولیابی، انتظامیہ کا ایک لازمی جز تھا، لہٰذا ہمیں یہ تصور کرنا چاہئے کہ اس عہد میں ہندو اور اسلامی زرعی نظاموں کے درمیان ایک رابطہ قائم ہوگیا تھا۔ اس رابطہ کی تفصیلات کے متعلق مجھے کوئی تحریری اندراجات نہیں ملے۔ ایسی صورت میں وصولیٔ مالگزاری کے انتظامات کی نوعیت کے سلسلہ میں محض ایک قیاس ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات مسلم صوبیدار[2] کی حالت تشویشناک صورت اختیار کرلیتی اور ان کی ماتحت فوج ان علاقوں کی موثر تسخیر کے لیے جوان کی برائے نام سپردگی میں ہوتے مشکل ہی سے کافی ثابت ہوا کرتی۔ حالات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مسلم حکومت کا مرکز اقتدار یقیناً، ملتان، لاہور اور (بعدہٗ) دہلی میں تھا اور اس کا حلقۂ اثر ہر قلعہ کے گردوپیش رہا کرتا جس کا پھیلاؤ صوبیدار کی ذاتی شخصیت اور وقت کے دیگر حالات کے ساتھ تبدیل ہوا کرتا تھا۔ اگلی صدی کے پہلے کے واقعات کے مطالعہ سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس وقت کی صورت حال میں ہندو سرداران غالب عنصر کا درجہ رکھتے تھے اور کسی بھی صوبیدار کی کامیابی کا انحصار اس امر پر ہوتا تھا کہ اس نے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات قائم کئے ہیں۔ یہ تعلقات کچھ تو اس کے ذاتی اوصاف پر اور

کچھ اس کے ماتحت فوج پر منحصر ہوا کرتے تھے۔ لیکن تحریری معلومات کی غیر موجودگی میں قیاسات کو اس سے آگے بڑھانا فضول ہوگا۔

ہندوستان کی تاریخ میں تیرہویں اور چودہویں صدیاں ایک بخوبی واضح عہد کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس مدت کے دوران دہلی کے بادشاہوں نے تقریباً مسلسل، سندھ ندی سے بہار تک اور ہمالیہ سے لے کر نربدا ایک حکمرانی کی جس میں مزید جنوب و مشرق کے سمت عارضی اضافے ہوئے۔ لیکن چودھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے، یہ بڑی بادشاہت منتشر ہونا شروع ہو گئی اور جلد ہی متعدد خود مختار ریاستیں ان کی جگہ لینے والی تھیں۔ اس دور کے لیے براہِ راست خاص ماخذ تین ہیں۔ منہاج السراج نے جو تیرہویں صدی کے وسط میں دہلی کا قاضی القضا تو تھا، حضرت آدم کے وقت سے اپنے زمانہ تک کی ایک مبسوط تاریخ تحریر کی۔ تقریباً ایک سو برس بعد ایک پنشن یافتہ عہدہ دار ضیاء برنی نے اس تاریخ کو منہاج السراج کے چھوڑے ہوئے مقام سے شروع کر کے فیروز شاہ کے ابتدائی برسوں تک پہنچایا۔ پھر ایک دوسرے عہدہ دار شمس عفیف نے ۱۱۷۵۵ء کے بعد جلد ہی شروع کر کے ضیاء برنی کے ناتمام کام کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ جہاں تک زرعی نظام کا تعلق ہے، جو کچھ بھی بعد کے وقائعوں میں پایا جاتا ہے وہ تقریباً سب ہی ان میں سے کسی نہ کسی مصنف سے ماخوذ ہے اور حالانکہ میں نے بدایونی فرشتہ اور دوسرے مصنفین کی ملخص تحریروں کے حوالے دئے ہیں، لیکن میں انھیں ماخذ کے طور پر پیش کرنا ضروری خیال نہیں کرتا۔ تین ہمعصر وقائع نویسوں میں پہلا زرعی موضوعات سے بظاہر بہت ہی تھوڑی دلچسپی رکھتا تھا، لیکن دوسرے و تیسرے جو وزارتِ مال سے ذاتی تعلق رکھتے تھے، متعلقہ اطلاعیں زیادہ مقدار میں فراہم کرتے ہیں۔ یہ اطلاعیں، اس عہد کی سرکاری بول چال میں جو جلد متروک ہونے والی تھی درج ہیں۔ لہذا بعض موقعوں پر ان کی تعبیر دشوار ہو جاتی ہے، لیکن یہ بلاشک مستند ہیں اور جہاں تک میں سمجھ سکا، یہ بجا طرفداری و مخالفت یا خوشامد کی دو خصوصیات سے جو گاہے گاہے، ملکی یا سلسلۂ سلاطین کی سرگذشتوں میں دکھائی پڑتی ہیں۔ پاک و صاف ہیں۔

ہمارے موجودہ مقصد کے لیے اس بڑی بادشاہت کے نظم و نسق کا تھوڑا سا بیان ضروری ہوگا۔ ہم شروع ہی سے اسے متعدد خطوں میں بٹا ہوا پاتے ہیں جنھیں ہم صوبوں کے نام سے پکاریں گے اور جن کے ذمہ دار صوبیدار ہوا کرتے تھے۔[۱] "صوبہ" سے میرا مفہوم، بادشاہت

کی ایک بنیادی تقسیم اور "صوبیدار" سے میری مراد وہ عہدہ دار ہے جو براہِ راست بادشاہ یا دربار کے وزیروں سے احکام حاصل کیا کرتا تھا۔ ان صوبوں کی تعداد، بادشاہت کی وسعت اور غالباً اس کی افزونی کے اعتبار سے تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ لیکن وقائعوں میں ان میں سے بیشتر کا اس قدر پابندی کے ساتھ ذکر آتا ہے کہ ہم انھیں مستقل تصور کر سکتے ہیں، گو بعض اوقات ان میں سے دو یا زائد ایک ہی صوبیدار کی ماتحتی میں رہ سکتے تھے۔ عام صوبوں کے علاوہ دو خاص خطوں کا علحدہ سے بیان ضروری ہوگا۔

۱۔ علاقۂ دہلی (حوالیٔ دہلی): یہ خطہ پورب میں دریائے جمنا سے اور اوتر میں سوالک پہاڑیوں بلکہ ان کے دامن کے جنگلات سے محدود تھا۔ دکھن میں یہ میوات کے ساتھ ساتھ چلا جاتا تھا اور یہ حدود بدلتے رہتے تھے کیونکہ کبھی تو سرکش میواتی خود دہلی کے لیے خطرہ بن جایا کرتے اور کبھی راجپوتانہ کی پہاڑیوں میں محصور کر دئے جاتے، لیکن حقیقتاً وہ کبھی بھی محکوم نہ بنائے جا سکے۔ پچھم میں، یہ سرہند، سمانہ اور ہانسی (جو بعد میں حصار کے نام سے موسوم ہوا) صوبوں سے محدود تھا۔ اس خطہ کا نظم ونسق، اس اعتبار سے ایک مخصوص نوعیت کا تھا کہ یہاں کوئی صوبیدار نہ تھا، بلکہ یہ براہِ راست وزارتِ مال کے ماتحت تھا۔

۲۔ دریائی علاقہ: وقائعوں میں اس خطہ کو " دو دریاؤں کے درمیان" واقع بتایا گیا ہے اور مترجمین نے اسے معمولاً " دوآب" لکھا ہے۔ لیکن یہ ترجمہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے، کیونکہ موجودہ رواج کے مطابق، دوآب، الٰہ آباد تک پھیلا ہوا ہے، جب کہ وقائع نویسوں کا حوالہ دیا ہوا خطہ بہت چھوٹا تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے درمیان واقع تھا اور شمال میں اس کا سلسلہ ترائی کے جنگلوں تک تھا، لیکن دکھن میں یہ علیگڑھ سے بہت زیادہ آگے نہ بڑھتا تھا۔ تیرھویں صدی میں، یہ علاقہ تین صوبوں میرٹھ، برن (بلند شہر) اور کول (حال علیگڑھ) پر تقسیم تھا۔ لیکن علاءالدین نے اسے دہلی کے علاقہ کی طرح براہِ راست وزارتِ مال کے تحت کر دیا تھا۔ ہم ایک اگلے باب میں دیکھیں گے کہ محمد تغلق کے تحت یہ علاقہ کیوں کر ویران ہوا۔

یہی دو خطے بادشاہت کے قلب کے درجہ میں تھے۔ جو صوبے ان حدود کے باہر درج کیے جا سکتے ہیں اسطور پر ہیں۔ دریائی علاقہ کے نیچے کی طرف قنوج اور پھر اس کے نیچے کڑا (کڑہ) تھا۔ یہ دونوں مل کر اس علاقہ کو پورا کرتے ہیں جو اب دوآب کہلاتا ہے لیکن

بظاہر، قنوج کے صوبہ کا کچھ علاقہ گنگا کے اس پار بھی تھا، جب کہ کڑہ دونوں دریاؤں کے دوسری طرف تک پھیلا ہوا تھا۔ گنگا کے آگے شمال میں ہمیں امروہہ و سنبھل ملتے ہیں[1] اور ان کے آگے بدایوں۔ اس سے قبل کے زمانہ میں بدایوں کے بعد بہ سمت مشرق اودھ راجودھیا یا فیض آباد) درج ہے۔ لیکن اس کے بعد کے زمانہ میں ان دونوں کے درمیان سندیلہ کی اطلاع ملتی ہے اور اودھ کے آگے، جنوب، مشرق میں ظفرآباد تھا جو فیروز شاہ کی تعمیر کے بعد جون پور کے نام سے مشہور ہوا۔ گھاگرہ کے شمال میں بہرائچ تھا۔ اس کے بعد اودھ کا ایک حصہ بشمول گورکھپور اور پھر ترہت یا اوتری بہار تھا۔ ترہت کے آگے لکھنوتی یا پچھمی بنگال تھا جو کبھی کبھی ایک صوبہ، مگر معمولاً حالات کے اعتبار سے ایک ماتحت یا خودمختار بادشاہت رہا کرتا۔

گنگا کو پار کرکے پچھم کی طرف لوٹتے ہوئے، وہ صوبہ تھا جسے ان دنوں بہار کہتے تھے اور یہ ترہت سے الگ تھا۔ اس بہار کے پچھم کا علاقہ حقیقتاً مملکت میں شامل نہ تھا اور اس کے بعد ہمیں جو دوسرا صوبہ ملتا ہے وہ مہوبہ ہے اور اس کے بعد بیانہ جو ان دنوں جب اس جگہ پر دہلی سلطنت کا قبضہ ہو گوالیار کے ساتھ ملا دیا جاتا تھا۔ بیانہ دہلی کے جنوب میں واقع بلا انتظام کے علاقہ میوات جس کا پہلے حوالہ آچکا ہے کہ ساتھ ساتھ چلا گیا تھا۔ دہلی کے پچھم میں صوبجات سرہند، سمانہ اور ہانسی (حصار) اور ان کے پرے لاہور، دیپال پور اور ملتان تھے۔ آخرالذکر تین سرحدی صوبے تھے۔ تقریباً پورے عہد کے دوران، منگول لوگ دریائے سندھ پر یا اس کے قرب وجوار میں قابض تھے اور ان کی موجودگی سے جو خطرہ لاحق رہا کرتا وہ بادشاہت کی سیاسیات پر اثرانداز ہوا کرتا تھا۔

جنوب میں گجرات ایک تسلیم شدہ صوبہ تھا اور مالوہ میں بھی کچھ صوبے تھے، لیکن تعجب ہے کہ وقائعوں میں اس خطّہ کا بہت ہی کم بیان ملتا ہے اور میں ان کی تعداد کے متعلق غیر متعین ہوں۔ راجپوتانہ کے بارے میں بھی اطلاعات بہت ہی مختصر ہیں۔ کبھی کبھی، بحیثیت ایک صوبہ کے چتوڑ کا حوالہ آتا ہے، لیکن اس خطّہ پر حکومت کے کسی موثر قبضہ کے بہت ہی تھوڑے آثار ملتے ہیں۔ اس شمار کے ساتھ ہم نیچے کی طرف دریائے نربدا کی سیدھ میں پہونچ جاتے ہیں۔ علاءالدین نے مسلم حکومت کو اس دریا کے دوسرے سمت تک پہنچایا اور تھوڑے دنوں تک دیوگیر یا دولت آباد میں ایک وسیع اور اہم صوبہ کے قیام کے علاوہ، دوسرے اور صوبے بھی جنوب۔ مشرق کے ساحل تک پھیلے ہوئے رہے۔ لیکن اس توسیع کو زیادہ عرصہ

تک برقرار نہ رکھا گیا۔ اسطور پر کل ۲۰ سے ۲۲ دو صوبے تک تھے اور یہ تعداد وقت وقت۔ پر بادشاہت کے بڑھنے یا گھٹنے کے ساتھ ساتھ کم وبیش ہوتی رہتی تھی۔ ہم ضیاء برنی (۲۵۵۶) کے بلبن کی مملکت کے ذرائع آمدنی کی تحریر کے سلسلہ میں استعمال کئے ہوئے فقرے "بیس صوبے" کو کم وبیش ایک ٹھیک ٹھیک بیان تصور کر سکتے ہیں۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ پوری بادشاہت صوبوں میں بٹی ہوئی تھی اور مواضعات کو ملا کر پرگنے بنائے گئے تھے۔ اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا بعد کے زمانہ کے مماثل کوئی درمیانی انتظامی اکائیاں تھیں یا نہیں۔ میں اس سوال کے کسی قطعی جواب کے لیے ضروری مواد فراہم کرنے میں ناکامیاب رہا۔ چند عبارتوں میں ہمیں کچھ "تقسیمیں" "شق"، کچھ ایسے پیرایہ بیان میں ملتی ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حقیقتاً ضلع تھے۔ لیکن یہ عبارتیں فیصلہ کن نہیں ہیں اور ان میں اس شبہہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ یہ تقسیمیں اگر ان کا وجود تھا تو معمولاً پائی جاتی تھیں یا صرف استثنائی صورت میں، یا یہ کہ محض کوئی مترادف لفظ تو نہیں ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ چودھویں صدی کے دوران شق کے لفظ کا استعمال ان اصطلاحوں کے مترادف کے طور پر جن کا میں نے ترجمہ "صوبہ" کیا ہے ہونے لگا تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہمیں اپنے موضوع سے بہت دور ہٹا دے گی اور چونکہ یہ مسئلہ حقیقتاً اہم نہیں ہے، لہٰذا میں اسے ایک اختلافی مسئلہ کے طور پر چھوڑے دیتا ہوں۔

اس زمانہ کے صوبہ کی کوئی صحیح تعریف نہیں ملتی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کسی ایسے علاقہ کی تصویر کشی جس کے حدود قطعی طور پر واضح ہوں اور جس کے تمامی حصول پر یکساں انتظامی گرفت ہو، غلط ہوگی۔ صوبہ کے صدر مقام پر، صوبیدار اپنی زیر کفایت فوج کے ساتھ رہا کرتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے کمتر اقتدار کے مراکز رہے ہوں، حالانکہ ان کا پایا جانا غیر یقینی ہے بعض مواضعات میں صوبیدار کے عہدہ داران، کسانوں سے براہ راست معاملہ کیا کرتے، بعض میں مقیم معافیداران یا جاگیرداران رہا کرتے اور بعض میں سرداران تھے جن سے صوبیدار مالگذاری کی توقع رکھا کرتا اور میرا خیال ہے کہ اکثریت انھیں کی تھی۔ اگر یہ سرداران سرکشی کرتے یعنی مالگزاری ادا نہ کرتے تو ان سے فوجی طاقت کے ذریعہ نپٹنا ہوتا اور اگر اس قسم کی سرکشی دور دور تک پھیلی ہوئی یا سنگین ہوتی تو اصلاح حال کے لیے بادشاہ خود اپنی سربراہی میں تعزیری مہم لے جاتا یا روانہ کرتا تھا۔ یہ نتیجہ نکالنا قرین عقل ہوگا کہ مسافت اور آمد و رفت

کے حالات، بغاوت پر بیشتر اثر انداز ہوتے تھے اور یہ شورشیں صوبہ جاتی مرکز کے قریب نسبتاً شاذ اور سرحدوں کے قریب نسبتاً عام تھیں اور یہ کہ بعض علاقے ایسے بھی ہو سکتے تھے جہاں کے سردار اس سبب سے کہ صوبے دار انھیں مطیع بنانے کا مقدور نہ رکھتا تھا عملاً خود مختار تھے۔ کسی حال میں بھی، کسی سردار اور اس کے کسانوں کے تعلقات، مسلم حکومت کے قیام کے باعث متاثر نہ ہوا کرتے، بجز اس کے کہ اب انھیں مالگذاری کی ادائیگی کے لیے زیادہ رقم وصول کرنی ہوتی تھی۔ مواضعات کے اندر پہلے سے قائم زرعی نظام برقرار رہا کرتا تھا

2 - تیرہویں صدی

مملکت کے زرعی نظام میں علاء الدین کی تقریباً 1300ء میں لائی ہوئی تبدیلیوں کے قبل کسی دوسری بڑی تبدیلی کا اندراج نہیں ملتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تیرہویں صدی کے متعلق وقائع نگاروں کی خاموشی سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک صدی کے نصف اوّل کا تعلق ہے، میں خاموشی کو کسی اہمیت کا حامل نہیں تصور کرتا۔ اس عہد کا وقائع نولیس، منہاج السراج ایک مفتی اور زیادہ سے زیادہ مدتوں تک مملکت کا قاضی القضاۃ رہ چکا تھا۔ اس کے وقائع میں معاشی یا سماجی معاملات سے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ بہت ممکن ہے کہ اس نے زرعی نظام کی اہم تبدیلیوں سے تجاہل برتا ہو۔ اس کے زمانہ میں اس نظام کے قانونی جواز پر تبادلۂ خیال ہونے کی صورت میں اسے ان کا ضرور علم ہوتا کیونکہ اس میں اس کی شرکت ضروری تھی۔ لیکن وہ قاضی کے علاوہ، ایک درباری بھی تھا اور یہ آسانی سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی رائے کے خلاف فیصلوں پر سکوت اختیار کیا ہوگا۔

ضیاء برنی کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کیونکہ وہ انتظامی عہدہ داروں کے زمرہ سے تھا اور جیسا کہ اس کی ذاتی سرگذشت سے واضح ہے، وہ زرعی معاملات سے دلچسپی رکھتا تھا۔ میرے خیال میں یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بلبن جو صدی کے نصف آخر میں واحد ایسا بادشاہ تھا جو اس قسم کی کوئی چیز کر سکتا تھا کی لائی ہوئی کسی بھی اہم تبدیلی کو سنا اور باضابطہ درج کیا ہوگا۔ لہٰذا ہمیں اس کے سکوت پر یہ قیاس ہوتا ہے کہ اس کے لیے قابلِ تحریر کوئی بات نہ تھی۔ بہرحال، حقیقت جو بھی رہی ہو، اس صدی کے متعلق دستیاب مواد

صرف ضمنی اقوال اور ایک یا دو حکایات پر مشتمل ہے۔ ہم کسانوں کو اپنی ادا کی ہوئی آمدنی سے مملکت کو سہارا پہنچاتے ہوئے اور باغی یا باقتدار سرداروں کو سزا پاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ لیکن ہمیں تشخیص و وصولی مالگزاری کے طریقوں کی کوئی اطلاع نہیں ملتی اور نہ ہی ہمیں کسانوں کی زندگی یا اپنے سرداروں کے ساتھ ان کے تعلقات کی کوئی تفصیل مل سکی۔ یہ امر واضح رہے کہ بادشاہ آزادی کے ساتھ معافیاں دیتے تھے اور جاگیر کے عطیات بھی عام تھے معافیوں کی تفصیلات ہمارے لیے کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں لیکن نظامِ جاگیرداری کا تھوڑا سا بیان جس کا ان دنوں دائرہ بعض اعتبار سے، بعد کے بعض زمانوں سے زیادہ وسیع تھا، ضروری ہے۔

عملی اعتبار سے ہمیں چھوٹی اور بڑی جاگیروں میں تفریق کرنی چاہیئے۔ یہ دونوں قسم کی جاگیریں اقطاع کہی جاتی تھیں اور ان کے ساتھ فوجی خدمات کی ذمہ داری وابستہ رہا کرتی۔ چھوٹی جاگیروں سے میرا مفہوم ان جاگیروں کا ہے جو منفرد فوجیوں کو اس شرط پر دی جائیں کہ انھیں کام یا معائنہ کے لیے طلب کیے جانے پر اپنے گھوڑوں اور اسلحوں سمیت حاضر ہونا پڑے گا۔ ان کی حیثیت کو اس واقعہ سے جو "شمسی اقطاع داران" کے متعلق بیان کیا جاتا ہے (برنی ۵۵-۶۱)، واضح کیا جا سکتا ہے۔ بادشاہ بلبن کے ابتدائی عہد میں اُسے ان جاگیروں کے متعلق اطلاع پہنچائی گئی جو شمس الدین کے عہد میں تقریباً ۲۰۰۰ فوجیوں کو عطا کی گئی تھیں۔ ان لوگوں میں سے بیشتر بوڑھے یا ناکارہ ہو گئے تھے اور باقیماندہ نے وزارتِ فوج کے اہل کاروں سے مل کر اپنے کو ملازمت کی ذمہ داری سے محفوظ کر لیا تھا، لڑکوں کو خاموشی کے ساتھ باپ کی جانشینی حاصل ہو گئی تھی اور ان کے قابضین اپنے مواضعات میں مالکوں کی طرح رہا کرتے اور اب یہ دعویٰ بھی کیا جانے لگا تھا کہ ان کے مواضعات جاگیریں نہیں بلکہ معافیاں ہیں۔ بادشاہ نے ان اطلاعات پر حکم صادر فرما کر ملازمت سے ناکارہ لوگوں کی جاگیروں کو واپس لے لیا اور انھیں مختصر نقدی پنشن دے دی اور جو لوگ خدمات کی انجام دہی کے اہل اور اس پر آمادہ تھے ان کی جاگیروں کو بحال رہنے دیا گیا۔ لیکن بعد میں مراحم خسروانہ کے لیے ایک مرصع درخواست پر یہ احکام منسوخ کر دئے گئے اور ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ ان مخصوص صورتوں میں جاگیروں کو غیر مشروط معافیوں کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔

یہ واقعہ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ یہ نواح دہلی کے زرعی حالات کو واضح کرتا ہے۔ ایک منفرد فوجی خاموشی کے ساتھ کسی موضع میں آباد ہو کر اس کے محاصل سے مستفید ہو سکتا تھا اور چونکہ یہ افراد ان اراضیات پر قبضہ کو اپنے لیے اچھا خاصہ نفع بخش تصوّر کرتے تھے، لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ کسان اس انتظام کو بغیر زیادہ دشواری کے قبول کر لیتے تھے۔ ایسی صورت میں گاؤں کی زندگی بلا شبہ پہلے کی طرح چلتی رہتی تھی۔ نئی بات صرف اس قدر ہوتی کہ اب مالگزاری کا ایک نیا وصول کرنے والا یہاں آکر مقیم ہو گیا تھا جسے بادشاہ کی سند حاصل رہتی، لیکن خود اس کے قبضہ میں کوئی زیادہ فوجی طاقت نہ رہا کرتی۔ ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ بعض صورتوں میں کسی منفرد جاگیردار کے روّیہ کے باعث چپقلش پیدا ہو جاتی رہی ہوگی لیکن جاگیروں کی مدّت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی اور اس کے بعد بھی، کسان ان انتظامات کو جو بغیر اس کی رضامندی کے کر دئے جاتے چپ چاپ مان کر ہر اس شخص کو جو شاہی سند کے ساتھ مالگزاری طلب کرتا، اسے ادا کرتے رہتے تھے۔

بڑی یعنی باحیثیت اشخاص کے زیرِ تصرف جاگیروں کے متعلق اس قسم کی کوئی تفصیل نہیں ملتی ان کی موجودگی کا ضرور پتہ چلتا ہے اور بس۔ لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم کہ آیا یہ جاگیرداران بحیثیت افسروں کے محض اپنی ذاتی خدمات کے لیے پابند رہا کرتے جیسا کہ چودھویں صدی میں صورتِ حال تھی یا اس پابندی میں ایک فوجی دستہ کا تیار رکھنا بھی شامل تھا جیسا کہ ان دنوں دیگر مسلم ممالک اور نیز ہندوستان میں مغلیہ عہد کے دوران قاعدہ تھا۔ صورتِ حال کے ایک عمومی جائزہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نواح دہلی میں جاگیروں کے عطیات اچھے خاصے عام تھے، لیکن اس خطّہ میں محفوظ (خالصہ) یعنی شاہی منفعت کے لیے وزارتِ مال کے براہ راست زیرِ انتظام زمینیں بھی تھیں۔ اسطور پر بادشاہ کو دو خاص ذرائع یعنی محفوظ زمینوں اور صوبوں سے بھیجی ہوئی آمدنی کی بچت سے محاصل ملا کرتے تھے۔

اس مبہم خاکہ میں تھوڑا اضافہ علاء الدین کی اصلاحات سے متعلق اطلاعات کا اس سے قبل کے نظام پر اطلاق کر کے، کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ تیرھویں صدی کے خاتمہ پر ہندو سرداروں کی تعداد اور ان کی اہمیت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ملک کے سیاسی نظام پر غالب تھے جس کے نتیجہ میں وہ زرعی نقطۂ نگاہ سے بھی بڑی اہمیت کے ضرور مالک رہے ہوں گے۔ ان کی مملکت کے تئیں خدمات کے معاوضہ کے طور پر ان کے لیے زمین کا تھوڑا حصہ

بغیر مالگزاری تشخیص کئے چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس مد کے آمدنی کو جسے ان کا "حق" یا "دستوری" کہتے تھے ان کی کفالت کے لیے کافی تصوّر کیا جاتا تھا۔ لیکن ان کے متعلق یہ شبہہ تھا کہ وہ حکومت کو ادا کی جانے والی رقم سے زاید کسانوں سے وصول کرتے ہیں اور اس شبہہ کا کم از کم امکان ضرور پایا جاتا ہے۔ اسطور پر جائزوں میں ایک سے زاید بار استعمال ہونے والے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ "طاقتور کا بار کمزور پر پڑتا تھا"! پس واضح طور پر، جہاں کہیں بھی کوئی تسلیم شدہ سردار ہوتا، وہاں تشخیص اور کسانوں سے وصولی کا انتظام اس کے ہاتھ میں رہا کرتا۔

پھر تیرھویں صدی میں واقعات کی روش فی الجملہ سرداروں کے اختیارات میں اضافہ کے لیے سازگار نہ تھی اور ان دنوں گاہے گاہے کمزوری کے ایّام کے باوجود، بادشاہ کی طاقت میں بےحد اضافہ اور افزونی ہوئی اور یہ ممکن ہے کہ سرداران فی الجملہ صدی کے اختتام پر جس قدر طاقتور تھے اسی قدر اس کے وسط میں اور بمقابلہ وسط کے شروع کی مدّت میں زیادہ طاقتور رہے ہوں۔ پس ہوسکتا ہے کہ زرعی تبدیلیوں کے متعلق وقائع نویسیوں کے سکوت کا سبب یہ رہا ہو کہ کوئی بات قابلِ تحریر پیش ہی نہیں آئی اور یہ کہ پوری صدی کے دوران قدیم زرعی نظام ہی مقررہ سرداروں کے تحت چلتا رہا اور ان کے طریقوں کی ایسے علاقوں میں جہاں مسلمانوں کے کسانوں سے براہِ راست رشتے قائم تھے، پیروی ہوتی رہی۔ غالبًا صوبیدار اور سردار کے باہمی رشتے بیشتر گفت و شنید سے طے ہوا کرتے، جب کہ سردار اور کسانوں کا باہمی رشتہ وزارتِ مال کے حدود سے باہر کا معاملہ تھا جو ایسے علاقوں کے انتظام کے متعلق جو نہ سرداروں کے قبضہ میں تھے اور نہ منفرد اشخاص کو جاگیر میں دئے گئے تھے، اپنے تجربہ کو دھیرے دھیرے بڑھا رہی تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خیال کی تائید کافی تعداد میں تحریری واقعات سے ہوتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں چند واقعات جو تحریروں میں محفوظ ہیں ان کی سب سے زیادہ امکانی تعبیر یہی ہو سکتی ہے۔

مسلم عہدہ داروں کے زیرِ انتظام علاقوں کے متعلق، واحد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ چودھری کی حیثیت تسلیم کی جاتی تھی۔ ضمیمہ ج میں مندرجہ عبارتیں مظہر ہیں کہ بالائی رقوم کے معاملہ میں چودھری اور سردار ایک سطح پر تھے اور ہم بلا تردد یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں بالائی آمدنیاں بادشاہ کی خدمت کے طور پر تھیں یا بالفاظ دیگر وہ مواضعات جو سرداروں کے تحت نہ تھے وہ اپنے اپنے چودھریوں کے زیرِ انتظام تھے۔ چودھری کے

صدودِ اختیار تحریروں میں نہیں ملتے اور اس سلسلہ میں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ مسلم انتظامیہ اس کی حیثیت کو تسلیم کرتا تھا۔

اس صدی کو خیرباد کہنے کے قبل یہ دریافت کرنا مناسب ہوگا کہ بادشاہ کا اپنے زیرِ حکومت کسانوں کے تئیں کیا روّیہ تھا۔ اس سوال کا جواب محض بلبن کے متعلق دیا جا سکتا ہے جس کا اقتدار اس صدی کی تقریباً نصف مدت تک قائم رہا۔ اپنے لڑکے کو جسے اس نے بنگال کے تخت پر بٹھایا نصیحت کرتے وقت اس کی تاکید تھی کہ (برنی ۱۰۰) سابقہ رواج کی موجودگی میں بھی، کسانوں سے زیادہ مطالبات نہ وصول کیے جائیں اور سخت مگر منصفانہ انتظامِ حکومت کیا جائے۔ تشخیص کے سلسلہ میں اس نے درمیانی راستہ اختیار کرنے کی نصیحت کی۔ اس کا قول تھا کہ زاید تشخیص سے ملک مفلس ہو جائے گا لیکن کم تشخیص کسان کو سست اور نافرمان بنائے گی۔ یہ لازم تھا کہ آرام سے گذر بسر کرنے کے بعد اس کے پاس باقی بچے، لیکن اس سے بہت زاید اس کے پاس نہ رہنا چاہیئے۔ پس یہ کہنا درست ہوگا کہ بلبن نے ہندوستان کی ایک کسانی ریاست کی دیہی معیشت کے اہم اصولوں کو ایسے دور میں جب کہ انفرادی ترقی کے لیے بہت ہی تھوڑے مواقع حاصل تھے بخوبی سمجھ لیا تھا اس کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ کسان امن اطمینان کی حالت میں وافر پیداوار اُگائیں اور معقول مالگزاری ادا کریں اور اس نے یہ محسوس کیا کہ یہ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ اس مقصد کے پیشِ نظر نظامِ حکومت کو چلائے۔

۳۔ علاءالدین خلجی (1296-1316ء)

1296ء میں علاءالدین نے اپنے چچا یعنی بادشاہِ وقت کے قتل کے بعد دہلی کا تخت حاصل کیا اور اس نے دکن کے حملوں کے دوران حاصل کی ہوئی دولت کی فیاضانہ تقسیم سے اپنی حیثیت کو مستحکم کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالکل شروع میں اس کا یہ خیال تھا کہ اس طور پر حاصل کی ہوئی بادشاہت خود بہ خود قائم رہے گی لیکن عہدِ حکومت کے ابتدائی مہینوں میں بغاوتوں کے ایک سلسلہ نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ انتظامِ حکومت کو سخت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک ایسے طاقتور آمرانہ حکمراں کی حیثیت اختیار کی جس کا واحد مقصد اپنے تخت کا استحکام اور مملکت کی توسیع ہو۔ زرعی نظام میں اس نے جو تبدیلیاں کیں، ان کا سبب معاشی یا انسانی ہمدردی کے محرکات نہیں بلکہ وہ سیاسی

اور فوجی ضروریات کے تحت تھیں ۔ شخصی طور پر وہ غیر ہر دلعزیز تھا ۔ ابتدا میں امرا یا عہدہ داروں کی کوئی ایسی جماعت نہ تھی جس پر وہ اعتماد کر سکے اور نہ ہی وہ کٹر مسلمانوں کی اطاعت پر بھروسہ کر سکتا تھا ۔ اس کی رعایا بغاوت پر آمادہ تھی اور سندھ پر منگولوں کا اجتماع ، سرحد کے لیے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا تھا ۔ لہٰذا داخلی اور نیز خارجی استحکام کی ضرورت اس کی پالیسی کا غالب عنصر تھی ۔ چنانچہ مملکت کی توسیع اس وقت تک کے لیے عمداً ملتوی کر دی گئی جب تک کہ اسے داخلی خطرات کی طرف سے اطمینان نہ ہو جائے ۔

اس کے لیے داخلی استحکام پہلا قابلِ لحاظ مسئلہ تھا اور ۱۳۰۰ء میں یا اس کے لگ بھگ ، بادشاہ نے اپنے عہدہ داروں کو زیادہ قابو میں لانے کے اقدامات کیے ۔ اس مقصد کے تحت اس کے جاری کیے ہوئے احکام کثیر التعداد اور کثیر النوع تھے لیکن اس کا وہ واحد حکم جس کا ہم سے واسطہ ہے ، تقریباً تمام موجود معافیوں کی ضبطی سے تعلق رکھتا ہے یہ وہ معافیاں تھیں جن کی اس نے اپنی تخت نشینی پر توثیق کی تھی[۱۱] . بظاہر تخیل یہ تھا کہ باحیثیت افراد کے لیے بجز بادشاہ کی مسلسل مہربانیوں کے ، آمدنی کا کوئی اور وسیلہ نہ رہے ۔ یہ حکم اس لحاظ سے اہم ہے کہ معافیوں پر قبضہ ، فی الواقعی ، بادشاہ کی مرضی پر منحصر رہتا تھا اور یہ کسی وقت بھی واپس لی جا سکتی تھیں ۔ لیکن معافیوں کا علاقہ ، مملکت کے رقبہ کی نسبت سے زیادہ نہ تھا اور تقریباً اسی زمانہ میں ہندو سرداروں اور اور دیہی سربراہوں کی اطاعت برقرار رکھنے کے لیے جو اقدام کیے گئے وہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں[۱۲] ۔

علاء الدین اور اس کے مشیروں کا یہ خیال تھا کہ سردار اور دیہی سربراہ اس وقت تک بغاوت کرتے رہیں گے جب تک کہ ان کے پاس بغاوت کے لیے مطلوبہ وسائل موجود رہیں اور واقعی جو صورتِ حال تھی وہ اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ خیال غالباً درست تھا ۔ سرداران خود مختاری کی ایک طویل روایت کے مالک تھے جس کی برقراری کلیتہً تلوار کی طاقت پر منحصر تھی ۔ ان کے لیے اس کا کوئی خاص سبب نہ تھا کہ وہ ایسے غیر ملکی حکمرانوں کی اطاعت میں رہیں ۔ جو ملک کو طاقت کے زور سے فتح کرنے کے بعد اس سے کثیر محاصل وصول کر رہے ہوں ۔ ساتھ ساتھ انفرادی مسلمانوں کا تحقیر آمیز تکبر کبھی کبھی انھیں بغاوت کے لیے شدید ترغیب فراہم کرتا تھا ۔ ایسی صورت میں یہ آسانی سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ سرداران یا ان میں سے کچھ اس بات پر واقعتہً آمادہ رہا کرتے کہ موقع ملنے پر وہ مسلمانوں کی بالادستی سے رہائی حاصل کر لیں اور یہ کہ

وہ اپنی آمدنی کی بچت کو روائتی طریقہ کے مطابق فوج اور اسلحے فراہم کرکے اپنے استحکام پر صرف کیا کرتے۔ بہر حال حقیقت جو بھی رہی ہو، علاءالدین کے قبول کیے ہوئے نظریہ کے براہِ راست نتیجہ کے طور پر زرعی پالیسی تبدیل ہوئی جس کا مقصد سرداروں کو ان کے وسائل کے بیشتر حصّہ سے محروم کرنا تھا۔ جو کاروائیاں عمل میں آئیں اسطور پر ہیں۔

۱۔ مطالبۂ مالگزاری کا معیار، بغیر کسی تخفیفوں یا منہائیوں کے، پیداوار کے نصف پر مقرر کیا گیا۔

۲۔ سرداروں کی بالائی رقوم ختم کردی گئیں جس کے نتیجہ میں ان کے زیرِ قبضہ تمام زمینوں کا پوری شرح پر تشخیص کیا جانا قرار پایا۔

۳۔ طریقۂ تشخیص بذریعہ پیمائش اور مطالبات کا شمار معیاری پیداواروں کی بنیاد پر قرار پایا۔

۴۔ کاشت پر تشخیص کے علاوہ ایک چراگاہی محصول عائد کیا گیا۔

یہ کاروائیاں بجائے خود پیشِ نظر مقصد کے حصول کے لیے بہت موزوں تھیں۔ نصف پیداوار کے مطالبہ کے بعد معمولی کسان کے پاس کوئی خاص بچت نہ رہ سکتی تھی یہ اس نئی محصول پر ایک ضرب تھی جس کے متعلق شبہہ تھا کہ سردار وصول کرتے ہیں۔ اگر ایک طرف سرداروں کی اراضیات کی پوری شرح پر تشخیص، ان کی اقتصادی حالت کو گھٹا کر کسانوں کے مساوی کرنے والی تھی تو دوسری طرف چراگاہی محصول کے نتیجہ میں غیر مزروعہ زمین سے ان کی آمدنی کم ہوتی تھی۔ اقتصادی نتیجہ کے اعتبار سے یہ صورت اگر پیدا کرنے والے کی مسلّم بچت کو نہیں تو اس کے بیشتر حصّہ کو کھینچ کر شاہی خزانہ میں پہنچانے والی، معمولی کسانوں کے معیارِ زندگی کو ایک رنگ میں رکھنے والی، اور سرداروں کے معیارِ زندگی کو گھٹانے والی تھی کیونکہ وہ اب اس قابل نہ رہ سکیں گے کہ فوجیں رکھ سکیں یا گھوڑوں یا دیگر ضروریات کو فراہم کرسکیں۔ اب سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ کیا ایسی پالیسی موثر طور پر قابلِ عمل تھی یا ہوسکتی تھی۔

اس سوال پر وقائع نگار کا یہ قطعی جواب ہے کہ یہ ضابطے سختی سے نافذ کیے گئے اور ان سے پیشِ نظر مقاصد حاصل ہوئے۔ چند برس کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں سرداران اور پرگنوں و مواضعات کے چودھری مفلس اور مطیع بنا لیے گئے۔ "ہندوؤں" کے گھروں میں سونے اور

چاندی کی کوئی علامت تک نہ بچی۔ سردار گھوڑے اور اسلحے جمع کرنے سے معذور ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کی بیویاں مفلسی سے مسلم گھروں میں نوکری کرنے پر مجبور ہوئیں۔ وقائع کی عبارت میں قدرے خطیبانہ مبالغہ آمیزی کا شبہہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بادشاہ کی پالیسی کی کامیابی اس امر سے مسلّم ہوتی ہے کہ اس کی ابتدا کے چھ برسوں بعد اس کی مملکت میں امن وامان قائم ہوگیا اور وہ دکن فتح کرنے کے اپنے دیرینہ منصوبہ کی تکمیل کی غرض سے طاقتور فوجوں کو مامور کرنے کے قابل ہو سکا۔ اس کے علاوہ اس کے بقیہ عہدِ حکومت کے دوران کسی سنگین داخلی بغاوت کی اطلاع نہیں ملتی۔ اور ان حالات میں ہمارے لیے یہ نتیجہ قابلِ قبول ہونا چاہیئے کہ سرداروں کو فی الوقت راستہ سے ہٹا کر انتظامیہ نے مملکت کے ایک بڑے حصہ میں کسانوں کے ساتھ براہِ راست تعلق قائم کیا۔

ملک کے وہ علاقے جن پر ان ضابطوں کا اطلاق تھا پوری طور پر واضح نہیں ہیں۔ وقائع نگار (ص ۲۹۹) ایسے صوبوں کی ایک طویل فہرست درج کرتا ہے۔ لیکن جیسا کہ عام طور پر ایسی فہرستوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس میں بعض نام تحریف شدہ ہیں اور کسی قطعی تحریر کی غیر موجودگی میں، اس کا کوئی یقین نہیں کہ فہرست کو نقل کرتے وقت کچھ نام حذف نہ ہو گئے ہوں۔ بہرحال موجودہ فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ ان ضابطوں کو بتدریج دہلی، دریائی علاقہ اور سابقی دوآب پر نافذ کیا گیا۔ مشرق میں اودھ یا بہار کو نہیں، مگر روہیلکھنڈ کو، جنوب میں گجرات کو نہیں، مگر مالوہ اور راجپوتانہ کے کچھ حصّوں کو اور مغرب میں ملتان کو چھوڑ کر جملہ پنجابی صوبوں کو درج فہرست کیا گیا ہے۔ اس طرح تلخیص کرنے پر، فہرست کے متعلق تھوڑا اعتماد پیدا ہوتا ہے، کیونکہ اس میں مملکت کے مرکزی حصّے شامل اور دور افتادہ صوبے حذف کیے گئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے، اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ بعض ناموں کی عدم شمولیت نقل کرنے والوں کی غلطی کے باعث ہو۔ بہرحال اگر یہ فہرست کسی سانحاتی تخفیف کا شکار نہیں ہوئی تب بھی یہ نائب وزیر، شرف قائی کے ایک عظیم انتظامی کارنامہ کی مظہر ہے جس کی قابلیت کا وقائع نگار بہت مدّاح ہے۔

اتنے بڑے علاقہ میں، کسانوں کے ساتھ براہِ راست تعلق قائم کرنے کے باعث، عہدہ داروں کی تعداد میں لازمۂ بہ سرعت اضافہ ہوا ہوگا۔ چنانچہ مثل سولہویں صدی کے چودھویں صدی میں، ایسے اضافہ کے نتیجہ میں بدعنوانیوں اور جبری وصولیوں کے علانیہ مظاہروں کا امکان

تھا۔ مقامی عہدہ داروں کے حسابات کی جانچ کے لیے نائب وزیر کے بنائے ہوئے قاعدوں کا جو بیان وقائع نگار نے (صت 502-9) درج کیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ برآمد ہوتا ہے کہ اس موقع پر اسی قسم کی کوئی صورتِ حال پیش آئی۔ یہ قاعدے اس قدر سخت تھے کہ فی الوقت ملازمتیں بیحد مقبول ہوئیں "محرری انتہائی ذلت کا موجب تھی" اور انتظامی عہدہ کو "بخار سے بدتر" قرار دیا گیا۔ اس سلسلہ میں ہمارا تعلق صرف اس بات سے ہے کہ جانچ کے لیے گاؤں کے حساب کنندوں کے کاغذات استعمال میں لائے گئے۔ اس عہد کے گاؤں کے اندرونی حالات کی جھلکیاں جو ہمیں شاذ ملتی ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ ہم حساب کنندہ کو ہر عہدہ دار کو کی جانی والی تمام ادائیگیوں کا خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز، تفصیلی اندراج کرتا ہوا پاتے ہیں۔ کسی آنے والے باب میں ذکر آئے گا کہ اورنگ زیب کے وزیر مال نے اپنے نگرانی کرنے والے عہدہ داروں کو اپنے ماتحتوں کی ناجائز وصولیوں کو پکڑنے کی غرض سے اسی تدبیر کو اختیار کرنے کی ہدایت کی اور ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ گاؤں کے حساب کنندہ کے فرائضِ منصبی زرعی نظام کا ایک مستقل جز دہیں۔

علاءالدین کی لائی ہوئی خاص تبدیلیاں، ان کوششوں کے نتیجہ میں وجود میں آئیں جو اس نے داخلی استحکام کے حصول کی غرض سے کیں۔ لیکن ایک اہم بات سرحد پر منگولوں کے دباؤ کے نتیجہ میں پیش آئی۔ ان ضابطوں کے، جن کا ذکر ابھی آیا ہے۔ نفاذ کے جلد ہی بعد اس نے راجپوتانہ پر فوج کشی کی۔ یہ مہم بہت زیادہ کامیاب نہ رہی اور جب وہ اپنی فوج کو خستہ اور منتشر حالت میں لے کر واپس ہوا تو منگولوں کی ایک طاقتور فوج یکایک دہلی کے باہری سرحد پر گھس آئی۔ تھوڑے عرصہ کے لیے مملکت کے لیے شدید خطرہ پیدا ہوگیا اور منگولوں کے بالآخر واپس ہو جانے پر، بادشاہ مستقبل میں اس قسم کے حملوں کی روک تھام پر متوجہ ہوا۔ سرحد کے دفاع کی دوبارہ باضابطہ طور پر تنظیم کی گئی۔ لیکن سرحد پر تعینات فوجیوں کے علاوہ اس نے ایک لمبی چوڑی اور مستقل فوج کے قیام کی ضرورت کو محسوس کیا جو اپنی اپنی جاگیروں پر منتشر نہیں بلکہ دارالسلطنت کے نواح میں مرتکز ہو اور جسے شاہی خزانہ سے تنخواہ ادا کی جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں مالی رکاوٹیں پیش آئیں۔ یہ افراطِ زر کا زمانہ تھا اور نتیجۃً اجرتیں زیادہ تھیں چنانچہ یہ محسوس کیا گیا کہ مجوزہ فوج رکھی گئی تو مملکت کا اندوختہ خزانہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ اس دقت کو حل کرنے کی غرض

سے علاء الدین نے قیمتوں کی تخفیف اور انھیں قابو میں لانے کی اپنی معروف پالیسی پر عمل شروع کیا تاکہ مملکت کے وسائل ان اخراجات کی کفالت کر سکیں جو اس کی حفاظت کے لیے ضروری تصوّر کیے جاتے تھے۔

اس پالیسی کے عام پہلوؤں پر کچھ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ایک طرف تو اس کا قابلِ عمل ہونا مشتبہ تھا، اور دوسری طرف اس کے پھیلاؤ کے متعلق مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں وقائع نگار کے بیان کے خلاصہ کو اس حد میں قبول کر لینا چاہیے کہ دہلی اور اس کے نواح میں قیمتیں واقعۃً گھٹ کر تقریباً بارہ یا تیرہ سال کی مدّت تک ایک نسبتاً نچلی سطح پر قائم رہیں۔ اس مدت میں کوئی سنگین نوعیت کی قلت تو پیش نہ آئی۔ لیکن بعض موسم غیر تسلی بخش رہے[10]۔ ضیاء الدین برنی کے لیے ایسا قصّہ گڑھنے کا کوئی سبب نہ تھا اور اس سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ بات ہے کہ ایسے قصّہ کی ایجاد کے لیے جس قسم کے اقتصادی تجزیہ کی صلاحیّت کی ضرورت تھی وہ اس سے محروم تھا۔ قیمتوں کے طویل اور تفصیلی ضابطوں (ص 302 ومابعد) کی مختصراً اسطور پر تلخیص کی جا سکتی ہے۔ ان کا لُبِّ لباب یہ تھا: (1) رسد پر کنٹرول (2) حمل و نقل پر کنٹرول (3) حسبِ ضرورت، صرف کی راشننگ، پورا انتظام (4) انتہائی منظم جاسوسی اور (5) پہلو تہی کی سخت سزاؤں پر مبنی تھا۔ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ٹھیک یہی خلاصہ کنٹرول کے اس نظام کا بھی ہے جو انگلستان میں، جنگ کے ایّام میں رائج کیا گیا اور جو تجربہ سے موثر ثابت ہوا۔ یہ بالکل ناقابلِ قیاس ہے کہ یہ اہم اجزاء ضیاء برنی ایسے مصنّف کے دماغ کی جدّت رہے ہوں۔ اس کے برخلاف یہ بالکل قرینِ فہم ہے کہ اس وقت کے معاشی حالات کے تحت، علاء الدین ایسے بادشاہ کا ذہن، اپنے باصلاحیّت وزراء کے تعاون سے بتدریج اس پالیسی کے اہم اجزاء پر پہنچا ہو جسے نافذ کرنے کا اس نے مصمّم ارادہ کر لیا تھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ ٹھیک انھیں معاملات میں سخت تھا جن میں دورِ حاضر کے نظام کمزور ہیں، کیونکہ وہ جاسوسوں کی ایک تنظیم پر بھروسہ کر سکتا تھا اور موثر سزائیں دینے میں کوئی جذباتی رکاوٹ حائل نہ تھی[11]۔

لیکن ایسے ضابطوں کے قابلِ عمل ہونے کا مسئلہ بیشتر علاقہ کے پھیلاؤ سے وابستہ ہوتا ہے پوری مملکت میں [illegible] کو نیچا رکھنے کی کوشش نہ کی گئی بلکہ اسے دہلی تک محدود رکھا گیا، جہاں ایک مستقل فوج [illegible] تھا۔ ضابطوں کو محض اس قدر علاقہ پر پھیلایا گیا جو دہلی کی بازار

کی علیحدگی کے لیے کافی بڑا ہو۔ وقت کے حالات، علیحدگی کے موافقت میں تھے۔ شمال میں ترائی کے جنگل اور جنوب میں امیوات کا شورش پسند اور بنجر علاقہ واقع تھا۔ عام رسد کی فراہمی کے لیے شہر کا انحصار مشرق کے دریائی علاقہ اور مغرب میں پنجاب کے زرخیز حصّوں پر تھا۔ زیادہ جسامت والی پیداواروں کے اخراجات حمل ونقل لازمنہ کثیر تھے۔ صنعت وحرفت، پیشہ ورتاجروں کے اندر محدود تھی اور ان امور پر کنٹرول قائم کر لینے کے بعد، بازار کو مکمل طور پر علیحدہ کیا جا سکتا تھا۔

ان ضابطوں کا زرعی پیداوار کی رسد سے تعلق ہمارے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے دریائی علاقہ کی پوری اور دہلی کی نصف مالگزاری کی جنس میں ادائیگی کا حکم ہوا اور اس طور پر وصول کیا ہوا غلّہ شہر میں لاکر، حسب ضرورت خرچ کرنے کے لیے، جمع کیا گیا۔ ساتھ ساتھ کسانوں اور دیہی سوداگروں کو اپنی اپنی بچت کو حکومت کی زیرِ نگرانی تاجروں کے ہاتھ مقررہ قیمت پر فروخت کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ ذخیرہ اندوزی کے لیے بھاری سزائیں مقرر کی گئیں۔ میرے خیال میں یہ امر بالکل واضح ہے کہ ان ضابطوں کی وجہ سے مروجہ طریقہ تبدیل ہوا، یا باالفاظ دیگر یہ کہ ملک کے اس حصّہ میں تیرہویں صدی کے دوران، وصولیاں عموماً جنس میں نہیں بلکہ نقدیں میں کی جاتی تھیں۔ یہ ضابطے فی الجملہ اس خیال کی جو کبھی کبھی پیش کیا گیا ہے تائید نہیں کرتے کہ اس عہد میں اور نیز اس کے بعد تک شمالی ہندوستان ارکادی (ARCADIAN) سادگی کا علاقہ رہا ہے۔ پورے علاقہ میں نقدی معیشت بخوبی مستحکم تھی، مواضعات اور نیز شہروں میں غلّہ کے تاجر موجود تھے اور ہم بلا تردد یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کم از کم اس قدر قبل یعنی تیرہویں صدی میں قیمتیں، کسانوں کی دلچسپی کی چیز تھی۔

علاءالدین نے زرعی نظام میں جن تبدیلیوں کو جاری کر کے انھیں اپنی بقیہ عہدِ حکومت کے دوران برقرار رکھا ان کے نتائج کی اس طور پر تلخیص کی جا سکتی ہے:

۱۔ دہلی اور دریائی علاقہ مع شمالی روہیلکھنڈ کے ایک جز کے محفوظ علاقہ (خالصہ) تھا۔ اس کا انتظام وزارتِ مال اپنے عہدہ داروں کے ذریعہ کسانوں کے ساتھ براہِ راست تعلق قائم کر کے کرتی تھی۔ بذریعہ پیمائش تشخیص کر کے، مطالبہ کو پیداوار کے نصف پر متعین کیا گیا تھا جسے مسلّم یا جزاً غلّہ میں وصول کرتے تھے۔ اس علاقہ میں، بلاشک جاگیریں اور معافیاں تھیں لیکن وہ بظاہر اہم نہ تھیں، کسانوں پر ان کی پیداواری بچت کی فروختگی کے

معاملہ میں پابندی تھی جن کی قیمتیں حکومت معین کرتی تھی۔

2۔ اس مرکز کے گرد، صوبوں کا ایک اندرونی حلقہ، صوبیداروں کے زیرِ انتظام واقع تھا۔ یہ بذریعہ پیمائش کسانوں پر براہِ راست تشخیص کرکے، پیداوار کا نصف طلب کرتے تھے جو بظاہر نقد وصول کیا جاتا تھا۔ ان خطّوں میں خرید و فروخت پر کوئی پابندی تحریر میں نہیں آتی ہے۔

3۔ دور افتادہ صوبوں میں صوبیداروں کا کسانوں کے ساتھ براہِ راست تعلق قائم نہ کیا گیا تھا اور ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ بیشتر سرداروں ہی کے ساتھ معاملات کرتے رہے ہمیں اس کی اطلاع نہیں ملتی کہ مطالبہ کیا تھا یہ کیونکر تشخیص کیا جاتا یا اس کی وصولی کس شکل میں ہوتی اور ہم صرف یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ سابقہ طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

وقائع نگار شمس عفیف (ص 37 و مابعد) کے بیان کیے ہوئے بادشاہ فیروز کی پیدائش کے واقعہ سے، اس خطّہ میں سرداروں کی حیثیت کی ایک جھلک ملتی ہے۔ دیپال پور کے صوبیدار نے اپنے حدود میں رہنے والے ایک سردار کی لڑکی کو اپنے بھائی کی بیوی بنانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ سردار نے اس تجویز کو ایسے الفاظ میں مسترد کیا تھا جسے توہین آمیز خیال کیا گیا۔ چنانچہ صوبیدار نے موقع پر اپنی فوج کے ساتھ پہنچ کر اس سال کی مالگزاری بزورِ طاقت براہِ راست چودھریوں سے وصول کرنا شروع کی۔ یہ چودھری معمولاً سردار کو مالگزاری ادا کرتے تھے۔ ان کارروائیوں سے جو مصائب پیش آئے ان سے عاجز آکر خاتون نے اپنے قبیلے کے خاطر خود کو قربان کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ باضابطہ شادی ہوئی اور بادشاہ فیروز پیدا ہوا۔ واقعہ کا اصل نکتہ، وقائع کا یہ بیان ہے کہ لوگ بے بسی کے عالم میں تھے کیونکہ "ان دنوں علاء الدین تخت نشین تھا" اور کوئی احتجاج ممکن نہ تھا۔ اس سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایک طاقتور بادشاہ کا ماتحت طاقتور صوبیدار سرداروں کے ساتھ بالکل اپنی مرضی کا سلوک کر سکتا تھا۔

علاء الدین معمولاً معافیوں اور جاگیروں کی شکل میں مالگزاری منتقل کرنے کا مخالف تھا۔ جیسا کہ گذر چکا ہے اس نے اپنے عہدِ حکومت کے شروع ہی میں تمام موجود معافیوں کو ختم کر دیا تھا اور اگر اس نے بعد کے برسوں میں کچھ معافیاں دیں تو وہ بہت ہی تھوڑی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا دربار بلاشک بہت عالیشان تھا، لیکن علماء اور فنکاروں کو انعامات اوسط پیمانہ پر دئے جاتے جو بظاہر معمولاً نقدی شکل میں ہوا کرتے تھے۔ جہاں تک جاگیروں

سے تعلق ہے وہ غالباً اس پورے نظام ہی کو ناپسند کرتا تھا کیونکہ بعد کے وقائع نگار شمس عفیف کی تحریر ہے (ص95) کہ وہ اس بنا پر مواضعات کی جاگیروں کو ناپسند کرتا تھا کہ ان کی حیثیت بمنزلہ ایک سیاسی خطرہ کے ہوا کرتی ۔ جاگیرداران مقامی رشتے قائم کر کے بہ سہولت ایک مخالف جماعت کی شکل اختیار کر سکتے تھے ۔ اس نے منفرد فوجیوں کو چھوٹی چھوٹی جاگیریں قطعاً نہ دیں ۔ دارالسلطنت میں اس کی لمبی چوڑی فوج کو کلیتہً نقد ادائیگی کی جاتی تھی اور عہدہ داروں کو بڑی جاگیریں دئے جانے کے متعلق مجھے کوئی تحریر نہیں ملی ۔ یہ بہت ممکن ہے کہ کچھ جاگیریں دی گئی یا بحال رکھی گئی ہوں ۔ کیونکہ زنائعوں کا سکوت ایسے معاملوں میں فیصلہ کن نہیں ہوا کرتا ۔ لیکن ایک امر واضح ہے کہ فی الوقت یہ طریقہ ناپسند کیا جانے لگا تھا مالگزاری کے ٹھیکہ کے اس عہد میں کوئی آثار نہیں پائے جاتے ۔ اس سلسلہ میں بھی ممکن ہے کہ ، ہماری معلومات نامکمل ہوں ۔ لیکن ہم عام طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس عہد کی امتیازی خصوصیت ، ٹھیکہ داری یا جاگیرداری کے قسم کے طریقے نہیں بلکہ ایک طاقتور اور بلاواسطہ نظام حکومت تھا ۔

4- غیاث الدین تغلق (25-1320 ء)

علاءالدین کا قائم کیا ہوا انتظام اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اس کا بیٹا اور وارث قطب الدین جو ایک خوبرو اور ہر دلعزیز لڑکا تھا کلیتہً لہو لعب میں مبتلا ہو گیا ۔ اس نے خود اپنی کوئی زرعی پالیسی مرتب نہ کی اور ساتھ ساتھ اس نے اپنے باپ کے تفصیلی ضابطوں کو بھی کلیتہً ختم ہو جانے دیا ۔ مطالبہ مالگزاری کم ہو گیا ۔ لیکن کیوں کر ، یہ تحریروں میں درج نہیں ہے ۔ وزارتِ مال کا کام بے ترتیب ہو گیا ، مالگزاری کے ٹھیکہ کی سٹہ بازی شروع ہو گئی ، معافیاں اور جاگیریں بہ افراط دی گئیں ۔ دارالسلطنت میں بادشاہ کی تقلید میں عیاشی کا دور شروع ہوا ۔ نظام حکومت پارہ پارہ ہو گیا ۔ بالآخر قطب الدین کا ایک مصاحب اسے قتل کر کے خود تخت نشین ہوا اور اس نے پورے شاہی خاندان کو ختم کر ڈالا ۔ اس کے بعد اس مصاحب اور اس کے ساتھیوں کو سرحد پر عرصہ سے تعینات ایک فوجی افسر غیاث الدین تغلق نے ختم کر دیا اور بادشاہت کے لیے کسی امیدوار کی غیر موجودگی میں اتفاق رائے سے خود بادشاہ بن گیا ۔

غیاث الدین نے مملکت کے مالی نظام کو دوبارہ منظم کیا۔ اس کے مطالبہ کا تناسب غیر یقینی ہے اور اس موضوع پر آگے بحث آئے گی۔ اس نے شراکتداری کے بالمقابل پیمائش کو مسترد کر دیا اور سرداروں کو تقریباً ان کی سابقہ حیثیت پر بحال کیا۔ اس نے جن اسباب کی بنا پر طریقۂ تشخیص کو تبدیل کیا، انھیں اس عبارت میں واضح کیا گیا ہے: "اس نے کسانوں کو اختراعات اور نقصان فصل کی تقسیموں سے سبکدوش کیا"۔ یہ عبارت اپنی موجودہ حالت میں پُراسرار ہے لیکن بذریعہ پیمائش تشخیص کی متاخر تاریخ کی روشنی میں اس کی تعبیر کی جا سکتی ہے۔ اس طریقہ کے تحت، کسان پر عائد شدہ مطالبہ، رقبۂ کاشت پر منحصر ہوتا تھا۔ نتیجتاً نظری طور پر، کسان پوری فصل کے نقصان کی صورت میں بھی مسلّم مطالبہ کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوتا۔ لیکن کسی ایسے طریقہ کو عملاً نافذ نہ کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ مطالبہ کے نسبتاً زیادہ ہونے کی صورت میں جیسا کہ پورے مسلم عہد میں تھا، کسان اسے ادا کرنے سے معذور رہتے تھے۔ چنانچہ جہاں کہیں بھی اس نظام کا ذکر پاتے ہیں، وہاں نقصان فصل کے لیے گنجائش کا ذکر آتا ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا اکبر کے زمانہ میں قاعدہ تھا کہ نقصان فصل کے رقبہ کو منہا کر کے صرف تیار فصل کے رقبہ پر مطالبہ قائم کرتے تھے اور میں "تقسیموں" کے لفظ کی تعبیر اس طور پر کرتا ہوں کہ کچھ اسی قسم کے طریقہ پر علاء الدین کے زمانہ میں بھی عمل تھا۔ یعنی یہ کہ کاشت کیے ہوئے رقبہ کو "کامیابی" (فصل) اور "ناکامیابی" (فصل) کے درمیان تقسیم کرتے تھے۔ دوسرے لفظ اختراعات کو اس حقیقت سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس نے پیمائش کے طریقہ کو ان مقامات پر رائج کیا جہاں یہ پہلے سے رائج نہ تھا۔ یہ ایک عام واقفیت کی بات ہے کہ نقصان فصل کی گنجائش کے لیے دیانتدار اور باصلاحیت نظم ونسق درکار ہوتا ہے۔ ان گنجائشوں کا حساب عجلت میں کیا جاتا ہے اور اکثر فصل کے بالکل اختتام پر۔ صحیح حالات کی تصدیق کے لیے بہت ہی تھوڑا وقت ملتا ہے اور مقامی عملہ کے لیے اس امر کی شدید ترغیب ہوتی ہے کہ وہ کسانوں سے گفت وشنید کرے اور اپنی وصول کی ہوئی رشوت کے اعتبار سے نقصان کی مقدار کو زیادہ یا کم کر کے دکھائے۔ چودھویں صدی کے حالات میں مجھے یہ بالکل یقینی معلوم ہوتا ہے کہ پیمائش کا طریقہ بڑے پیمانہ پر اس قسم کی جبری وصولی اور رشوت ستانی کا سبب تھا اور اس کا امکان ہے کہ شراکتداری میں یہ خرابیاں عملاً کم رہی ہوں۔ بہرحال حقیقت جو بھی رہی ہو، بحیثیت ایک معیاری طریقۂ تشخیص کے پیمائش کو اب ختم کر دیا گیا۔ شیر شاہ نے

دو صدی بعد اسے دوبارہ جاری کیا۔

سرداروں اور چودھریوں کے متعلق، غیاث الدین نے علاء الدین کے اس نظریہ کو کہ ان کی اقتصادی حیثیت کو گرا کر کسانوں کے برابر کر دیا جائے مسترد کر دیا۔ اس کے خیال کے مطابق ان کے سر بڑی ذمہ داریاں تھیں اور وہ اسی اعتبار سے معاوضہ پانے کے مستحق تھے۔ لہٰذا ان کی بالائی آمدنیوں کو بغیر کسی محصول کی تشخیص کے ان کے پاس چھوڑ دینا چاہیے اور ان کی چراگاہی آمدنیوں پر کوئی محصول نہ عائد کرنا چاہیے۔ لیکن صوبیداروں کو ایسے اقدام کرنے چاہئیں کہ وہ کسانوں سے زاید محاصل نہ وصول کر سکیں۔ اس طور پر یہ امید کی جاتی تھی کہ سرداران آرام سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ لیکن ان کے پاس اس قدر دولت نہ ہوگی جو انھیں بغاوت پر آمادہ کر سکے۔ ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اس پالیسی پر جس درجہ میں عمل ہوا اس کے اعتبار سے سرداروں نے اپنی تیرہویں صدی کی حیثیت کے اہم اجزاء کو دوبارہ حاصل کیا۔ لیکن جہاں کے صوبیدار کافی طاقتور تھے وہاں انھیں اپنے کسانوں کے ساتھ اپنی مرضی کا سلوک کرنے کے معاملہ میں کم آزادی حاصل تھی۔

غیاث الدین کی پالیسی کا ایک تیسرا عنصر اس کے صوبیداروں کے وقار کو برقرار رکھنے پر اور اس امر پر اصرار تھا کہ انھیں بھی اسی اعتبار سے سیرت کا ایک اونچا معیار قائم کرنا چاہیے۔ یہ واضح ہے کہ اس کی تخت نشینی کے وقت مالگزاری کے ٹھیکوں کے سلسلہ میں سٹہ بازی عام تھی۔ اور وزارتِ مال میں مختلف اقسام کے دلال اور بلائے جان اشخاص بھرے رہتے تھے۔ ہم ان کے کاموں کے متعلق ان ناموں سے جن سے وہ پکارے جاتے تھے یعنی "خفیہ نویسان" "اجارہ داران" "موفران" اور "مخربان" سے قیاس کر سکتے ہیں بادشاہ نے ان بلائے جان لوگوں کی کارروائیوں کو ختم کیا اور امراء کے زمرہ سے اپنے صوبیدار منتخب کیے، اس نے وزارت کے محاسب عملہ کو ان کا پاس و لحاظ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اس نے یہ واضح کر دیا کہ ان کی حیثیت اور وقار کا مدار خود ان کے طور طریقوں پر ہوگا۔ وہ عزت کے ساتھ اپنے عہدہ سے متعلق نذرانوں کو جنھیں "مالگزاری کا $\frac{1}{20}$ $\frac{1}{22}$ اور $\frac{1}{10}$ و $\frac{1}{15}$" بیان کیا گیا ہے، قبول کر سکتے ہیں، اور ان کے ماتحتوں کو اپنی تنخواہوں کے علاوہ "نصف یا ایک فیصدی" لینے کی اجازت تھی۔ لیکن جبری وصولیوں کو انھیں اعداد تک محدود رکھا گیا تھا ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ یہ اعداد پہلے سے چل رہے تھے[41] اور اس سے زائد مقدار میں ناجائز

تصرفات کے لیے سخت سزائیں مقرر کی گئیں۔

ان احکام کے تحت صوبہ جاتی انتظامیہ اور وزارتِ مال کے محاسب عملہ کے درمیان جو رشتہ پایا جاتا تھا۔ اس کی تھوڑی سی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ حسابات کی جانچ وقت وقت پر ہوتی تھی مسلسل نہیں۔ کسی عہدہ دار کو کچھ دنوں کام کرنے دیتے تھے۔ پھر اسے وزارتِ مال میں اس دوگونہ عمل کے لیے جو محاسبہ اور مطالبہ کے نام سے موسوم تھا، طلب کرتے تھے۔ محاسبین، جیسا کہ متوقع تھا، کوشش کر کے کچھ بقایا قائم کر دیتے تھے جس کی وصولی بذریعہ ایذا رسانی عمل میں آتی تھی۔ مجھے بذریعہ ایذا رسانی وصولی کا پہلا حوالہ، شرف قائی کی کارروائیوں میں ملا ہے جس کا ذکر علاء الدین کے عہدِ حکومت کے تحت آچکا ہے (برنی، 288) اس عبارت میں اس امر کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ صوبیدار کی حیثیت کے عہدہ داران کو ایذا پہنچائی جاتی تھی۔ لیکن غیاث الدین کے احکام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس سے مستثنیٰ نہ تھے کیونکہ اس نے اس قسم کے عمل کی ممانعت کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اس ممانعت کو فیروز کے عہدِ حکومت میں دہرایا گیا (579)، لیکن ہم تصور کر سکتے ہیں کہ محمد تغلق کے زمانہ میں ایذا رسانی کا طریقہ رائج تھا۔ اگلا وقائع نگار شمس عفیف بھی فیروز کے زمانہ میں صوبیداروں کے محاسبہ کی دوستانہ نوعیت کا ذکر کرتا ہے (413) لیکن ایک دوسرے مقام پر (489 و مابعد) وہ بیان کرتا ہے کہ ایک اعلیٰ عہدہ دار کو گجرات کی نائب صوبیداری کے زمانہ کی غبن کی ہوئی رقم کی وصولی کے سلسلہ میں وقت وقت پر چند ماہ تک کوڑے کی سزا دی گئی۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عہدہ داروں کے لیے ایذا رسانی ایک معمولی واقعہ تھا۔ لیکن محض بعض بادشاہوں کے زمانہ میں اس کا چلن تھا۔ اور مخصوص حالات میں صوبیدار کی حیثیت کے عہدہ دار کے ساتھ یہ عمل اختیار کرتے تھے۔ اس کا دوبارہ ذکر سولہویں صدی میں ملتا ہے جب جیسا کہ آگے آئے گا۔ اکبر کے بعض افسران "قدیم طریقے" اختیار کر کے وصولیاں کرتے تھے اور مملکت گولکنڈہ میں سترہویں صدی کے دوران بقایہ دار صوبیداروں کو کوڑے کے سزا کا دیا جانا تحریروں میں آتا ہے۔ مالگزاری ادا کرنے والوں کی حالت کو سمجھنے کے سلسلہ میں، یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ ایسی صورت میں کہ جب کسی صوبیدار یا اونچے عہدہ دار کو بقایا داروں کو ایذا پہنچانے یا خود ایذا رسانی کا شکار ہونے کی دو صورتوں میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑتا تھا تو ان کے لیے اوّل الذکر صورت

اختیار کرنے کی شدید ترغیب ہوتی تھی۔

غیاث الدین کے مقرر کیے ہوئے صوبیدار جو صرف باحیثیت افراد ہی ہو سکتے تھے، اپنے عہدوں پر بظاہر اجارہ دارانہ شرائط کے ساتھ برقرار رہ سکتے تھے۔ بالفاظ دیگر انھیں جو فاضل مالگزاری خزانہ میں جمع کرنی ہوتی تھی وہ واقعی وصولیوں اور منظور شدہ اخراجات کے حسابات کے ہر سال طے کیے جانے والے فرق کے بجائے ایک معینہ رقم ہوا کرتی تھی، مجھے ان احکام کی کہ وزارت کو "تصور اور قیاس آرائی یا خفیہ نویسوں کی اطلاعات یا موفران کی یادداشت کی بنا پر صوبوں یا ملک پر $\frac{1}{10}$ یا $\frac{1}{11}$ سے زائد اضافہ نہ کرنا چاہیئے" یہ سب سے زیادہ معقول تعبیر معلوم ہوتی ہے۔

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، کسانوں پر مطالبہ کی تشخیص شراکت داری کے اصول پر ہوتی تھی لہذا اس کا انحصار فصلوں پر رہا کرتا تھا۔ محکمۂ وزارت بنیادی مطالبہ کو تبدیل کیے بغیر مالگزاری میں کمی وبیشی نہ کر سکتی تھی۔ حصہ میں خفیف تبدیلیوں کا کسی اور موقع پر ذکر نہیں آتا اور یہ بجائے خود بہت زیادہ ناممکنات سے ہیں۔ دوسری طرف، صوبیدار کے بطور فاضل مالگزاری کے ایک معینہ رقم کی ادائیگی کا ذمہ دار ہونے کی صورت میں، یہ ایک قدرتی بات تھی کہ وزارت اس رقم کو جس قدر جلد اور جس قدر زیادہ ممکن ہو بڑھانے کی کوشش کرے۔ اس اضافہ کے نتیجہ میں، صوبیدار کسی نہ کسی شکل میں کسانوں پر بار کو بڑھا دیا کرتا جو بادشاہ کے خصوصی مطمح نظر یعنی ترقیٔ ملک کی راہ میں مزاحمت کا سبب بنتا۔ اس نکتۂ نگاہ سے، کسی صوبہ پر بیک وقت اضافہ کو تقریباً دس فیصدی پر محدود کر دینا ایک معقول عملی ضابطہ تھا۔ ایسی صورت میں ترقی کی رفتار تدریجی ہوگی اور صوبیدار کی ادائیگی کو مساوی رفتار سے بڑھنا چاہیئے لیکن اسے صوبہ کی ادا کرنے کی صلاحیت سے آگے نہ بڑھنے دینا چاہیئے۔

جس جملہ پر میں نے ابھی بحث کی ہے، اس کی تعبیر ایک مختلف طریقہ سے کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ مطالبہ کو پیداوار کے دسویں یا گیارہویں حصہ پر محدود کر دیا گیا۔ یہ تعبیر اس عہد کے متعلق ہماری معلومات میں ایک خوش آئندہ اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن میں اسے قبول کرنے سے اپنے کو معذور پاتا ہوں۔ جہاں تک میرا خیال ہے خفیہ نویسان اور "موفران" کے حوالوں کی ان خطوط پر تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ سلسلۂ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے

لہٰذا اس بحث کے ساتھ اس کی غیر جانبداری کا مسئلہ بھی لازمی طور پر منسلک رہا ہے۔ ایک طرف تو پروفیسر ڈاڈسن نے ان حصوں کا جسے اس نے "ایک طویل قصیدہ خوانی" قرار دیا ہے ترجمہ حذف کر دیا ہے اور دوسری طرف مسٹر ایشوری پرشاد اسے "بادشاہ سے بہت زیادہ بدظن" بتاتے ہیں میرے خیال میں حقیقت یہ ہے کہ وقائع نگار کے روبرو ایک ایسا کام تھا جس کی انجام دہی اس کی صلاحیت سے باہر تھی۔ وہ علاء الدین اور غیاث الدین ایسے بادشاہوں کو جو طاقتور، سیدھے سادے اور جن کا ظاہر و باطن ایک تھا سمجھ سکتا تھا اور ان کے حالات بیان کر سکتا تھا۔ لیکن محمد تغلق کی شخصیت زیادہ پیچیدہ تھی۔ اس کے اطوار تضاد کا مجموعہ تھا اور وقائع نگار کے متعلق آخری فیصلہ یہ ہے کہ وہ نہ تو اس کی بغیر تنقید کے مدح کرتا ہے اور نہ ایسی مذمت جو تعصب آمیز ہو بلکہ اس کے بیان کے سلسلہ میں وہ حیرانی اور پریشانی کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے ایسے شخص کے بارے میں نہ کہیں سنا ہے اور نہ کہیں پڑھا ہے، وہ اسے کسی معروف زمرہ میں نہیں رکھ سکتا اور ایک سے زائد بار وہ یہ خیال ظاہر کر کے کترا جاتا ہے کہ بادشاہ ایک عجوبہ مخلوق ہے بلکہ اس کا وجود معمولات فطرت کے خلاف ہے۔ ایسی صورت میں یہ بلا تردد قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سرگذشت کی عبارت ہر دو جہت میں مبالغہ آمیز ہے وہ ان تضادات کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے عہد حکومت کی خصوصیات ہیں، یعنی بادشاہ کے نمایاں کمالات اور اس کی عملی ناقابلیت، یا خلیفہ کے تئیں اس کی اطاعت اور اسلامی قوانین سے اس کی بے اتفاقی اور معاملہ کے دونوں رخ کو وہ ناگزیر طور پر بڑھا کر بیان کرتا ہے۔ ایسی صورت میں وقائع نگار کی مبالغہ آرائیوں کو نظر انداز کر دینا قرین مصلحت ہوگا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا کوئی سبب نہیں کہ ہم بادشاہ کے زرعی ضابطوں کے متعلق اس کے بیان کردہ واقعات پر اعتماد نہ کریں اور یہ وہ واحد موضوع ہے جس سے ہمارا فی الوقت تعلق ہے۔

ہمیں اس عہد کی زرعی پالیسی کے متعلق کوئی باضابطہ بیان نہیں ملتا اور نہ ہی ہمارے پاس بادشاہ کے منصوبہ کے متعلق کوئی بلا واسطہ نشاندہی موجود ہے۔ لیکن ہمارے پاس قصوں کا ایک سلسلہ ہے جنہیں ہم ان دو زمروں میں رکھ سکتے ہیں: صوبوں کا عمومی بیان اور دریائی علاقہ میں اختیار کی گئی خصوصی کاروائیاں۔ بادشاہ کی ابتدائی کاروائیوں میں سے ایک اس کی دور افتادہ صوبوں کے انتظام حکومت کو دہلی اور دریائی علاقہ کے ساتھ مدغم کرنے کی کوشش

کہ یہاں وزارت اور صوبیداروں کے مابین تعلق کا حوالہ دیا گیا ہے نہ کہ صوبیداروں اور کسانوں کے درمیان تعلق کا اور عبارت کا خاص نکتہ واجب الادا رقم کا اضافہ ہے نہ کہ پیداوار سے اس کے تناسب کا تعین۔ غیاث الدین پیداوار کے جس تناسب کو طلب کرتا تھا وہ ماخذ میں کسی دوسری جگہ درج نہیں ہے اور ہم صرف یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس نے سابقہ تناسب کو تبدیل نہیں کیا، لیکن خود یہ تناسب کہیں درج نہیں ہے۔ ضیاء برنی کی صرف اس قدر اطلاع ہے (ص 293) کہ قطب الدین نے علاء الدین کی عائد کردہ "کثیر مالگزاری اور سخت مطالبوں کو لوگوں پر سے ہٹایا"۔ یہ عبارت مبنی بر حقیقت نہیں بلکہ مبالغہ آمیز ہے۔ اس کا مفہوم وہ نہیں ہو سکتا جو اس کے ظاہری الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اس نے مالگزاری کو بالکل ختم کر دیا۔ ہم صرف اس قدر قیاس کر سکتے ہیں کہ اس نے مالگزاری کے بار کو علاء الدین کے نصف پیداوار کے مطالبہ سے کچھ کم کیا یا لوگوں کے بار میں کسی اور طریقہ سے تخفیف کی۔

بہر حال، غیاث الدین کا عہد حکومت کسی نئی روایت کو مستحکم کرنے کے لحاظ سے بہت مختصر المیعاد تھا اور اس عہد کی اہمیت، پالیسی کے تعین کے لحاظ سے ہے نہ کہ نتائج کے حصول کے اعتبار سے۔ اس فوجی بادشاہ کی اوّلین توجہ فوجیوں کی فلاح پر اور دوسرے درجہ میں کسانوں کی خوشحالی پر تھی۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ اس کے کسان اپنی موجودہ کاشت کو برقرار رکھیں اور اپنے وسائل میں اضافہ کے ساتھ اسے خواہ بتدریج ہی سہی مگر برابر بڑھاتے رہیں اور اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس راہ میں ترقی کا بہت زیادہ انحصار بہتر نظام حکومت پر ہوگا۔ ناگہانی اور کثیر اضافوں کے متعلق اس کا فیصلہ تھا کہ یہ تباہ کن ہوگا: "بادشاہوں کی تباہی کا ظاہری سبب مالگزاری کی سخت گیری اور شاہی مطالبہ کا زیادہ ہونا ہوتا ہے اور بربادی، تباہ کن صوبیداروں اور عملہ سے پیش آتی ہے"۔ اس نہج سے غیاث الدین، بلبن کے وارث کا مقام رکھتا ہے۔ چند برسوں بعد اس کے لڑکے نے اس پالیسی سے انحراف سے پیش آمدہ نقصانات کی ایک نمایاں مثال پیش کی۔

5۔ محمد تغلق (1325-1351)

غیاث الدین کا جانشین اس کا لڑکا محمد تغلق ہوا۔ اس بادشاہ کی سیرت اور صلاحیتوں پر بار بار بحث آئی ہے اور چونکہ اس کے عہد حکومت کے لیے ضیاء برنی خاص ماخذ ہے،[1]

تھی۔ یاد ہوگا کہ آخرالذکر علاقے براہِ راست وزارتِ مال کے تحت تھے۔ وقائع نگار دونوں کو ایک مرکز پر لانے کی اس کوشش کو طنزیہ طور پر بیان کرتا ہے۔ یہ بیان، اس کی اس تصویر کشی سے قریبی مطابقت رکھتا ہے جس میں اس نے بادشاہ کو ایک طبّاع مگر غیر عملی انسان کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ بعید ترین صوبوں سے تفصیلی حسابات بھیجے جاتے تھے اور دارالسلطنت کا محاسب عملہ ان میں مندرج چھوٹی سے چھوٹی رقم پر ان سے حجت و تکرار کرتا تھا اور اس کے بیان کے مطابق، یہ تجربہ صرف چند برسوں تک قائم رہا۔ اس کے بعد کیا پیش آیا، اس کا باضابطہ اندراج نہیں ملتا ان دو قصّوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجارہ کا سٹہ کرنے والے صوبوں میں داخل ہو گئے۔ ایک قصّہ (ص 488)، ایسے شخص کے متعلق ہے جس نے دکن میں بیدر کا تین سالہ اجارہ ایک کروڑ ٹنکوں کی ادائیگی کی شرط پر لیا تھا۔ وقائع نگار اسے "بہ اعتبار پیشہ غلّہ کا تاجر، کم ہمت اور نااہل" بتاتا ہے۔ وہ اس علاقہ کے لیے اجنبی تھا اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ وہ اپنے اجارہ کی تہائی یا چوتھائی رقم سے زائد وصول نہ کر سکے گا، اس نے بغاوت کا اعلان کر کے اپنے کو قلعہ بند کر لیا۔ بہر حال اسے بہ سہولیت گرفتار کر کے ایک قیدی کی حیثیت میں دہلی بھیج دیا گیا۔

دوسرا قصّہ صوبہ کڑا کے اجارہ دار کا ہے۔ وقائع نگار اس کے تئیں اپنی حقارت کا ایسی زبان میں اظہار کرتا جس کا صحیح ترجمہ نہیں کیا جا سکتا" ایک حقیر، بھنگ میں شرابور مردک" سے میرے خیال میں اس کی عبارت کا عمومی مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔ اس نے اجارہ کو بغیر سرمایہ، حمائتوں یا کسی قسم کے وسائل کی فراہمی کے لئے لیا اور جس قدر رقم ادا کرنے کا وعدہ تھا وہ اس کا دسواں حصّہ بھی وصول نہ کر سکا۔ اس نے بالآخر اپنے گرد رذیلوں کی ایک ٹولی جمع کر کے بغاوت کا اعلان کر کے بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔ قریبی صوبیدار نے بغاوت کو بہ سہولیت کچل کر باغی صوبیدار کی کھال کھنچوا کر اسے بطریقِ مناسب دہلی بھیجا۔ اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم بھی کر لیں کہ ان دو سٹہ بازوں کے متعلق وقائع نگار کا بیان مبالغہ آمیز ہے، تب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ ان کی حیثیت خالصۃً ایسے سٹہ بازوں کی تھی جو مقامی تعلقات نہ رکھتے تھے اور بجز اس کے کہ مالگزاری کے متعلق ان کی بولی کو قبول کر لیا گیا تھا: انھیں صوبیدار بننے کا کوئی استحقاق نہ تھا۔ نہ ہی یہ اخذ کرنے میں ہم حق بجانب ہوں گے کہ یہ دونوں اجارے مستثنیات میں سے تھے۔ وقائع نگار کے لیے انھیں بیان کرنے کا

واحد سبب یہ تھا کہ ان کا انجام بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوا اور ان اجاروں کو بغاوت ہی کے زیرِعنوان بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے شرائط کو ایک ایسے امرِواقعہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہوگا کہ ایک مرتکز انتظامِ حکومت کے قیام کی کوششوں کے ناکام ہونے کے بعد جو صوبہ واری انتظام وجود میں آیا یہ اس کا ایک نمونہ تھا۔ ہمیں ایسے سٹہ بازوں کا تو علم ہے جنھوں نے کامیاب ہونے کے بعد بغاوت کی راہ اختیار کی لیکن جو اپنا معاہدہ پورا کرنے میں کامیاب ہوئے یا جنھوں نے اپنی ناکامیابی کی سزا کو قبول کیا ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں۔ لہٰذا ان کے سرداروں اور کسانوں کے ساتھ تعلق کی نوعیت کے بارہ میں ہم محض قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں۔

اس عہد کے دوران دریائی علاقہ کے حالات کو قدرے تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہے۔ مثل دیگر مقامات کے یہاں بھی بعض اوقات صحیح تاریخیں غیر یقینی ہو جاتی ہیں لیکن واقعات کی ترتیب بہرحال قائم کی جا سکتی ہے۔ یہ واقعات تقریباً چوتھائی صدی کی مدّت پر محیط ہیں۔ جن کے خاص خاص پہلو اس طور پر ہیں: مالگزاری میں تباہ کن اضافہ، منڈی کا خاتمہ، کاشت کاری پر بندش، بغاوت، سخت سزائیں، بارش کے نہ ہونے سے واقع ہونے والی قلّت کو بحال کرنے کی کوشش اور بالآخر تعمیرِنو کی ایک جاذبِ نگاہ پالیسی جو تقریباً ایک مکمّل افراتفری پر ختم ہوئی۔

اپنے عہدِ حکومت کے آغاز پر محمد تغلق نے، دریائی علاقہ کی مالگزاری میں جو خاص طور پر شاہی خزانہ کے لیے مخصوص تھی، اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا (ص473)۔ اضافہ مقدار کے اعتبار سے تباہ کن تھا۔[ف] کسان غریب ہوگئے اور ان میں سے وہ جو دوسرے وسائل کے مالک تھے منحرف ہوگئے۔ اس کے بعد جلد ہی، بادشاہ نے دکن میں دیوگیر کو دارالسلطنت منتقل کرنے کے متعلق اپنے منصوبہ کی تکمیل کی اور 1329ء میں دہلی کی عملاً پوری آبادی کا انخلا عمل میں آیا۔ دریائی علاقہ کے کسان پر اس کارروائی کے معاشی اثرات کو علاءالدین کے ضابطوں کی مطالعہ سے بلا کسی دقّت کے سمجھا جا سکتا ہے۔ ملک کی پیداواری بچت کے لیے دہلی واحد بڑی منڈی تھی جسے بہ عجلت ختم کر دئے جانے کے بعد، ایسی پیداوار کو اگانے سے کیا فائدہ ہوتا جو فروخت نہ کی جا سکے بالفاظِ دیگر، کاشتکاری لازمۃً گھٹی ہوگی اور اسی تناسب سے مالگزاری میں بھی کمی ہوئی ہوگی۔[ف]

بادشاہ چند برسوں بعد 1332ء کے لگ بھگ دارالسلطنت کو اب بھی دکن میں چھوڑ کر تھوڑے دنوں کے لیے دہلی واپس آیا اور اس نے کثیر وصولیوں کے نتیجے میں دریائی علاقہ کو بدنظمی کے عالم میں پایا۔ غلے کے ذخیرے نذرِ آتش کر دئے گئے تھے اور مویشیوں کو مواضعات سے ہٹا دیا گیا تھا۔ وقت کے حالات کے لحاظ سے یہ طور طریقے بمنزلہ بغاوت کے تھے کیوں کہ کسانوں کا بنیادی کام زمین کی کاشت اور مالگزاری کی ادائیگی ہوتی ہے۔ لہٰذا بادشاہ کے احکام کے تحت باغیوں کے علاقہ کو پامال کیا گیا۔ بہت سے سربرآوردہ اشخاص یا تو قتل یا اندھے کر دئے گئے اور محمد تغلق کے دکن واپس ہونے کے وقت ہم یہ بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ دریائی علاقہ کی پیداوار پہلے سے کم ہوگئی تھی[49]۔

اس کے بعد پھر 1337ء کے لگ بھگ، دہلی بحیثیت دارالسلطنت کے بحال ہوا[49] مگر فوجوں اور شہری آبادی کی واپسی پر ان کے لیے ضرورت کے سامان دستیاب نہ تھے۔ وقائع نگار کے مبالغہ آمیز الفاظ میں کاشتکاری کا "ایک ہزارواں حصہ بھی نہ بچا"۔ بادشاہ نے پیداوار کو دوبارہ منظم کرنے کی سعی کی اور اس مقصد کے لئے اس نے پیشگی رقمیں دیں۔ لیکن اس مرحلہ پر بارش نہ ہوئی اور کچھ نہ کیا جا سکا۔ بالآخر (1345ء) بادشاہ اپنی فوج اور بیشتر شہری آبادی کے ساتھ، قنوج کے قریب دریائے گنگا کے کنارے ایک چھاؤنی پر منتقل ہوا۔ یہاں زندگی کے ضروری سامان کڑہ اور اودھ کے صوبوں سے فراہم کئے جا سکتے تھے۔ وہاں چند برسوں کے قیام کے بعد، محمد تغلق دہلی واپس ہوکر[30] تین برسوں تک انتظامی امور اور دریائی علاقہ کی بحالی کی کوششوں میں مصروف رہا۔

اس مقصد کے پیشِ نظر ایک خصوصی وزارت کا قیام عمل میں آیا۔ پورے علاقوں کو حلقوں میں تقسیم کر کے ان میں سرکاری عملہ تعینات کیا گیا جنھیں کاشتکاری کو بڑھانے اور فصلوں کے معیار کو بہتر بنانے کی تاکید کی گئی۔ ان مقاصد کو پرشکوہ الفاظ میں اسطور پر بیان کیا گیا ہے: "ایک بالشت زمین بھی غیر مزروعہ نہ چھوڑنی چاہیئے" اور "اور جو... کی جگہ گیہوں، گیہوں کی جگہ گنا، گنے کی جگہ انگور کی بیلوں اور کھجور کی کاشت ہونی چاہیئے"۔ گوکہ بنیادی تصور معقول تھا لیکن جیسا کہ اس عہدِ حکومت میں اکثر پیش آیا، اس تصور کو عمل کی شکل دینے میں کامیابی نہ ہوئی۔ تقریباً سو افراد کا عملہ جو اس کام کے لیے منتخب کیا گیا نااہلوں اور حریصوں کی ایک جماعت تھی۔ انھوں نے اس کام کو تین سال کی مدت میں مکمل کرنے کی ذمہ داری لی اور

پیشگی رقمیں تقسیم کرنے کی غرض سے کثیر سرمایہ کے ساتھ کام شروع کیا۔ لیکن رقم بیشتر غبن کرلی گئی اور ویران زمین زیادہ تر کاشت کے لیے ناموزوں ثابت ہوئی۔ منجملہ کم و بیش سترلاکھ کی رقم کے جو دو سال کی مدّت میں خزانہ سے برآمد کی گئی تھی " سویں اور ہزارویں حصّہ " سے کوئی نتیجہ نہ ظاہر ہوا اور فطری طور پر عملہ کے افراد سخت سزاؤں سے خائف تھے۔ لیکن بیشتر اس کے کہ ان کوششوں کی مکمل ناکامی ظاہر ہو، بادشاہ دکن سے طلب کیے جانے پر 45ء13 میں وہاں چلا گیا۔ وقائع نگار نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر بادشاہ دہلی واپس آگیا ہوتا تو ان عمّال میں سے ایک کی بھی جان نہ بچتی۔ لیکن واپسی اس کے مقدّر میں نہ تھی اور اس کے نرم مزاج جانشین کے تحت ان رقموں کو ناقابلِ وصول قرار دے کر منسوخ کر دیا گیا۔[46]

یہ سرگذشت بجائے خود واضح ہے اور اس میں صرف دو نکتے قابلِ توجہ ہیں۔ اوّل یہ کہ اس علاقہ کی ویرانی کو بعض اوقات خالصتہً خراب فصلوں کے ایک طویل سلسلے سے منسوب کیا گیا ہے، لیکن میں نے واقعات کا جو خلاصہ ابھی پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا سبب اصلاً انتظامِ حکومت تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عہد میں ہندوستان کے بعض حصّوں میں شدید قحط پیش آئے اور بحالی کی پہلی کوشش، بارش کے نہ ہونے سے ناکام رہی۔ لیکن دوسری کوشش کی راہ میں اس قسم کی کوئی رکاوٹ نہ پیش آئی اور دوسری ناکامی کے پیشِ نظر، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پہلی کوشش بارش کی کمی نہ ہونے کی صورت میں کامیاب ہوتی۔ یاد ہوگا وقائع نگار کی تحریر میں " قحط " کا تعلق بنیادی طور پر شہری آبادی سے ہے۔ دہلی کے دوبارہ بسنے کے وقت، واضح طور پر وہاں قحط تھا کیونکہ وہ علاقے جو یہاں رسد فراہم کرتے تھے خود بلا پیداوار ہو گئے تھے۔ لیکن پیداوار کے نہ ہونے کا سبب محض بارش کی کمی نہیں بلکہ کسانوں کا منتشر ہوجانا تھا اور اس منتشری کا سبب محض انتظامِ حکومت کی مسلسل فاش غلطیاں تھیں۔

سرگذشت کا قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس موقعہ پر باراوّل ہمارے روبرو یہ تصوّر آتا ہے کہ فصل کو بہتر بنانا[47] انتظامِ حکومت کے فرائض میں ہونا چاہیے۔ ان زرعی پالیسی کے اعلانات میں جن پر ابھی بحث آتی ہے محض کاشتکاری کی برقراری اور توسیع کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ محمد تغلق ہی پہلا بادشاہ ہو جس نے متبادل طریق کار پر زور دیا۔ مگر اس کے سرکاری طور پر اختیار کیے جانے کا اوّل ترین اندراج اسی کے

عہدِ حکومت میں ملتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں اس کا ذکر شاندار الفاظ میں آیا ہے اور بحیثیت انگور کے بیلوں اور کھجوروں کے علاقہ کے میرٹھ اور بلند شہر کی تصویر کشی پر تبسم بلکہ حقارت آمیز ہنسی آتی ہے۔ لیکن بہر حال، یہ تصوّر معقول تھا اور اس کے بعد سے یہ زرعی پالیسی کے ایک مسلّمہ عنصر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

اس عہد میں جاگیروں کی صورتِ حال کے متعلق ہندوستانی وقائع نگار کچھ تحریر نہیں کرتا۔ لیکن دمشق میں تصنیف کی گئی ایک کتاب ہے جس میں محمد تغلق کو اس عہد کا ہندوستان کا بادشاہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی اطلاع کے مطابق ہندوستان کا فوجی نظام، مصر یا شام کے فوجی نظام سے اس طور پر مختلف تھا کہ وہاں فوجی سربراہ کو خود اپنے وسائل سے فوج نہ رکھنا ہوتا تھا۔ وہاں فوجوں کو خزانہ سے ادائیگی ہوتی تھی اور فوجی سربراہ کی آمدنی اس کی ذاتی ہوتی تھی۔ ان کی ذاتی آمدنیاں مالگزاری کی جاگیروں کی شکل میں دی جاتی تھیں۔ اور ان کی وصولی تخمینی مالیت سے زائد ہوا کرتی تھی اور صدر مقامات کے کچھ اعلیٰ عہدہ داران کے پاس ان کی تنخواہ یا اس کے ایک جزو کے عوض میں "قصبات اور مواضعات" بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ بیان بعض عہدِ حکومت کے متعلق جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس زمانہ کی جاگیریں، مملکتِ مغلیہ کی جاگیروں سے اس لحاظ سے مختلف تھیں کہ یہ صرف ذاتی تنخواہوں کے عوض میں نہ کہ فوجوں کے اخراجات کے لیے دی جاتی تھیں۔ صوبہ جاتی فوجوں کی تنخواہوں کے لیے علٰحدہ سے انتظام رہا کرتا اور جیسا کہ غیاث الدین کے احکام سے ظاہر ہوتا ہے ان کا حساب دینا ہوتا تھا۔ چنانچہ علاء الدین کا اپنی فوجوں کو نقد ادا کرنے کے متعلق فیصلہ اس عہد میں بھی بطور ایک عملی ضابطہ کے قائم رہا۔ یہ بیان کہ "جاگیریں اپنی تخمینی مالیت سے بہت زیادہ نفع بخش ہوتی ہیں" ایک خصوصی توجہ کا حامل ہے، کیونکہ جہاں تک میری دریافت کا تعلق ہے، تحریروں میں مملکت کی مالیت کا یہ پہلا حوالہ ہے۔ یہ موضوع اگلے عہد میں نمایاں ہوتا ہے۔ دی جانے والی جاگیروں کے رقبہ کو ہم اس کتاب سے حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن ابن بطوطہ نے جن واقعات کو ضمناً تحریر کیا ہے وہ ظاہر کرتے ہیں کہ عہدہ داروں کو کم از کم معمولاً جاگیروں کے ذریعہ تنخواہیں دی جاتی تھیں اور چونکہ تنخواہیں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں، لہٰذا ان کے عوض میں جو جاگیریں دی جاتی تھیں وہ ضرور وسیع رہتی ہوں گی۔ لہٰذا اجارہ اور جاگیر کو ہم اس عہد کے اہم ترین

اداروں میں شمار کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ فیروز شاہ (1388-1351)

محمد تغلق کا چچا زاد بھائی فیروز شاہ جو ایک عمر رسیدہ انسان تھا اور تھوڑے عرصہ تک مملکت کے نظم و نسق کے کام پر مامور رہ چکا تھا اس کا جانشین ہوا۔ اس عہد کے ہمعصر ماخذ کی قدر و قیمت کا تعین قدرے دشوار طلب ہے۔ خود بادشاہ کے چھوڑے ہوئے ایک تذکرہ کے علاوہ ہمارا انحصار ضیاء برنی اور شمس عفیف کی تحریروں پر ہے۔ ضیاء برنی کی تحریر اس کے عہدِ حکومت کے صرف پہلے چھ برسوں سے متعلق ہے۔ یہ ایک واضح امر ہے کہ یہ چھ برس کم از کم دارالسلطنت کے نوکر شاہی کے لیے، عہد محمد تغلق کے متاخر برسوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ آسودہ حالی کا زمانہ تھا اور میرا خیال ہے کہ وقائع کے اختتامی ابواب انحطاط پذیر طاقت کی قطعی علامات کے مظہر ہیں۔ ضیاء برنی ایک طویل عمر پانے کے بعد خود اپنے پسند کیے ہوئے کام کو نامکمل چھوڑ کر مر گیا اور اس عہد کے متعلق اس کی بیشتر تحریر غیر محتاط اور خطیبانہ مداح سرائی پر مشتمل ہے جس کے الفاظ کو ہمیں مبالغہ آمیز تصور کرنا چاہیے۔ دوسرا وقائع نگار شمس عفیف فیروز شاہ کی سرپرستی میں بڑا ہوا تھا جس نے اسے وزارت مال میں ملازم رکھا تھا۔ لیکن اس نے اپنی زندگی کے پچھلے حصہ میں جب اس کا سرپرست مر چکا تھا لکھنا شروع کیا۔ دہلی تیمور کے ہاتھوں لٹ چکی تھی۔ اور مملکت بہ سرعت انتشار پذیر تھی۔ حال اور ماضی کا موازنہ جس پر وہ بار بار زور دیتا ہے، بجائے خود، اپنے گذرے ہوئے سرپرست کے متعلق اس کی بار بار دہرائی ہوئی مدح سرائی کے جوش و خروش کی توجیہہ کے لیے کافی ہے اور ہمیں اس کی عبارت کو بھی مبالغہ آمیزی ہی کا درجہ دینا چاہیئے۔ لیکن خوش قسمتی سے حکایات کا بیان اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور اس کی سرگذشت کے باقاعدہ حصوں کے بالمقابل اس کے آخری ابواب میں مندرج سنے سنائے واقعات سے بادشاہ کی نظم و نسق کی قدر و قیمت کا زیادہ صحیح اندازہ لگانا ممکن ہے: فیروز ایک پرہیز گار مسلمان تھا اور ہندوؤں کے خلاف اس کی بعض کارروائیاں جو تحریروں میں آئی ہیں موجودہ زمانہ میں قابلِ تنقید ہو سکتی ہیں۔ لیکن فی الجملہ ہم اسے فیض رساں لیکن ایک قطعاً کمزور بادشاہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کا عہدِ حکومت، دارالسلطنت کی نوکر شاہی کے لیے جو اس کے لیے ہماری معلومات کا ماخذ ہے بلاشک عہد زریں کا

درجہ رکھتا تھا لیکن صوبیداروں پر نگرانی ڈھیلی تھی۔ اس عہدہ پر بعض بہت ہی ناموزوں تقرریاں تحریروں میں درج ہیں اور یہ امر کہ بعید تر صوبوں میں بادشاہ کے کریمانہ مقاصد کس حد میں تکمیل ہو پاتی تھی شبہہ سے خالی نہیں۔ لیکن بہر حال اس کے عہدِ حکومت کے بیشتر دنوں میں مملکت کے مرکزی حصہ میں بظاہر امن وامان اور خوشحالی رہی۔

فیروز نے تخت نشین ہونے پر مالی نظام کو بے ترتیبی کے عالم میں پایا اور اس کے وزیر کے پہلے کاموں[۵۴] میں اس کی از سرِ نو ترتیب تھی۔ یہ بات کہ مالی نظام بے ترتیب رہا ہوگا اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہے۔ دریائی علاقہ اب بھی غیر آباد تھا۔ اور صوبے سٹہ بازوں کے ہاتھ لگ گئے تھے جن کے متعلق بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ وہ مروجہ ضابطوں کی پابندی کے بجائے فوری منافع کی طرف زیادہ متوجہ رہا کرتے۔ سرگذشتوں میں یہ درج نہیں کیا گیا ہے کہ پیداوار کا کون سا تناسب اب طلب کیا جاتا تھا اور مجھے کوئی ہمعصر سند بعض جدید مصنفین کے پیش کیے ہوئے اس نظریہ کے تائید میں نہیں ملتی کہ مطالبہ پیداوار کا محض دسواں حصہ تھا[۵۵]۔ مطالبہ کے صحیح تناسب کے متعلق محض قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ طریقۂ تشخیص جو اختیار کیا گیا تھا وہ شراکت داری کا تھا اور ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ قیمتیں اور وافر مطالبات اور نقصانات فصل (نابودھا) اور تصوری تشخیص" بالکل ختم کر دی گئیں۔ جن الفاظ کا 'OPPORTIONMENTS' اور 'CROP FAILURE' ترجمہ کیا گیا ہے وہ وہی ہیں جن کا غیاث الدین کی اصلاحات کے ضمن میں ذکر آیا ہے اور ان کے یہاں استعمال سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں بعض مقامات پر پیمائش کا رواج رہا ہوگا لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ وقائع نگار اپنے قیاس سے لکھ رہا ہو اور وہ طریقہ شراکت کے متعلق خود اپنی پسند کو ظاہر کر رہا ہو۔ بقیہ دو فقروں کی وضاحت نہیں کی گئی ہے لیکن یہ باضابطہ مالگزاری پر مستزاد جبری وصولیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جہاں تک کسانوں پر مطالبہ کا تعلق ہے، صورتِ حال یہ تھی کہ انھیں اپنی پیداوار کا ایک جزو دینا ہوتا تھا اور اس سے زاید نہیں۔ یہ بات واضح نہیں کہ ادائیگی نقد میں ہوتی تھی یا غلہ میں۔ ان ادائیگیوں کو کسے پانا چاہیئے تھا؟ یہ سوال ہمارا تعارف، صوبیداروں اور جاگیرداروں کے دو ایسی اہم شخصیتوں سے کراتا ہے۔

ضیاء برنی واضح کرتا ہے (ص ۵۸۵) کہ آغازِ عہد میں صوبیداران دیگر اونچے عہدہ داروں کے مثل مالگزاری کی قیاسی پیشکش کی وجہ نہیں بلکہ اپنی ذاتی سیرت کی بنیاد پر منتخب کیے جاتے تھے

اور غیاث الدین کے عہد کے مثل دلالوں اور وبالِ جان لوگوں سے انتظام حکومت کو دوبارہ پاک کیا گیا (ص 574) ساتھ ساتھ حساب فہمی اور وصولی کے ضابطوں کی شدّت کو نرم کیا گیا اور ایک بالکل ہی غیر معمولی نوعیت کے حکم کے تحت صوبیداروں کے جانب سے بادشاہ کو پیش کی جانے والی سالانہ نذر کی مالیت کو ان کے صوبوں کے ذمہ واجب مالگزاری کی رقم کے متوازن کر دیا گیا۔[37] پس صوبیدار اس قابل ہوئے کہ وہ مالگزاری ادا کرنے والوں کے ساتھ معقول برتاؤ کر سکیں اور اس عہد میں دیہاتوں کی خوشحالی اس امر کی شاہد ہے کہ کسانوں کو فی الجملہ مواقع حاصل تھے۔[38] بادشاہ سے شعوری خطا سرزد ہونے کے تحریری اندراجات ملتے ہیں، مثلاً ایک نائب صوبیدار کو جو سمانہ میں اپنی بد اطواری کی بنیاد پر، برطرف کر دیا گیا تھا گجرات میں دوبارہ مقرر کیا گیا۔ تھوڑے عرصہ بعد اسے دوبارہ برخواست کرنا پڑا جس سے لوگوں نے بڑی راحت محسوس کی۔[39] لیکن سرگذشت میں اس قسم کی بہت سی مثالیں نہیں ہیں۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ انھیں استثنائی تصور کرنا چاہئے

اس عہد میں، بہر حال صوبیداروں کے بالمقابل جاگیرداران/کسانوں کے لیے ضرور زیادہ اہم رہے ہوں گے کیونکہ فیروز کا بیشتر انحصار جاگیرداری کے نظام پر تھا۔ اس کے عہدہ داروں کی تنخواہیں بظاہر بجد اونچی شرحوں پر مقرر کی گئی تھیں اور اس کے متناسب مالگزاری ان کے نام مخصوص کر دی گئی تھی۔ جب کے منفرد فوجیوں کے لیے مواضعات کی جاگیروں کے رواج کو دوبارہ بحال کیا گیا۔ شمس عفیف کا بیان بلاشک مبالغہ آمیز ہے کہ (ص 95) تمام مواضعات اور پرگنے فوج کو جاگیریں دے دئے گئے، کیونکہ بادشاہ کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ مالگزاری کا کچھ حصہ اپنے لئے مخصوص رکھے۔ لیکن ہم بلا تامل یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اب نظامِ جاگیرداری پوری مملکت کے معمولات میں تھا۔

فوجیوں کو دی گئی جاگیروں کی صحیح نوعیت پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ سرگذشت کی بعض عبارتوں سے اشارہ ملتا ہے کہ عام رواج کے مطابق فوجی مواضعات کو اپنے سپردگی میں لے لیتے تھے جب کہ ہم ایک دوسری عبارت سے جو بہت ہی زیادہ پیچیدہ ہے یہ مفہوم نکال سکتے ہیں کہ کسی فوجی کو اس کے موضع کے ساتھ براہِ راست ربط نہ قائم کرنے دیتے تھے بلکہ وہ محض ایک دستاویز پاتا تھا جس کی رو سے اسے اس موضع سے اپنی تنخواہ کی وصولی کا حق حاصل رہتا تھا اور یہ کہ اسے دارالسلطنت کے کسی ساہوکار کے معرفت جو اس کاروبار کا ماہر ہوتا اور اس سے کافی نفع کماتا اصل سے کم پر بھنا لیتا تھا۔ درمیانی فرق مالگزاری ادا کرنے والوں

کے لیے اہم ہو سکتا تھا لیکن اس کا اس حقیقت پر جس سے ہم فی الوقت متعلق ہیں کوئی اثر نہیں پڑتا یعنی یہ کہ اس عہدِ حکومت میں مالگزاری بیشتر جاگیر پہ دی ہوئی تھی۔[12]

نظامِ جاگیرداری کے وسیع پھیلاؤ کے باعث ہم ضابطہ کے ایک فنی مگر اہم مسئلہ سے دو چار ہوتے ہیں جسے ہم اس کے کسی مسلّمہ نام کی غیر موجودگی میں تشخیص مالیت (VALUATION) کے نام سے موسوم کریں گے۔ عہدہ داروں اور فوجیوں کی تنخواہیں نقد مقرر کی جاتی تھیں مطالبہ مالگزاری جو بذریعہ شراکت تشخیص کیا جاتا لازمی طور پر فصل بہ فصل زیر کاشت رقبہ اور پیداوار کی مقدار کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا تھا اور جاگیریں دیتے وقت وزارت کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ ہر دعویدار کو اس قدر جاگیر مل جائے جس کی تبدیل ہوتی ہوئی آمدنی اس کی مقررہ تنخواہ کے فی الجملہ مساوی ہو۔ اس سلسلہ میں، کسی مخصوص سال کا واقعی مطالبہ معیار نہ بن سکتا تھا۔ اگر کوئی شخص، مثلاً ۵۰۰۰ ٹنگے سالانہ پانے کا مستحق ہو تو اسے اس قدر رقبہ کی جاگیر جس سے پچھلے سال 5000 ٹنکے وصول ہوئے ہوں دے دینا کافی نہ ہوگا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ رقم بالکل استثنائی رہی ہو۔ چنانچہ جہاں کہیں بھی جاگیرداری نظام رائج تھا، وہاں مواضعات اور پرگنوں سے سال بہ سال جاگیردار کو ہونے والی معیاری یا اوسط متوقع آمدنی کا کوئی نہ کوئی حساب اور اندراج ضرور رہتا ہوگا۔ حقیقت میں مستقبل میں ہونے والی آمدنی کی مالیت قائم کرنی ہوتی تھی تاکہ حکومت کے ذمہ مطالبات کو پورا کیا جا سکے۔ میں اس عمل اور اس کے اندراج کو تشخیص مالیت کی اصطلاح سے موسوم کرتا ہوں۔ ہمیں یہ تصور کرنا چاہیئے کہ وزارتِ مال کے پاس پرگنوں اور موضعوں کی ایک فہرست رہا کرتی تھی جس میں اس نقطۂ نگاہ سے ہر ایک کی مالیت درج رہتی تھی۔ جب کسی جاگیر کے دئے جانے کا حکم موصول ہوتا، تو وزارتِ مال کا یہ کام ہوتا کہ وہ اس فہرست سے ایک ایسے علاقہ کو تلاش کرے جس کی مالیت اس جاگیر کے مساوی ہو اسے اس کے دعویدار کے سپرد کردے۔

یہ ایک واضح امر ہے کہ انتظامیہ کی کامیابی، تشخیص مالیت کے کافی حد تک حقیقت کے مطابق ہونے پر منحصر تھی۔ آمدنی کا اندازہ اصل سے زیادہ ہونے کی صورت میں، اس کے دعویداروں کو مایوسی ہوتی تھی اور نتیجۃً ملازم طبقہ غیر مطمئن رہتا تھا۔ اس صورت کو ہندوستان کا کوئی بھی مسلم بادشاہ برداشت کرنے کا مقدور نہ رکھتا تھا۔ مالیت کے اندازہ کا اصل سے کم ہونا دعویداروں کے اطمینان کا موجب ہوتا، لیکن اس صورت میں حکومت کے وسائل

کے ضائع ہونے کا امکان تھا۔ پچھلی فصل میں گذر چکا ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں جاگیروں کے متعلق خیال تھا کہ ان سے آمدنی ان کی تخمینی مالیت سے زائد تھی۔ بالفاظ دیگر اس کے زمانہ میں تخمینی مالیت کا اصل سے کم ہونا عام تھا۔ فیروز تغلق نے اپنے عہد کے آغاز پر نئی مالیت قائم کرنے کا حکم دیا۔ اس کام پر چھ برس صرف ہوئے، عفیف، ۹۴، اور 5 3/4 کروڑ ٹنکوں کی میزان آئی مجھے سرگذشتوں میں مالیت کی عمومی تشخیص کا یہ پہلا اندراج ملتا ہے اس کے بعد ہمیں اس کے اندراجات عہدِ مغلیہ میں ملتے ہیں۔ اس دور کی انتظامی تحریروں میں یہ بہ کثرت موجود ہیں۔

فیروز تغلق نے اس مالیت کو اپنے پورے عہدِ حکومت میں قائم رکھا اور چونکہ اس مدت میں کاشت کی بعد توسیع ہوئی لہذا یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ واقعی آمدنی کے مسلّمہ مالیت سے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے عہدہ داروں کو زیادہ نفع پہنچا۔ تنہا یہی امر، شمس عفیف کے لیے جو ایک سرکاری عہدہ دار تھا اور بنیادی طور پر اپنے ہی ماحول پر نگاہ رکھتا تھا، اس عہد کی عام خوشحالی کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنے کا ایک بڑا سبب ہو سکتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ ضروری نہیں کہ اس کے کوئی بڑے مالی اثرات ظاہر ہوئے ہوں کیونکہ کاشت کے پھیلاؤ کے نتیجہ میں مرکز کو ادا کی جانے والی، محفوظ آمدنی، بھی بڑھی ہوگی۔ اس حقیقت کا بھی تھوڑا لحاظ رکھنا ہوگا کہ صدی کی دوسری چوتھائی میں علاءالدین کے ضابطوں کے ازخود ختم ہو جانے پر پیداواروں کی جو قیمتیں تھیں، ان کے مقابلہ میں اب قیمتوں کی سطح بہت نیچے آگئی تھی۔ شمس عفیف (ص ۲۹۳-۴) اس امر کو نمایاں کرتا ہے کہ مروجہ ارزانی، فیروز تغلق کے کسی عمل کی رہین منّت نہ تھی اور یہ کہ ہر چند فصلوں کے اعتبار سے قیمتیں کم و بیش ہوا کرتی تھیں مگر عام سطح نیچی ہی رہی۔ بہ الفاظ دیگر، افراطِ زر کے خاص اثرات اب زائل ہو گئے تھے اور توسیع کاشت کے باعث نقد مالگزاری میں اضافہ، پیداواری اضافہ کے تناسب سے کم تھا۔ مجموعی طور پر بہر حال یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہر طبقہ کے جاگیرداران مملکت کی خوشحالی سے کم از کم معقول مقدار میں مستفید ہو رہے تھے بلکہ ہم ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالباً ان کے لیے اب اپنے قابو کے کسانوں سے ناجائز نفع کمانے کی ترغیب معمول سے کم ہو گئی ہوگی۔ بہر حال امراء دولتمند ہو گئے (ص ۲۹۷)، اور انھوں نے کثیر ذخیرے جمع کر لیے۔ اس کے ساتھ ہم اب یہ بھی سننا شروع کرتے ہیں کہ لوگوں نے اپنے

مرنے کے وقت بہت مال و دولت چھوڑی ۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو مغلیہ عہدِ حکومت میں عمومیت اختیار کر لیتا ہے ۔

فیروز تغلق معافیوں کے معاملہ میں فیاض تھا۔ اس نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے پیشروؤں کی ضبط کیے ہوئے مالگزاری کی عطیوں کی ایک کثیر تعداد ان کے دعویداروں کو واپس کی اور اس نے اپنے عہد حکومت کے ابتدائی برسوں میں "ہر روز" دارالسلطنت میں موجود امیدواروں کے انبوہ کثیر کو نئے عطیے دئے ۔ مورخ 170 برس تک کی پرانی معافیوں کی بحالی کا ذکر کرتا ہے جو مملکت دہلی کے قیام کے قبل کا زمانہ ہے عبارت اس قدر پر ولولہ ہے کہ اس کے الفاظ کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی لیکن ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ فیروز تغلق اپنے پیشروؤں کی دی ہوئی معافیوں کی بحالی کے حق کو تسلیم کرتا تھا۔ اس نتیجہ کی تائید بادشاہ کے لکھے ہوئے تذکرہ کی عبارت سے ہوتی ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ اس نے ضبط کیے ہوئے عطیوں کے دعویداروں کو اپنی اپنی شہادتیں پیش کرنے کی ہدایت کی اور وعدہ کیا کہ انھیں ان کے حق کی زمین یا کوئی بھی دوسری چیز واپس ملے گی ۔ لہٰذا ہم اس عہد میں معافیوں کے حق ملکیت کے تصور سے بہت قریب ہو جاتے ہیں ۔ لیکن اس تصور پر پوری طرح عمل پیرا ہونا ممکن نہ تھا۔ مغلیہ عہدِ حکومت میں عطیوں کی من مانی ضبطی کے طریقہ کو پوری طرح اختیار کیا گیا۔

فیروز تغلق کے عہدِ حکومت میں ہم ہندو سرداروں کے متعلق جو درمیانی اشخاص کا دوسرا اہم طبقہ تھا بہت کم سنتے ہیں ۔ مسلسل امن وامان کے متعلق حتمی بیانات کے ساتھ ساتھ تعزیری مہموں کے اندراجات کی موجودگی سے ان کے انتظامیہ کے ساتھ معمولاً دوستانہ تعلقات کی نشاندہی ہوتی ہے ۔ لیکن مجھے ان کی حیثیت کو واضح کرنے والی کوئی تفصیل نہیں ملتی بجز دو سرداروں کے متعلق جو صوبہ اودھ کے تھے ۔ بنگال کی مہم کے سلسلہ میں اس صوبہ سے بادشاہ کے گذرتے وقت گورکھپور کا سردار (رائے) اور کھروسا کا سردار جو اپنی مالگزاری اودھ میں داخل کرتے تھے اور چند برسوں سے باغی ہو کر مالگزاری داخل کرنا بند کر چکے تھے ، ازراہِ اطاعت حاضرِ خدمت ہوئے (برنی 587) اور بیش قیمت نذرانے پیش کیے ۔ ساتھ ساتھ انھوں نے شاہی لشکر کے خزانہ میں "کئی لاکھ" ٹنکے پچھلے بقایہ کی مد میں داخل کیے ۔ انھوں نے مستقبل میں ادائیگی کا اقرار کر کے باضابطہ معاہدہ کیا اور اپنے علاقہ میں کئی منزل تک بادشاہ کے ہمرکاب رہے ۔ ان کی اطاعت گذاری کے صلہ میں

یہ حکم جاری کیا گیا کہ ان کا کوئی موضع نہ لوٹا جائے اور ان کے جو بھی جانور پکڑے گئے ہوں انھیں واپس کر دئے جائیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے اس عہد کا ایک مثالی واقعہ تصوّر کرنا مناسب ہوگا۔ محمد تغلق کے انتظامِ حکومت کے انتشار کے بعد جب سرداروں کو موقع ملا تو وہ باغی ہوگئے۔ لیکن شاہی فوج کے ان کے علاقوں میں پہنچ جانے پر جب دفاع ناممکن ہوگیا تو انھوں نے خوشی خوشی اطاعت قبول کرکے معاہدوں کی تجدید کی۔ ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ان کے مواضعات معمول کے مطابق تباہ کر دئے جاتے۔ یاد رہے کہ اگلے برسوں کی مقررہ مالگزاری کی ادائیگی کے واسطے معاہدے لکھوائے جاتے تھے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس عہد میں سرداروں کے ذمہ مالگزاری جیسا کہ کسانوں کے ساتھ کیا جاتا، ہر فصل کی پیداوار پر تشخیص نہ کی جاتی بلکہ یہ باج کے مثل ہوتی جس کی رقم، چند اگلے برسوں کے لیے گفت و شنید کے ذریعے طے کر دی جاتی۔

آخر میں، ہمیں فیروز تغلق کے کسانوں کے ساتھ سلوک پر غور کرنا ہے۔ مورخوں کی بدح سرائی کے مطابق، فیروز تغلق کا روّیہ بیشتر غیاث الدین کے روّیہ کے مانند تھا۔ انتظامیہ کا مقصد کاشت میں توسیع اور فصلوں کو ترقی دینا تھا اور ان مقاصد کے تحت انھیں لوگوں کے ساتھ انصاف کا سلوک کرنا ضروری تھا۔ عبارت آرائی کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایسی پالیسی پر فی الجملہ اس حد تک عمل کیا گیا کہ کاشتکاری میں توسیع اور دیہی خوشحالی میں اضافہ ہوا۔ لیکن فیروز تغلق نے آبپاشی کے ذرائع کی تعمیرات کرا کر زرعی ترقی کی روایات میں ایک نمایاں حصّہ لیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے بعض کا جزوی مقصد اس کے نئے تعمیر کیے ہوئے شہروں تک پہنچانا تھا۔ لیکن یہ امر کہ ان سے مواضعات کو بھی فائدہ پہنچا تھا، اس بیان سے واضح ہوتا ہے (عفیف، 130) کہ موسم برسات کے دوران افسروں کو یہ اطلاع فراہم کرنے کے لیے خاص طور پر مامور کیا جاتا کہ ہر نہر سے جو سیلاب پیدا ہوا وہ کہاں تک پھیلا اور سیلابی پانی کے دور تک پھیلنے کی اطلاع سے بادشاہ کو انتہائی مسرّت ہوتی تھی۔ پس نہریں قدرے ابتدائی نوعیت کی تھیں اور انھیں پنجاب کی موجودہ نہروں کے مثل تصوّر کرنا چاہیئے۔ لیکن اس بات پر سب متفق ہوں گے کہ ان نہروں سے ملک کو فائدہ پہنچا تھا۔ اسی مورخ کا بیان (ص 129) ہے کہ حصار کے نواحی علاقہ میں جہاں پہلے صرف فصل خریف کی کاشت تھی، نہروں کی مدد سے اب خریف اور ربیع دونوں فصلوں کی کاشت

کی جا سکتی تھی پیداوار میں اس اضافہ کی مالیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں دو لاکھ ٹنکوں کی مزید سالانہ آمدنی ہونے لگی تھی۔ پوری مملکت کی مالیت (۵ ½ کروڑ) کے مقابلہ میں یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ لیکن ایک ایسے محدود علاقہ کے لیے جہاں پانی فراہم کیا گیا تھا اس کی بیّن طور پر اہمیت تھی۔ اس آبپاشی کے محصول کی تشخیص سے کچھ دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں۔ سب سے پہلے، بادشاہ نے اس مسئلہ پر مفتیوں کی رائے طلب کی کہ کیا بادشاہ اپنے مصارف کے عوض کسی آمدنی کا حقدار ہو سکتا ہے جس کا جواب ملا کہ "پانی کا حق" (حقِ شرب) لینا جائز ہے۔ یہ اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے جو زمین کے قابض کے حق سے جداگانہ پانی کی فراہمی کے حق کو ظاہر کرتا ہے۔ مفتیوں نے اس حق کو "ایک بٹہ دس" غالباً پیداوار کا مقرر کیا اور بادشاہ نے اس کے مطابق تشخیص شروع کرائی۔ طریقۂ کار کے متعلق وقائع نگار کا بیان (عفیف ۱۳۰) بہت زیادہ اصطلاحی ہے اور اس کے مفہوم کے متعلق میں پوری طور سے مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن موجود مواضعات اور غیر مزروعہ علاقوں میں قائم کی ہوئی "نوآبادیوں" (اپنے موجودہ ہندوستانی مفہوم میں) کے درمیان بظاہر امتیاز قائم کیا گیا تھا۔ مواضعات سے حقِ شرب وصول کیا گیا اور اس رقم کو بشمول "نوآبادیوں" کی پوری مالگزاری کے تمام حسابات سے خارج کر کے ایک مخصوص خزانہ میں جمع کیا گیا جس کی آمدنی بادشاہ کے خیراتی اخراجات کے لیے محفوظ کر دی گئی۔

اس حساب کی تعبیر کرنے میں ایک دقت پیدا ہوتی ہے۔ کسانوں کے ذمہ مالگزاری کی تشخیص بذریعہ شراکت داری تھی۔ لہٰذ پانی کی فراہمی کے نتیجہ میں جب بھی پیداوار بڑھتی تو عام مطالبہ از خود بڑھ جاتا۔ پس بادی النظر میں کسی علیحدہ محصول کے عائد کیے جانے کا کوئی سبب نہ تھا۔ حقِ شرب کا دعویٰ اس واضح بنیاد پر تھا کہ بادشاہ اپنے مصارف کا معاوضہ پانے کا حقدار تھا۔ لیکن بذریعہ شراکت تشخیص کے طریقہ سے خود ہی کافی معاوضہ مل جاتا تھا۔ وقائع نگار نے اس نکتہ کی وضاحت نہیں کی ہے۔ لہٰذ ہمیں اس کی وضاحت وقت کے حالات میں تلاش کرنی چاہیئے۔ اوپر گذر چکا ہے کہ اس عہد کے دوران مالیت تبدیل نہیں کی گئی۔ لہٰذا آبپاشی سے جاگیرداروں کو فائدہ پہنچا ہوگا۔ حکومت محض صوبیداروں کے زیر انتظام محفوظ علاقوں سے بڑھے ہوئے نفع

پانے کی توقع کر سکتی تھی۔ صوبیداروں کی ان علاقوں پر اجارہ داری کی صورت میں یعنی جب انھیں صرف ایک مقررہ رقم خزانہ میں جمع کرنا ہوتا تو نہروں کا فائدہ انھیں کو پہنچتا اور بادشاہ محض ٹھیکوں پر نظرِ ثانی کے بعد ہی بڑھے ہوئے نفع سے مستفید ہو سکتا تھا۔ صوبیداروں کا جن شرائط کے ساتھ اپنے اپنے صوبوں پر قبضہ رہا کرتا وہ تحریروں میں درج نہیں ہے لیکن ان کی حیثیت کے متعلق جملہ ضمنی حوالے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صوبوں کے اجارہ دار تھے اور میرا خیال ہے کہ یہ وضاحت کم از کم ممکن الوقوع ضرور ہے۔

پانی کے مسئلہ پر مفتیوں سے رائے طلب کرنا کوئی تنہا واقعہ نہیں ہے۔ فیروز تغلق حکومت کے عام انتظامات میں اسلامی قانون کی پیروی کرنے کی کوشش کرتا تھا اور مالیات کے معاملہ میں خاص طور پر اس کا اصرار رہا کرتا تھا کہ کوئی بھی محصول اس وقت تک خزانہ میں وصول نہ کیا جائے جب تک کہ وہ بالکل جائز نہ ہو۔ اس اصول کے تحت اس نے جملہ متفرق محصولوں کو موقوف کر دیا۔ اس ضمن میں مندرج مثالیں بیشتر شہری محصولوں کی ہیں لیکن چراگاہی محصول کی شمولیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے احکام کا مقصد ان محصولوں سے مواضعات اور اور نیز شہروں کو سبکدوش کرنا تھا۔ اس کارروائی کا کوئی مستقل اثر نہ ظاہر ہوا کیونکہ اس نوعیت کے محاصل اوّلاً اکبر بعدہٗ اورنگ زیب کے عہد میں موقوف کئے جانے کے باوجود برطانوی عہد کے آغاز پر موجود تھے۔ لیکن ہم بہر حال یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ احکام وقتی طور پر موثر ثابت ہوئے یا کم از کم فیروز تغلق نے کسانوں کے بار کو مقررہ مطالبہ مالگزاری کے اندر محدود رکھنے کی کوشش کی۔

7 - خلاصہ

فیروز تغلق کی موت کے ساتھ ایک عہد ختم ہوا۔ چند برسوں کے عرصہ میں پوری مملکت منتشر ہو گئی اور پندرھویں صدی کے نصف اوّل میں ہندوستان میں کسی ایک غالب مسلم طاقت کا وجود نہ تھا۔ دکن اور خاندیش، گجرات اور مالوہ، بنگال اور جون پور خود مختار بادشاہتیں بن گئی تھیں۔ دہلی اور لاہور میں بعض اوقات اختلاف رہا کرتا اور فی الوقت کسی مالی منتظم کو پورے ملک کے اداروں پر اپنا اثر ڈالنے کا کوئی موقع حاصل نہ تھا۔

چودھویں صدی کو خیرباد کرنے کے قبل مناسب ہوگا کہ خلجی اور تغلق خاندان کے بادشاہوں کے تحت جس زرعی نظام نے نشو و نما پائی تھی اس کے خط و خال کو سرسری طور پر پیش کیا جائے۔

علاء الدین نے بادشاہ کا حصہ کسانوں کی پیداوار کے نصف پر مقرر کیا تھا۔ دوسرے بادشاہوں کے عہد میں اس تناسب کا تحریری اندراج نہیں ملتا۔ یہ غالباً زیادہ نہیں بلکہ کم رہا ہوگا۔ جہاں تک طریقۂ تشخیص کا مسئلہ ہے دو رجحانات پائے جاتے تھے ان میں سے ایک زیر کاشت رقبہ کے اور دوسرا کاٹی ہوئی فصل کے موافقت میں تھا۔ بادشاہ انفرادی طور پر ان میں کوئی ایک طریقہ منتخب کر لیتے تھے اور ان کے جاری کیے ہوئے احکام بلاشک ان کے براہِ راست زیرِ انتظام علاقوں میں مانے جاتے تھے۔ لیکن بیشتر رقبہ پر صوبیدار کا جو بعض اوقات بطریق اجارہ داری قابض تھے یا سرداروں کا جو اپنے داخلی امور میں آزاد تھے قابو تھا، اور یہ ایک عاجلانہ فیصلہ ہوگا کہ پوری مملکت میں ایک کلیتہً یکساں طریقہ کار رائج تھا۔ غالب تر خیال یہ ہے کہ تشخیص کے مختلف طریقے ساتھ ساتھ چلا کرتے جن کے رواج میں حالات کے لحاظ سے کمی و بیشی ہوتی رہتی۔ لیکن ان میں سے ایک دوسرے سے مکمل طور پر مغلوب نہ ہوتا۔ ہمیں جاگیروں کی موجودگی کو مقامی تنوع کا ایک بڑا سبب تصور کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان جاگیروں کے ساتھ کثیر تعداد میں ایسے اشخاص وابستہ رہا کرتے جو کسی مخصوص طریقۂ تشخیص پر عمل کرنے کے بجائے اپنے مطالبات کی وصولی میں منہمک رہا کرتے تھے۔ کسانوں سے معمولاً جس شکل میں مطالبات کیے جاتے وہ واضح الفاظ میں درج نہیں ہیں۔ لیکن یہ امر کہ علاء الدین نے خاص وجوہ کی بناء پر بعض علاقوں میں غلّہ کی شکل میں وصولیاں کرنے کا حکم دیا تھا ظاہر کرتا ہے کہ بہر حال نقدی کی وصولیاں عام تھیں۔ حالانکہ مثل دیگر معاملوں کے یہاں بھی منفرد سرداران اور جاگیرداران اپنے اپنے رجحانات کی پیروی کرتے رہے ہوں گے۔

ہم یہ اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس صدی کی تحریروں میں زمین کی ذاتی ملکیت (جیسا کہ "ملکیت" کا ان دنوں مفہوم ہے) کے ادارہ یا تصور کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی حق ملکیت کی تمام شکلیں، بادشاہ کی مرضی کے مطابق سرسری طریقہ پر قابلِ ضبطی تھیں اور بحیثیت سیرت اور مختلف نظریات رکھنے والے مطلق العنان بادشاہوں کے ایک سلسلہ کے موجودگی میں "بادشاہ کی مرضی" کے فقرہ کو اس کے لفظی مفہوم میں لینا چاہیئے۔

مذہبی اوقاف تک جو ملکیت کے موجودہ مفہوم سے قریب ترین مماثلت رکھتے ہیں، بیک جنبشِ قلم مسترد کئے جا سکتے تھے۔ معافیوں کے معاملہ میں فیروز تغلق کا عمومی رویّہ بلاشبہہ ایسا تھا گو کہ ان میں ملکیت کا حق نشوونما پا رہا تھا۔ لیکن اس نشوونما کو آنے والے ادوار میں پروان نہ چڑھنا تھا۔ جہاں تک کسانوں کا تعلق تھا ہندوؤں کے زمانہ کا یہ تصوّر کہ کاشتکاری کسی فرد کا حق نہیں، بلکہ حکومت کے تئیں ایک فرض تھا اب بھی قائم تھا اور اس کا مظاہرہ کبھی کبھی انتظامِ حکومت میں عملاً ظاہر ہوا کرتا تھا۔ سرداروں کی حیثیت کا معاملہ قانون سے زیادہ سیاست سے متعلق تھا۔ عام طور پر وہ مقررہ مالگزاری داخل کرنے کے بعد اپنے علاقۂ اختیار کی برقراری کی امید کر سکتے تھے۔ وہ جب مالگزاری نہ ادا کرتے یا بغاوت کرتے تو متنازعہ فیہہ مسئلہ کا فیصلہ حالات کے لحاظ سے بذریعہ طاقت یا حکمتِ عملی کیا جاتا۔

مواضعات کی اندرونی تنظیم کے متعلق، سرگذشتوں میں سکوت اختیار کیا گیا ہے اور اگر محض ان کی عبارت پر نگاہ رکھی جائے تو ان میں ایسا ایک واحد فقرہ بھی نہیں ملتا جو منظم موضع کے قسم کی کسی چیز کی نشاندہی کرے اس ضمن میں اس وقت تک عملاً جو کچھ بھی محفوظ ہے وہ محض چودھری کی بالائی آمدنیوں اور موضع کے محاسب (پٹواری) کے کاغذات کے اتفاقی حوالے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اس قسم کے ادارے موجود نہ تھے۔ اس کے بعد کے ادوار میں ہم انھیں قدامت کی مسلّمہ علامات کے ساتھ موجود پاتے ہیں۔ یہ ناقابل یقین ہے کہ درمیانی صدیوں میں وجود میں آئے ہوں گے اور بہرحال مسلمانوں کی فتح کے قبل سے ان کے مسلسل وجود پر شبہہ کرنے کے وجوہ نہیں پائے جاتے بہتر ہوگا کہ اس موضوع پر سرگذشتوں کے سکوت کی اسطور پر تعبیر نہ کی جائے گویا کہ منظم مواضعات موجود ہی نہ تھے بلکہ اسے اس امر کا مظہر تصوّر کیا جائے کہ اس عہد میں ان کے وجود سے کوئی اہم انتظامی مسئلہ نہ پیدا ہوتا تھا۔ مسلم انتظامیہ کا تعلق خاص طور پر سرداروں کے پیش کیے ہوئے مسائل سے تھا جن کا مقام اپنے حدودِ اختیار کے اندر کسانوں اور حکومت کے درمیان واقع تھا۔ ملک کے اس حصّہ کے رقبہ کا جو ان کے قبضہ میں رہنے دیا گیا تھا اندازہ لگانا مشکل تھا لیکن یہ رقبہ بلاشبہہ قابلِ لحاظ تھا۔ علاء الدین کے ضابطوں کے خاتمہ کے بعد جو پالیسی اختیار کی گئی اسے فی الجملہ سرداروں کے موافق تصوّر کیا جا سکتا ہے اور ادائے مالگزاری

کی صورت میں انھیں استحکام حاصل تھا اور مقامی با اختیار اشخاص کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے گئے۔ لیکن بظاہر کوئی بھی منفرد سردار کسی ایسے بادشاہ کے ہاتھوں جو انھیں بیدخل کرنے کے لیے کافی طاقت رکھتا ہو محفوظ نہ تھا۔

اس سوال پر کہ آیا کسانوں کو عملی طور پر اپنی اراضیات پر حقِ ملکیت کی ضمانت حاصل تھی جسے ان دنوں کامیاب زراعت کی ایک بنیادی شرط تصور کرتے ہیں اس دور کی تحریروں سے براہِ راست روشنی حاصل نہیں ہوتی۔ دریائی علاقہ کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں بھاگنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ ایک اکیلا واقعہ ہے اور کسی ایسی چیز کا جسے بیدخلی کہا جا سکے کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ بہرحال یہ ایک واضح امر ہے کہ فاضل زرخیز زمین موجود تھی جسے ایسے لوگوں کی ضرورت رہا کرتی جو اس پر کاشت کرنے کے لیے ضروری وسائل رکھتے ہوں۔ ان حالات میں بیدخلی کا سوال کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا کیونکہ حسنِ انتظام کا تقاضہ یہ تھا کہ کسانوں کو کام سے لگے رہنے دیا جائے اور توسیع اراضی میں ان کی مدد کی جائے۔ نہ ہی ان حالات میں لگان کی حد بندی کا متعلقہ سوال اٹھ سکتا تھا کیونکہ یہ فرض کرتے ہوئے کہ لگان ادا کرنے والے کاشتکار موجود تھے، انھیں اس امر کا یقین رہتا کہ ان کا دوسری جگہ خیر مقدم ہوگا۔ لہٰذا انھیں اس بات پر قدرت حاصل تھی کہ وہ غیر معقول مطالبات کو رد کر دیں فی الجملہ کسانوں کے صحیح حالات کے متعلق تحریری اندراجات بہت ہی کم ہیں۔ لیکن جس قدر بھی تحریروں میں آتا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ عام دنوں میں حالات اچھے خاصے مستحکم تھے۔ کسی موضع کے کسان کم و بیش اپنی ضرورت اور وسائل کے مطابق کاشت کیا کرتے اور اگر ان کے لگان دار ہوتے تو ان کے ساتھ وہ ایسے حسنِ سلوک سے پیش آتے جو انھیں اپنے کام پر لگا رہنے میں معاون ہوتا۔ ایک معقول حد میں اچھے موسم اور مناسب نظم و نسق کی موجودگی میں کوئی موضع اپنے مقررہ فرائض کو پورا کرتا رہتا تھا۔ فصل کی ناکامیابی یا جابرانہ انتظام حکومت سے باشندے وہاں سے بھاگ سکتے تھے۔ اس کے بعد جیسی بھی صورت ہوئی پرانے باشندے یا نئے آبادکار اس موضع کو دوبارہ آباد کر سکتے تھے اور پھر وہاں کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا۔

یہ نظریہ کہ زرخیز زمین کافی وسائل رکھنے والے لوگوں کی منتظر رہا کرتی تھی ان بادشاہوں کی زرعی پالیسی سے مکمل طور پر مصدق ہوتا ہے۔ جن کے فیصلے تحریروں میں درج ہیں۔

ان کا اوّلین مقصد کاشت کی توسیع اور ہر نئے کاشت لائے ہوئے کھیت سے مالگزاری میں فوری اضافہ کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے علاوہ انتظامی دباؤ کے دو طریقوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک حکومت کے جانب سے آبپاشی کے کام تھے تاکہ اسلامی قانون کے دلفریب طرزِ بیان کے مطابق "مردہ زمینوں" کو زندہ کیا جا سکے۔ سرگذشتوں کے بیان کی رو سے یہ تدبیر محض فیروز تغلق نے اختیار کی اور اسے دوبارہ عہدِ شاہجہانی کے قبل تک کوئی نمایاں حیثیت نہ حاصل ہوئی۔ دوسری تدبیر قرضوں کا منظور کیا جانا تھا جسے خاص طور پر محمد تغلق کی دریائی علاقہ کو بحال کرنے کی کوششوں کی بنیاد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن طرزِ بیان سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ یہ طریقہ پہلے سے رائج تھا۔ بلا تردد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ زرعی ترقی کی منظور شدہ پالیسی پر عمل کے لیے سرمایہ کی خاص ضرورت تھی۔ لیکن تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ مثل آنے والے زمانہ کے اس عہد میں بھی، سرکاری قرضہ کی تقسیم پر مامور عملہ ان رقموں کو غبن کرنے پر مائل رہا کرتا تھا۔ لہٰذا اس تدبیر کی عملی افادیت محدود تھی۔ ترقی کے دوسرے رخ یعنی فصلوں کی بہتری کے سلسلہ میں سرگذشتوں سے کسی کار روائی کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ سرکاری قرضوں اور انتظامی دباؤ کے اتحاد کے غالباً کچھ اثرات ظاہر ہوئے۔ لیکن اس راہ میں کسی ترقی کی ہمیں اطلاع نہیں ملتی۔ اس سلسلہ میں ہماری اطلاعات صرف بادشاہوں اور عہدہ داروں کے قابلِ تعریف اداروں تک محدود ہیں اور ان اداروں کی نتیجہ خیزی کے متعلق محض قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔

کیا ہے، یعنی یہ کہ یہ بادشاہ انتظام حکومت کے سلسلے میں اسلامی قانون کا پاس نہ کرتا تھا۔ یہ موضوع اس کے درجہ کے انسان کے لئے قطعاً اہم تھا لیکن ان ایّام میں جب بلبن مملکت پر حکمرانی کر رہا تھا اس کا اظہار زحمت کا موجب ہو سکتا تھا۔

7۔ برنی کی اطلاع ہے (صفحہ 248) کہ اس کا باپ صوبہ برن میں "نائب اور خواجہ" تھا۔ ان دونوں خواجہ کے فرائض بیان نہیں کئے گئے ہیں، لیکن نائب کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نائب صوبیدار یا صوبہ میں اس کا دوسرا مقام تھا اور وہ وہاں اتنے عرصہ تک ایسی حیثیت میں رہا کہ اس کے لڑکے کو عرفیت حاصل ہو گئی جس سے وہ معمولاً مشہور ہے۔ برنی ہمیں یہ نہیں خبر دیتا کہ خود اس کے پاس کون کون سے عہدے تھے، اس لیئے اس نے غالباً کبھی بھی کوئی زیادہ اونچا مقام حاصل نہیں کیا۔ لیکن ایک عبارت میں وہ بتاتا ہے کہ اس نے سترہ برس سے زیادہ مدّت تک دارالسلطنت میں محمد تغلق کی ملازمت کی۔

8۔ معاملہ کی نوعیت کے باعث ہمیں اس موضوع پر بہت تھوڑی اطلاع ملتی ہے۔ لیکن طبقاتِ ناصری (صفحہ 249) میں محفوظ زمینوں کے ایک مہتم کا ذکر صدی کے وسط کے قبل آتا ہے۔ لفظ خالصہ کے معنی "خالص" یا "آزاد" یس "بار سے آزاد" ہے اور وزارتِ مال میں اس کا اس خاص مفہوم میں استعمال ایک قدرتی بات ہوگی۔ لیکن "محفوظ" صحیح صورتحال کو زیادہ بہتر طور پر واضح کرتا ہے، کیونکہ کسی وقت بھی بعض زمین شاہی خزانہ کیلئے علیحدہ رکھی جاتی تھیں اور بقیہ جاگیروں میں دیدی جاتی تھیں۔ میرے خیال میں اس کا "کراؤن لینڈس" کا عام ترجمہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کیونکہ موجودہ استعمال میں اس فقرہ کے ساتھ دوام کا تصوّر وابستہ ہے جبکہ پورے مسلم دورِ حکومت میں یہ کوئی مستقل چیز نہ تھی، کیونکہ محفوظ زمین جاگیریں اور جاگیریں دی ہوئی زمین بادشاہ یا وزیر کی مرضی پر محفوظ کرلی جاتی تھی۔ ان دو زمروں میں تفریق تو ضرور مستقل تھی، لیکن کوئی بھی مخصوص علاقہ کسی وقت بھی، ایک زمرہ سے دوسرے میں تبدیل ہو سکتا تھا۔

9۔ بچی ہوئی آمدنی کے لئے "فواضل" کی اصطلاح آتی ہے (برنی، 194، 250 وغیرہ)

10۔ متن میں مندرج حالات کلیتہً برنی کی تصنیف (صفحہ 241 و مابعد) پر مبنی ہیں۔ اس نے اپنی ذاتی واقفیت سے لکھا ہے اور وہ علاءالدین کے بعض طریقوں کی تو شدّت سے مذمّت مگر اس کے بعض احکام کی تعریف کرتا ہے۔ ہم اسے، کم از کم بہ اعتبار نیت، اچھا خاصہ غیر جانب دار تصوّر کر سکتے ہیں۔ وہ جس شکل میں بادشاہ کے احکام کو پیش کرتا ہے، اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یا تو اس کی سرکاری تحریروں تک پہنچ تھی یا اس نے بعض اہم دستاویزوں کی نقول کو محفوظ کرلیا تھا۔ اس کی تحریر کا تاریخی سلسلہ دشوار طلب ہے، کیونکہ اکثر تاریخیں موجود نہیں ہیں اور اس کی تحریر ہمیشہ وقت کی ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ لیکن انھیں بغور مطالعہ کرنے کے بعد صحیح تاریخوں کا نہیں لیکن واقعات کے سلسلہ کا تعین ممکن ہو جاتا ہے۔

11۔ توثیق کے لئے برنی، صفحہ 248 اور ضبطی کے لئے صفحہ 283۔ ڈاوسن عبارت کا یوں ترجمہ کرتا ہے: مذہبی اوقاف اور نیز ذاتی معافیوں کی ضبطی بہت عجلت کے ساتھ "بیک جنبشِ قلم" عمل میں لائی گئی۔

12۔ اس عمل کے متعلق ایک عبارت کا ترجمہ ضمیمہ ج میں درج ہے جس میں برنی "ہندوؤں" کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہاں اور نیز دیگر مختلف عبارتوں میں جہاں یہ فقرہ درج ہے، سلسلۂ عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں کسان نہیں بلکہ اونچے طبقے ہیں۔ اس تصنیف کے مجموعی مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ برنی، مملکت کو دو عناصر پر نہیں بلکہ تین پر یعنی مسلم، ہندو اور "رعیت" یا کسان پر مشتمل تصور کرتا تھا۔ اس عبارت میں آگے آنے والی تفصیلات مظہر ہیں کہ زیر بحث مسئلہ اصلاً یہ تھا کہ دیہی سربراہوں، سرداروں اور پرگنوں اور مواضعات کے چودھریوں کی طاقت کو کیونکر ختم کیا جائے۔ واقعاتی طور پر یہ حکم اس اعتبار سے کہ اس کے تحت سربراہوں کو چھوٹے کسانوں کا مالی بوجھ برداشت کرنا ہوتا تھا، ان (موخرالذکر) کے موافق تھا اور کمزور، طاقتور کے بار کے ذمہ دار نہ تھے۔

13۔ اس حکم کی بدترین مثال کے لئے ملاحظہ ہو برنی، صفحہ 290۔ بیانہ کے قاضی نے یہ ایک اسلامی قانون قرار دیا تھا کہ ہندو کو مالگذاری کے محصل کا انتہائی احترام کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ "اگر محصل کسی ہندو کے منہ کے اندر تھوک دے تو اسے بلا عذر اپنا منہ کھول کر اسے قبول کر لینا چاہئے۔"

14۔ لفظ 'مطالبہ' کو ان حقوق کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے جنھیں حکومت واقعتہً طلب کرتی۔ یہ مالگذاری کے دوسرے مفہوموں سے مختلف ہے۔ مالگذاری کی مبہم اصلاح کا ضمیمہ میں تجزیہ کیا گیا ہے۔

15۔ برنی کا یہ مفہوم ہے (صفحہ 308) کہ بعض موسم ایسے ہوتے جو دہلی کے لئے بصورت دیگر قحط کی حیثیت رکھتے ہوں گے لیکن اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مبالغہ آرائی سے کام لے رہا ہے، لہذا مناسب ہوگا کہ ہم انہیں نظر انداز کر دیں۔ اس کے "قحط" کے دوسرے حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے لئے اس لفظ کا مفہوم پورے ملک میں پیداوار کی کمی کا نہیں بلکہ دہلی میں اشیائے خوردونوش کی قلت کا تھا اور ہم اس کے الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ اس عہد میں قحط اپنے عام مفہوم میں پیش آیا۔ حالانکہ بعض اوقات ایسے موسم آتے تھے جب علاءالدین کے ضابطوں کے نہ ہونے کی صورت میں، دارالسلطنت میں کافی سامان کی درآمد کی غرض سے قیمتوں کو بڑھانا ضروری ہوجاتا تھا۔

16۔ اس امر کی قطعی علامات ملتی ہیں کہ نظام کو بتدریج مکمل کیا گیا تھا۔ ابتداً بادشاہ سخت سزائیں نہ دینا چاہتا تھا (صفحہ 314) لیکن دوکاندار کم وزن کرنے کی اپنی پرانی عادت چھوڑنے پر تیار نہ تھے (صفحہ 318) یہاں تک کہ بالآخر یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ پکڑے جانے پر کمی کو فروشندہ کے جسم سے کاٹ کر پورا کیا جائے۔ پھر (صفحہ 319) اس سزا کے خوف سے دھوکہ دینا بند ہوا۔

17۔ برنی ان پیشہ ور تاجروں کو 'کاروانیاں' کہتا ہے۔ ہم انھیں بلا تردد بعد کے دنوں کے بنجارے تصور کر سکتے ہیں۔

ان تاجروں کو اپنی خوش معاملگی کی ضمانت کے طور پر اپنی بیویوں اور بچوں کو جمع کرنا پڑتا تھا۔ اور ان ضمانتوں کے معاملے، نواح دہلی میں ایک داروغہ کی نگرانی میں طے کئے جاتے تھے۔ (ص 306)

18۔ مالوہ اور نیز دہلی میں غلّہ کا ذخیرہ کئے جانے کا حکم تھا۔ لیکن برنی مالوہ کے کسانوں پر کسی بندش کا ذکر نہیں کرتا۔

19۔ برنی، 341، 365، 6۔ وہ علاءالدین کے طریقہ کا محمود غزنی کے طریقہ سے موازنہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محمود غزنی امیر خسرو ایسے شاعر کو ایک ملک یا صوبہ عطا کر سکتا تھا، لیکن علاءالدین نے اسے محض ایک ہزار تنکہ کی تنخواہ پیش کی۔

20۔ برنی (ص 381 و مابعد) ہی قطب الدین اور غیاث الدین کے دورِ حکومت کے لئے بھی ایک ہمعصر مصنّف کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ امرِ واقع ہے کہ وہ غیاث الدین کی اصلاحات کا بڑا مداح تھا لیکن اس کی سرگزشت انتہائی الجھی ہوئی اور غیر مربوط ہے۔ اس کی طرزِ تحریر سے میں اسے بادشاہ سے براہِ راست سنے ہوئے فقروں کی یادداشتوں کا یا اپنے حافظہ کی بنیاد پر مرتّب کیا ہوا ایک مجموعہ تصوّر کرتا ہوں۔ ضمیمہ ج میں اس کا ترجمہ دیا گیا ہے۔

21۔ ابن بطوطہ جو ہندوستان میں اگلے عہدِ حکومت میں موجود تھا ذکر کرتا ہے کہ (3) 112) صوبیداروں کا مالگذاری کا بقدر $\frac{1}{20}$ پانا معمولات میں تھا۔

22۔ PURCHAS HIS PILGRIMAGE طبع چہارم ص 996 میں میتھولڈ کا RELATIONS OF THE KINGDOM OF GOLCANDA، ملاحظہ ہو۔ مسولی پٹم کے ایک صوبیدار کو پوری رقم نہ ادا کرنے کی علّت میں بیٹھ، پیروں اور پیٹ پر بید سے اس قدر مارا گیا کہ وہ مر گیا۔"

23۔ ایشوری پرشاد، میڈیول انڈیا، ص 231۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، (3) 128 میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے۔

24۔ اس عہد کے متعلق برنی کا بیان ص 454 پر شروع ہوتا ہے۔ بادشاہ کے متعلق اس کے تبصرے ص ص 7 - 496، 504 پر ہیں۔ متن میں منقول ڈاؤسن کا بیان، ایلیٹ (3)، 235 پر ہے۔ ایشوری پرشاد کی تنقیدیں ان کی تصنیف "میڈیویل انڈیا" باب 10 خصوصاً ص ص 238، 260 کے حاشیوں میں درج ہیں۔ دوسرا ہمعصر ماخذ ابن بطوطہ، عہدِ حکومت کے بعض پہلوؤں پر بیحد دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے لیکن اس کی تحریر سے زرعی نظام پر بہت تھوڑی روشنی حاصل ہوتی ہے۔

25۔ برنی 487۔ اجارہ دار کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: مردکی بھنگری بھنگی خرافاتی۔ پہلے لفظ کے معنی "کاٹھ کا الّو" یا قابلِ حقارت شخص" اور آخری کے معنی "مہمل" یا احمقانہ ہے۔ بھنگری بھنگ کے نشہ کی عادت کو ظاہر کرتا ہے۔ میرے دوست مسٹر آر۔ پیگٹ ڈیوہرسٹ بھنگی کو ایک بے معنی بدل یا ہم صوتی لفظ بتاتے ہیں جس میں اس کے "مہتر" کے مفہوم کی ذو معنویت کے اشارہ کا بھی امکان پایا جاتا ہے۔ میں اس عبارت کا یہ مفہوم نہیں تصوّر کرتا کہ کسی مہتر ذات کے شخص کو ایک صوبہ کی اجارہ داری دی گئی تھی۔ لیکن اس تعبیر کو کلیتہً خارج از امکان نہیں کیا جا سکتا۔

آگے چل کر (ص 505) برنی، محمد تغلق کی رذیلوں، حجاموں، شراب فروشوں، باغبانوں، بنکروں وغیرہ کی سرپرستی کی بیجا شکایت کرتا ہے۔ انھیں اُمرا کا مساوی درجہ دیا گیا تھا اور وہ اونچے علاقتی عہدے اور صوبے پاتے تھے۔ لہٰذا کسی مہتر کی بولی کا قبول کرلیا جانا کلیتہً ناقابلِ قیاس نہیں ہے۔ لیکن غالباً اس لفظ کا مفہوم بجز ایک ہتک آمیز قافیہ بندی کے اور کچھ نہیں ہے۔

26۔ ابن بطوطہ کو اطلاع ملی تھی کہ پورا ملک دکن ایک ہندو کو 17 کروڑ کے اجارہ پر دیا گیا تھا [(4) 49] اور یہ کہ عدم ادائیگی کی علت میں اس کی کھال کھینچی گئی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ متن میں مندرج قصہ کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہو۔ لیکن پڑھنے سے یہ ایک مختلف واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

27۔ برنی 473۔ اضافہ کو 'یکے بہ دہ ویکے بہ بست' کہا گیا ہے۔ مسٹر ایشوری پرشاد کا اعتراض درست ہے (میڈیول انڈیا' 39 نوٹ 2) ڈاؤسن کا ''دس یا پانچ فیصدی زائد'' کا ترجمہ (ایلیٹ (3) 238) ظاہر ہونے والے نتیجہ واضح نہیں کرتا۔ ان کا یہ قول بھی درست ہے کہ ''دس یا بیس گنے'' کا متبادل ترجمہ بھی اگر اس کے لفظی معنی لیے جائیں تو خلاف معمول ہے۔ حقیقت یہ کہ یہ عبارت ریاضی کی رو سے نہیں بلکہ خطیبانہ انداز میں ہے۔ یہ ضیاء برنی کا ایک پسندیدہ طرزِ کلام ہے۔ وہ کسی عددی معنویت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے وقتی میلان کے تحت کبھی بڑھا کر اور کبھی گھٹا کر دس گنا، سوگنا اور ہزار گنا لکھتا ہے۔ ایسی عبارتوں میں جیسے کہ ص 30 پر جہاں ''ایک و سو کی نسبت'' میں اضافہ سے ناظرین کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں تحریر ہے یا ص 568 پر جہاں یہ درج ہے کہ آبپاشی کے نتیجہ میں مویشی ''ایک و ایک ہزار کی نسبت'' سے بڑھیں گے فیصدی کا تخیل خارج از بحث ہے۔ دیگر عبارتیں ص ص 84' 91' 109' 138' 294' 568' 394' 332' پر ہیں۔ یہ فہرست جامع نہیں ہے لیکن یہ ''بہت بڑا'' ''حیرت انگیز'' ''غیر معمولی طور پر بڑا'' یا کوئی اور مبالغہ آمیز فقرہ جو بہ اعتبارِ سیاق عبارت موزوں ہو' ان کے معنی کو غیر مشتبہ بنانے کے لیے کافی ہیں۔

28۔ برنی یہ نہیں لکھتا کہ دریائی علاقہ میں اس وقت اضافہ تشخیص کیونکر عمل میں لایا گیا' حالانکہ وہ اس عمل کے سلسلہ میں محصولوں کے عائد کیے جانے کا ذکر کرتا ہے۔ ایک بعد کی سرگذشت تاریخ مبارک شاہی' اسے پیمائش بتاتی ہے اور ایسا ناممکن نہیں ہے (اورینٹیل 318 5 ، فولیو 34 ر)

29۔ ابن بطوطہ 1334ء میں دہلی پہونچا [(3) 91' 144]۔ اس وقت بادشاہ قنوج میں تھا' جہاں وہ دریائی علاقہ کے پامال کیے جانے کے بعد پہونچا تھا۔ لہٰذا ایسا 1333ء میں پیش آیا۔

30۔ ابن بطوطہ کی فراہم کی ہوئی اطلاعات [(3) 338' 356] کی بنیاد پر بادشاہ کی واپسی کا سال تقریباً 1341ء تھا۔ وہ 1343ء میں خلیفہ کے سفیر کی آمد کے موقع پر دہلی میں موجود تھا (برنی' 492)۔ ابن بطوطہ نے 1324ء میں دہلی چھوڑ

دیا۔ اس کے بعد تاریخی سلسلہ کے لحاظ سے اس کی سرگذشت کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔

31۔ عفیف، 93۔ 4۔ یہ وقائع نگار پیشگی رقم کی میزان کو 2 کروڑ بتاتا ہے۔ برنی کی تقریباً 70 لاکھ کی عدد بظاہر پہلے دو برسوں کے لئے ہے اور بقیہ رقم بعد میں جاری کی گئی ہو گی۔ لیکن زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ عفیف کی تحریر کے قبل جو نصف صدی گذری اس میں روایات نے اس عدد کو بڑھا دیا۔

32۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا[(3) 161] میں اس عبارت کا یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ فصل کو باری باری سے تبدیل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن میں اس کا ٹھیک وہی مفہوم لیتا ہوں جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہے یعنی یہ کہ گھٹیا فصلوں کی جگہ بہتر فصلوں کی کاشت ہونی چاہئے۔

33۔ 'مسالک الابصار' مصنفہ شہاب الدین۔ میں نے اس تصنیف کی اصل تحریر نہیں دیکھی ہے اور میں ایلیٹ (3) 573 و صفحات مابعد میں مندرج اقتباسات کا حوالہ دے رہا ہوں۔ میرا قیاس ہے کہ "قصبات و مواضعات" کی عبارت میں "قصبات" کے امکانی معنی "پرگنات" ہو سکتے ہیں۔

34۔ ملاحظہ ہو خاص طور پر (3) 400۔ 402 جہاں ابن بطوطہ اور اس کے ساتھیوں کے لئے مقررہ تنخواہوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو مناسب جاگیر دی گئی تھی۔

35۔ غالباً یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ایک واقعی کمزور بادشاہ مملکت کو چالیس برسوں تک متحد نہ رکھ سکتا تھا لیکن فیروز کو شروع ہی سے خانجہاں مقبول ایسے غیر معمولی طاقت اور وفاداری کے وزیر کی خدمات حاصل رہیں۔ اس کا لڑکا اس کے بعد وزیر ہوا۔ یہ بھی ایک طاقتور اور (بیشتر مدت تک) وفادار وزیر تھا اور یہ دونوں شخص واضح طور پر پورے عہد حکومت میں انتظام حکومت کے لئے قوت کا سرمایہ بنے رہے اور زوال خان جہاں ثانی کے بعد شروع ہوا۔

36۔ برنی 571۔ عفیف، 94۔ ان عبارتوں کا ترجمہ اور ان پر بحث ضمیمہ ج میں آئی ہے۔

37۔ ڈاؤسن کے کئے ہوئے بادشاہ کے تذکرہ کے ترجمہ میں (ایلیٹ (3) 377) اس فقرہ سے جس طور پر مجھے تھوڑے عرصہ کے لئے غلط فہمی ہو گئی تھی ممکن ہے کہ بعض دوسرے مصنفین کو بھی ہوئی ہو۔ فقرہ یہ ہے "مزروعہ زمینوں سے خراج یا دسواں حصہ"۔ فقرہ کے الفاظ جیسے ہیں اس سے "دسواں" خراج کا مترادف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اصل تحریر سے صاف واضح ہے کہ اسے خراج کا متبادل سمجھنا چاہئے۔ یہ باب اوّل میں واضح کئے ہوئے اسلامی قانون کے بنیادی قاعدوں کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے۔ بادشاہ مالگذاری کے جائز وسائل کا شمار کر رہا ہے "اوّل خراج، عشر اور زکوٰۃ بعدہٗ جزیہ، وغیرہ"۔

38۔ عفیف، 268۔ اس عہد میں صوبیداران ہر سال بادشاہ کو آداب بجالانے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ اس موقع پر

پیش کئے گئے نذرانوں (خدمتی) میں بیشتر غلام ہوتے تھے۔ فیروز ان کی بڑی قدر کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے اس نے 180،000 غلام جمع کر لئے تھے۔ (ص 279)۔

39۔ برنی '574' کا بیان ہے کہ بادشاہ کے احکام کے تحت صوبوں میں کاشت شروع ہوئی اور اس میں بے حد اضافہ ہوا۔ عفیف '295' کا بیان ہے کہ دریائی علاقہ میں ایک موضع بھی بغیر کاشت کے نہ رہا اور صوبوں میں "ہر کردہ (½ 1 میل) میں چار مزروعہ مواضعات تھے"۔ دونوں مصنفین کی تحریر میں مبالغہ ہے۔ لیکن ہم بلا تامل یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ بمقابلہ پچھلے عہد کے کاشتکاری میں بہت ترقی ہوئی۔ ایک بعد کی عبارت (عفیف، 321) میں اس سے زیادہ اطمینان بخش شہادت ملتی ہے۔ اس میں شکار کے لئے روہیلکھنڈ کے ایک بڑے علاقہ کو مخصوص کرنے کا ذکر آتا ہے۔ کاشتکاری کی توسیع نے شکار کے حصوں میں کمی کر دی تھی اور یہ علاقہ محفوظ نہ کر لیا گیا ہوتا تو کہا جاتا ہے کہ یہ علاقہ بھی بقیہ مملکت کے طرح کاشت میں آ جاتا۔

40۔ عفیف، '454'455'۔ نائب صوبیداران صورتوں میں مقرر کیا جاتا جب صوبیدار کے پاس کوئی درباری عہدہ بھی ہوتا۔

41۔ عفیف برابر انھیں الفاظ میں فوجیوں کے مواضعات کا ذکر کرتا ہے جن میں عام جاگیروں کا اور جس طریقہ پر گجرات میں فوج کو دوبارہ منظم کیا گیا' اس کے متعلق اس کے بیان (ص 220) کا یہ مفہوم ہے کہ فوجیوں کا اپنی رسد کی فراہمی کے لئے انحصار وزارتِ مال پر نہیں بلکہ اپنے مواضعات پر رہا کرتا تھا۔ ڈاؤسن [ایلیٹ، (3)، 346] نے دستاویزات (اطلاق) کے متعلق عبارت (ص 206) کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ فوجوں کو تنخواہ دینے کے تین طریقے تھے (ا) جاگیر (ب) نقد (ج) اطلاق۔ دوسری طرف اور رائن [امپرئل گزیٹیر (2) 365] ا اور ج کو ایک ہی تصور کرتا ہے۔ لیکن اس کے الفاظ میں قدرے بے اعتمادی معلوم ہوتی ہے۔ یہ عبارت اس قدر گنجلک ہے کہ میں اس موضوع پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔

42۔ برنی 558 فتوحات مطابق ایلیٹ (3) 386 اور اورینٹل 2039 ورق 304 ج

43۔ بدایہ مترجمہ سی ہملٹن (4) 147 طامس نے اپنی تصنیف CHRONICLES OF THE PATHAN KING OF DELHI صفحہ 271 حاشیہ میں تشخیص کو مصارف کا دسواں حصہ بیان کیا ہے لیکن مجھے اس میں شک معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے مفتی اس تخیل سے جو سود خوری سے اس قدر قریب تھا متفق رہے ہوں گے معمولی صورتوں میں حق شرب کے حساب کے طریقے کی مجھے کوئی سند نہیں مل سکی۔

44۔ فتوحات مطابق ایلیٹ (3) 377 'اورنٹل 2039 'فولیو 300 ر کے۔

45۔ لگان داروں کے مواضعات میں رہنے نگران کی دیہی برادری کے سمولیت کے مسئلہ پر باب 6 میں بحث آئی ہے۔ مجھے کوئی ایسی شہادت نہیں ملی جس سے یہ ظاہر ہو کہ چودہویں صدی میں ایسے لگان دار موجود تھے۔

باب 3

سیّد اور افغان سلطانوں کے خاندان

ا۔ فیروز سے بابر تک (1526-1388ء)

پندرہویں صدی کے نصف اوّل میں دہلی پر کچھ عرصہ کے لئے فیروز کے ورثاء اور پھر سیّد سلطانوں کے چند روزہ خاندان کی حکومت رہی۔ اس زمانہ کے لئے واحد ہمعصر ماخذ جو مجھے مل سکا تاریخ مبارک شاہی ہے۔ یہ اس صدی کے تقریباً نصف میں لکھی گئی تھی۔ اس کے مندرجات سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف زرعی موضوعات سے دلچسپی نہ رکھتا تھا اور وہ ان کے متعلق بہت ہی کم لکھتا ہے۔ لیکن یہ بھی بہت ممکن ہے کہ اس موضوع پر لکھنے کے لئے مواد ہی بہت کم رہا ہو۔ اب بادشاہت چھوٹی ہوگئی تھی اور اس کے گھٹے ہوئے حدود میں شاہی اقتدار کمزور تھا۔ ہندو سردار خود مختاری کے خواہاں تھے۔ اور مسلم صوبیداروں میں نافرمانی کا میلان پایا جاتا تھا۔ سرگزشت کا بیشتر حصّہ مالگذاری کی وصول اور باغیوں اور بقایہ داروں کے سرکوبی کے مقصد سے شاہی مہموں کے بیان پر مشتمل ہے اور یہ ایک قابل توجہ حقیقت ہے کہ ان مہموں میں صوبیداروں اور سرداروں کے ساتھ قریب قریب مساوی سلوک کیا جاتا تھا۔ بادشاہ گوالیار کے طرف کوچ کرتا ہے۔ سرداران جیسی بھی صورت ہو، مقررّہ مالگذاری ادا کرتے یا نہیں کرتے ہیں۔ پھر وہ بدایوں کے جانب فوج کشی کرتا ہے۔ صوبیدار یا تو اپنے معاملات کرنے کے لئے حاضر ہوتا ہے یا بصورت دیگر اپنے کو قلعے کے اندر محصور کرلیتا ہے اور باغی شمار کیا جاتا ہے۔ یہ حالات فی الوقت اٹھارہویں صدی میں پیش آنے والے حالات سے مشابہ تھے جبکہ جملہ استحقاق اور حدود اختیار، تعلق "ماتحت علاقہ" یعنی وہ علاقہ جس پر کسی فرد واحد خواہ وہ صوبیدار ہو یا جاگیردار، مستاجر ہو سردار کا واقعی اقتدار ہوتا، میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔

ان حالات میں اس کا بہت کم امکان تھا کہ زرعی اصلاح شروع کی گئی ہو اور اس کے نفاذ کا اس سے بھی کم امکان تھا۔ حالات، طریقہ تشخیص اور وصولی کی گوناگونی کے لئے ساز گار تھے اور امکانات اس کے ہیں کہ ہر فرد بیشتر اپنے صوابدید کے مطابق کسانوں سے سلوک کرتا تھا۔ ہم قیاس کرسکتے ہیں کہ شراکتداری یا پیمائش کی جگہ اجتماعی تشخیص نے رواج پایا کیونکہ یہ مروجہ رواج کے زیادہ موافق تھی۔ لیکن اس موضوع پر ہمارے پاس صحیح معلومات نہیں ہیں۔ چند ضمنی حوالوں[44] سے واضح ہوتا ہے کہ جاگیریں دی جاتی تھیں اور عملاً یہی وہ واحد قطعی اطلاع ہے جو ہمیں دستیاب ہوسکی۔

1451ء میں سید بادشاہوں کے بجائے لودیوں کے افغان خاندان نے لی اور دہلی کی سابقہ حیثیت کچھ کچھ بحال ہونا شروع ہوئی۔ جنوبی بادشاہتوں کی خودمختاری تو برقرار رہی لیکن افغانوں کی طاقت مشرق کی طرف بڑھی اور 1493ء میں جونپور کی آخری فتح کے بعد یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ شمالی ہندوستان پر ان کا تسلط قایم ہوگیا۔ مجھے لودی خاندان کے بادشاہوں کے متعلق کوئی ہمعصر ماخذ نہ مل سکا اور بعد کی تحریریں[45] متعدد اعتبار سے ناقابل اطمینان ہیں۔ لیکن ان سے واضح ہوتا ہے کہ جاگیرداری[*] اس عہد کا اہم ترین زرعی ادارہ تھا اور اس نے اب وہ شکل اختیار کرلی تھی جس سے ہم عہد مغلیہ میں مانوس ہیں یعنی یہ کہ جاگیردار پر محض وفاداری اور ذاتی خدمات ہی کی پابندی نہ تھی بلکہ شاہی ضروریات کے لئے جاگیر کی آمدنی سے اسے فوج کا ایک دستہ بھی رکھنا ہوتا تھا۔ لہذا بمقابلہ فیروز کے عہد کے جاگیروں کی تعداد اب کم لیکن انفرادی طور پر ان کا رقبہ زیادہ وسیع ہوگیا۔ اس خاندان کے بانی بہلول نے بظاہر اپنی بادشاہت کی بنیاد قطعی طور پر اسی ادارہ پر رکھی تھی۔ یہ جاگیروں کی پیشکش[46] ہی تھی جس نے اس کی اصل طاقت کے سرچشمہ یعنی افغانی سرداروں کو ہندوستان آنے کے طرف متوجہ کیا۔ بڑے جاگیرداروں سے انھیں شرائط پر چھوٹے چھوٹے لوگوں کو رکھنے کی توقع کی جاتی تھی۔ اور جب کہ کچھ زمین بادشاہ کے لئے محاصل فراہم کرنے کے لئے محفوظ رکھی جاتی، اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ مملکت کے ایک بہت بڑے حصہ کا انتظام تنخواہ دار عملہ کے بجائے جاگیرداروں کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔

افغانی عہدہ داروں کے اپنی جاگیروں کے تئیں رویّہ کو ہم اس واقعہ سے اخذ کرسکتے ہیں کہ ایک موقع پر انھوں نے ان کو موروثی تصور کئے جانے کا دعویٰ پیش کیا[47]۔ لیکن بادشاہ نے ذاتی جائداد جس کی تقسیم قانون وراثت کے تحت ہوتی ہے اور عوامی عہدوں اور جاگیروں، جن میں کوئی مستقل یا عارضی حق نہیں ہوتا ہے، کے درمیان ایک واضح امتیاز پر اصرار کیا۔ بہر حال اس امتیاز کے تحت تحریری اندراجات اس بیان کی تائید کرتے ہیں کہ افغان جاگیرداروں کو ان کی سپردگی میں دی گئی زمین اور کسانوں

کے انتظامی معاملات میں تقریباً پوری آزادی حاصل تھی۔ ایسی صورت میں، اس عہد میں عمومی احکامات کے سلسلہ میں وقائع نگاروں کے سکوت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا واحد حکم جو میری نظر سے گذرا ہے، وہ سرکاری مطالبہ کو غلہ کی شکل میں وصول کرنے کے متعلق ابراہیم لودی کا حکم تھا۔[6]

اس حکم کے اسباب اور اس کی مدت قدرے توجہ کی مستحق ہیں۔ وقائع نگار اسے مسلسل اچھی فصلوں کے ماتحت قیمتوں کی ارزانی سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن ایسا سوچنے کے وجوہ پائے جاتے ہیں کہ قیمتی دھاتوں کی قلت ایک فیصلہ کن عنصر تھا۔ ہماری اطلاع ہے کہ مروجہ ارزانی کا اثر محض زرعی پیداوار ہی پر نہیں بلکہ ہر قسم کی تجارتی اشیاء پر ظاہر ہوا اور "سونا و چاندی بڑی دقت سے قابلِ حصول تھے" اور یہ کہنے کا کہ بیش قیمت دھاتوں کی قیمتیں بڑھ گئی تھیں یہ محض ایک متبادل طریقہ ہے۔ ان بیانات کی ایک امکانی تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس دور میں تجارت کی رفتار شمالی ہندوستان میں یہاں کی طلب پوری کرنے کے لئے کافی مقدار میں بیش قیمت دھاتیں لانے کے لئے سازگار نہ تھی جو اس خطہ کی مستقل خصوصیات میں ہے۔ ضروری مقدار میں صرف گجرات اور بنگال کی بندرگاہوں سے گذر کر حاصل کی جا سکتی تھی۔ ان دونوں علاقوں کے دہلی حکومت کے ماتحت ہونے کی صورت میں آزادی کے ساتھ تجارت ہو سکتی تھی اور اس کے علاوہ نقد کی شکل میں مالگذاری ملک کے اندرونی حصہ میں پہونچ سکتی تھی۔ یہ علاقے جب خود مختار ہو جاتے اور راستہ میں بدامنی کے باعث، دہلی سے منقطع ہو جاتے تو مالگذاری کی آمد بند ہو جاتی اور تجارت میں لازمی رخنہ پڑتا۔ اس وقت دہلی کا تعلق ایک صدی یا اس سے زائد مدت سے ساحل سے منقطع ہو چکا تھا اور بیش قیمت دھاتوں کی گھٹتی ہوئی رسد کا مجموعی اثر اہم رہا ہوگا۔ مذکورہ حکم کب تک نافذ رہا غیر یقینی ہے۔ جیسا کہ اگلے باب میں آئے گا، ہمارے علم میں ہے کہ عہدِ اکبری کی ابتدا میں نقد وصولیوں کا قاعدہ تھا۔ لیکن ہمیں یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس قاعدہ کو دوبارہ کب سے جاری کیا گیا۔

اس وقت جاگیرداروں کو وصولی کے برخلاف، تشخیص کے معاملہ میں کم از کم عملی اعتبار سے بظاہر طور پر اختیار حاصل تھا۔ نو عمر افغان، مزید خاں کی کارروائیوں کو جو چند برسوں بعد مغلوں کو بھگا کر شیر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا کسی اور نظریہ کی بنیاد پر سمجھنا ممکن نہیں۔ لودی بادشاہوں میں سے کسی ایک کے عہد میں یعنی 1526ء سے کچھ قبل، مزید خاں کو اپنے باپ کی جاگیر کے دو پرگنوں کے انتظام پر مامور کیا گیا تھا۔ اس نے منصفانہ انتظام کے ذریعہ ان پرگنوں کی خوشحالی کو بڑھانے کا کام شروع کیا۔[7] اس نے کچھ زمینوں پر کسانوں کو اور کچھ پر سرداروں کو قابض پایا۔ کسانوں کو وہ خوشحالی کو بڑھانے کا صحیح

سرچشمہ اور سرداروں کو خطرہ کا سبب تصوّر کرتا تھا۔

اس نے سب سے پہلے سرکاری مطالبہ کے طریقۂ تشخیص کے متعلق کسانوں کو انتخاب کا حق دیا۔[8] یہ بات اہم ہے کہ اس مسئلہ پر ان میں اتفاق رائے نہ تھا۔ بعض طریق پیمائش اور بعض بہ طریق شرکت داری ادائیگی کے خواہاں تھے اور مزید نے انھیں ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ اس کا فیصلہ کرنے کے بعد اس کا دوسرا قدم کسانوں کو چودھریوں یا پرگنہ کے سربراہ اور مقدّم (جو اب قطعی طور پر کسی موضع کے سربراہ کے نام کو ظاہر کرنے والی مخصوص اصطلاح ہو چکی تھی) کی جبری وصولیوں سے محفوظ کرنا تھا۔ پچھلے باب میں گذر چکا ہے کہ علاؤالدین کا مقصد اس نوعیت کی جبری وصولی کو جس کے باعث طاقتور افراد کا بار کمزور برداشت کرتے تھے، روکنا تھا۔ اسی طور پر فرید نے ان سربراہوں سے کہا کہ وہ ان کے کسانوں پر کئے جانے والے مظالم اور ان کی زائد وصولیوں سے واقف ہے اور ان بدعنوانیوں کو روکنے کی غرض سے اس نے تشخیص کے سلسلہ کی ادائیگیوں کو خواہ وہ زمین کو ناپنے کا معاوضہ ہو یا پیداوار کی مقدار کو معین اور وصول کرنے کا معاوضہ، مقرر کردیا۔ اگر اس سلسلہ میں ہم وقائع نگار پر جو اپنے ممدوح سے طویل تقریریں منسوب کرنے کا بیحد عادی ہے، اعتماد کریں تو فرید نے مزید اس پالیسی کا اعلان کیا جسے اختیار کرنے کا وہ ارادہ رکھتا تھا۔ چودھریوں کو معینہ معاوضہ کے اندر سختی کے ساتھ محدود رکھنا تھا۔ مالگذاری کی ادائیگی فصل بہ فصل پابندی کے ساتھ ضروری تھی۔ تشخیص میں ہرچندیہ کہ زیر کاشت رقبہ کی بنیاد پر کی جاتی، پیداوار کی مقدار کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ لیکن معقول مطالبہ کے ایک بار متعین ہو جانے کے بعد اسے سختی سے وصول کرتے تھے۔ ان معاملات کو طے کرنے کے بعد اس نے کسانوں کو تحریری دستاویزوں کے ساتھ جن میں ان کی اراضی کے حقوق درج تھے رخصت کر دیا۔

لیکن بعض مواضعات "باغی" تھے، یعنی وہ جاگیردار کے اقتدار کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان سے نپٹنے کے لئے فرید نے ایک مقامی فوج بھرتی کرکے باغی موضعوں کو لوٹا اور جب تک کہ چودھریوں نے اطاعت قبول کر کے مستقبل میں ان کی بدچلنی کی ذمہ داری قبول نہ کرلی اس نے وہاں کے باشندوں کو محصور رکھا۔ بعض باغی سرداروں کے معاملہ میں اس کی کاروائی اس سے بھی زیادہ سخت تھی کیونکہ اس نے ان کی پیشکش کو غیر مخلصانہ تصوّر کرتے ہوئے مسترد کر دیا اور لوگوں کو قتل کرکے ان کے کنبوں کو غلام بناکر اور لوٹے ہوئے مواضعات میں دوسرے لوگوں کو بسا کر باغیوں کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔ ہماری اطلاع ہے کہ ان واقعات کے نتیجہ میں بغاوت فرو ہو گئی، پرگنے تیزی کے ساتھ

بحال ہوئے اور ایک اعلیٰ منتظم کی حیثیت سے فرید کی دور دور تک شہرت ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد، خاندانی جھگڑوں کا اس کی پوزیشن پر برا اثر پڑا اور اپنے سوتیلے بھائی کے حق میں موقوف کئے جانے کے بعد، وہ ابراہیم لودی کے دربار میں اپنا مقدمہ آزمانے کی غرض سے آگرہ چلا گیا۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ فرید خاں جس صورتحال سے دوچار ہوا وہ اپنے جملہ اجزا کے اعتبار سے چودھویں صدی کے حالات سے مشابہ تھی۔ جہاں تک کسانوں کا تعلق تھا، ان پر اپنی پیداوار کے ایک جزو کو بادشاہ یا اس کے نمائندہ کو دینے کی بنیادی ذمہ داری تھی اور اسے پورا نہ کرنا یا اس سے منکر ہونا بغاوت تصور کیا جاتا تھا۔ طریقۂ تشخیص کا فیصلہ بااختیار افراد کے ہاتھ میں تھا اور اس معاملہ میں ابھی تک قطعیت نہ حاصل ہوئی تھی۔ چودھویں صدی میں دو مکتب خیال پائے جاتے تھے۔ ایک جمع کی ہوئی پیداوار پر اور دوسرا زیر کاشت رقبہ پر تشخیص کو ترجیح دیتا تھا۔ سولھویں صدی میں ان کے اصطلاحی نام تبدیل ہو چکے تھے، لیکن ان دونوں طریقوں میں کشمکش چل رہی تھی۔ ایک چھوٹے خطہ تک میں کسانوں کا نقطۂ نگاہ مختلف رہا کرتا۔ مگر خود فرید واضح طور پر معقول پسند انسان تھا اور اس نے دونوں طریقوں کو ساتھ ساتھ چلنے دیا۔ اس نے بہرحال یہ محسوس کیا کہ زیر کاشت رقبہ پر تشخیص پیداوار سے کلیتہً صرف نظر کرتے ہوئے نہیں کی جا سکتی۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، غیاث الدین تغلق نے اس نقص کو اس طریقۂ تشخیص کے لئے مہلک تصور کیا تھا۔ فرید کا چونکہ ایک چھوٹے علاقہ سے تعلق تھا اور وہ اس عمل کی ذاتی نگرانی کرنے کا مقدور رکھتا تھا، لہذا وہ ضروری گنجائشوں کا لحاظ کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس کے انتظام میں بظاہر دو احد جدّت دستاویزوں کا لکھا جانا ہے۔ مجھے چودھویں صدی میں ان دستاویزوں کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ وہ اس وقت اور اس کے قبل کی مدت میں لکھے جاتے ہوں۔ یہاں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے معروف دستاویزات یعنی پٹہ جیسے بااختیار حکام عطا کرتے تھے اور کسان کی ذمہ داری کا قرار یعنی قبولیت کم از کم اس قدر قدیم ہیں جس قدر کہ سولھویں صدی اور ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ قدیم ہوں۔

سرداروں کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ مثل چودھویں صدی کے سولھویں صدی میں بھی ان کی حیثیت کسانوں اور مرکزی اقتدار کے مابین درمیانیوں کی تھی اور جہاں یہ موجود ہوتے وہاں جاگیردار کو اپنی آمدنی کسانوں سے نہیں بلکہ ان سے وصول کرنا ہوتا تھا۔ مزید خاں کی کاروائیوں سے واضح ہوتا ہے کہ جاگیردار عملاً انتظامیہ کے جملہ اختیارات کو استعمال کر سکتا تھا۔ اسے اپنے سرکش بقایہ داروں پر جبر کرنے کے لئے صوبیدار یا کسی اور عہدہ دار سے درخواست نہ کرنا ہوتا تھا۔ بلکہ وہ اپنے صرف پر جمع

کی ہوئی فوج کے ذریعہ ان پر خود جبر کرتا تھا اور جن صورتوں میں وہ مناسب خیال کرتا ان کے حقوق کو اس وقت کا غالباً واحد موثر طریقہ اختیار کر کے یعنی حقداروں کو قتل اور ان کے کنبہ کو غلام بنا کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا کرتا تھا حقیقت میں جاگیردار بادشاہ کے سونپے ہوئے اختیارات کو عملاً اس طور پر استعمال کر سکتا تھا گویا وہ خود بادشاہ ہے۔

بس اس مرحلہ پر فرید خاں ہمارے سامنے ایک زرعی مصلح کی حیثیت میں نمودار نہیں ہوتا۔ اس نے اسی نظام پر کام کیا جو پہلے سے موجود تھا اور قریبی ذاتی نگرانی کے ذریعہ اس کا بہترین مصرف لیا۔ اس کی کامیابی کے متعلق وقائع نگار کی یقین دہانی کو قبول کر لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہوگا کہ کامیابی کا سبب فرید خاں کی ذات تھی نہ کہ وہ طریقہ۔ اپنی موقوفی کے بیس برس بعد تک یہ شخص دوسری نوعیت کے کاموں میں معروف رہا۔ اس کے بعد ہماری اس سے ملاقات ہندوستان کے بادشاہ شیر شاہ کی حیثیت میں ہوتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے سابقہ تجربہ کی بنیاد پر ملکی انتظامات کی از سر نو تنظیم میں معروف تھا۔ اس کے تعمیری کاموں کی طرف متوجہ ہونے کے قبل لودی عہد کے متعلق چند باتوں کو مختصراً بیان کرنا مناسب ہوگا۔

ہمیں کوئی ایسی اطلاع نہیں ملتی جس سے واضح ہو کہ اس عہد میں پیداوار کا کون سا حصہ بطور مالگذاری طلب کیا جاتا تھا۔ بادی النظر میں یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ افغان حکمران اور ان کے جاگیردار جس قدر وصول کیا جا سکتا تھا اس سے کم پر قناعت کرتے رہے ہوں گے لیکن غالباً ان کا مطالبہ تبدیل ہوتی ہوئی قوت نافذہ کے اعتبار سے کم و بیش ہوتا رہتا تھا۔ اس سلسلہ میں تنوع کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی سند کی غیر موجودگی میں یہ مسئلہ فیصلہ طلب رہتا ہے۔ کچھ عرصہ تک مالگذاری کی نقدی وصولی جاری رہی لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، سولہویں صدی کی ابتداء میں غلہ کی وصولی کا قاعدہ بنا دیا گیا تھا۔ جاگیروں کے حق ملکیت کی شرائط کے متعلق کچھ تفصیلات ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جاگیروں کی نامزدگی سے اگر ان میں چھوٹی معافیاں یا اوقاف شامل ہوتے تو ان کے لئے دقتیں پیدا ہوئی تھیں۔ سکندر لودی نے اس امر کے متعلق عمومی احکام صادر کئے کہ جاگیروں کے لئے اس نوعیت[9] کے موجودہ حقوق کا لحاظ کرنا لازمی ہے۔ اسی عبارت میں آتا ہے کہ جاگیرداروں کے حسابات وزارت مال میں رسمی ضابطوں کی پابندی یا کسی دقت کے بغیر طے کئے جاتے تھے۔ ساتھ ساتھ ہماری یہ بھی اطلاع [ذ (۹) 453] ہے کہ جاگیرداروں کو اپنی جاگیر کی تحریری مالیت سے زائد وصولیوں پر تصرف کی اجازت تھی۔ اس موخر الذکر معاملہ میں، مروجہ طریقۂ کار بمقابلہ اس طریقہ کے جو مملکتِ مغلیہ میں رائج تھا، جاگیروں کے لئے زیادہ سازگار تھا۔ مملکت

مغلیہ میں، جیسا کہ آگے آئے گا، حکومت زائد و صوبیوں کی دعویدار ہوتی تھی۔ جاگیروں کے علاوہ اس عہد میں علما، درویشوں یا بادشاہ پر کسی قسم کا حق رکھنے والوں کی گذر اوقات کے لئے معافیوں کی منظوری کا عام رواج تھا [(4)، 450]۔ یہ معافیاں عام طور پر نسبتاً چھوٹی ہوتی تھیں۔ ان کی مجموعی مالیت کے متعلق محض قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ لیکن معافیوں اور جاگیروں کو یکجا کرنے کے بعد اس میں کوئی شک نہیں کہ افغانی بادشاہت کی بیشتر مالگذاری دوسروں کے نام منتقل تھی اور یہ کہ کسان کے اصل آقا جاگیردار ہی تھے۔

ایک قدرے اہم عبارت [(4) 414] قابلِ توجہ رہ جاتی ہے۔ شیر شاہ کے پیمائش کو عام قاعدہ بنانے کے بیان کے سلسلہ میں وقائع نگار کہتا ہے کہ "اس کے زمانہ کے قبل زمین کی پیمائش کا رواج نہ تھا بلکہ ہر پرگنہ میں ایک قانونگو رہتا تھا جس سے پرگنہ کی سابقہ، موجودہ اور مستقبل کی امکانی حالت کا پتہ چلاتے تھے"۔ بہ اعتبارِ وقت، یہ قانونگو کا بحیثیت ایک مقامی عہدہ دار کے جو اپنے پرگنہ کی تشخیص کے لئے ضروری معلومات فراہم کرتا تھا، پہلا ذکر ہے جو مجھے دستیاب ہو سکا۔ لیکن اسے یہاں ایک ایسے ادارہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو پہلے سے قائم ہو اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ اس کا عہدہ مسلمانوں کی فتح سے قبل قائم تھا۔ اس ضمن میں اس کے ذکر سے اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ شیر شاہ کے عہد کے قبل مطالبۂ مالگذاری کا تعین منفرد کسانوں پر نہیں بلکہ معمولاً ایک پورے موضع یا پرگنہ پر کیا جاتا تھا۔ پس یہ عبارت اجتماعی تشخیص یا اجارہ داری یا دونوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ ان طریقوں کا ایک اہم جزو، قانونگو کی فراہم کی ہوئی وہ مقامی اطلاعات تھیں جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی موضع نے پہلے کیا ادا کیا اور یہ کہ اس کی تشخیص کے سلسلہ میں اب کن نئے امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔ جہاں تک ہمارا علم ہے، وہ علیحدہ علیحدہ ہر کسان کے متعلق ان اطلاعات کو فراہم کرنے کا مقدور نہ رکھتا تھا (جو غالباً پٹواری کے فرائض میں شامل رہا ہوگا)۔ قانونگو کی ان اطلاعات کی فراہمی سے اس امر کا ثبوت تو نہیں مگر یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ اس وقت انفرادی تشخیص کے رواج کے ساتھ ساتھ جو کبھی بھی کلیتہً ختم نہ ہوا تھا یا کم از کم ہر عارضی غیر موجودگی کے بعد دوبارہ نمودار ہو جایا کرتا تھا، اجتماعی تشخیص زیرِ عمل تھی۔ پس، غالباً ان میں سے ایک یا دونوں طریقے زیرِ بحث دور کی خصوصیات میں سے تھے۔ لیکن اس سلسلہ میں قطعی شہادت مفقود ہے۔

ممکن ہے کہ آئین [(1)، 296] کے ایک جملہ سے جس میں ضمناً ذکر آیا ہے کہ شیر شاہ کے عہد میں ہندوستان غلہ بخشی (ایک مشتبہ لفظ) سے گذر کر ضبط پر پہونچا، صحیح صورتحال کا سراغ ملتا ہو۔ بلاکین

نے لفظ کو مقطعی چھاپا ہے۔ مجھے اس قسم کا کوئی لفظ نہ تو لغت میں اور نہ ہی دیگر تحریروں میں ملا لیکن اسی مادّہ سے مشتق الفاظ کو بعض صورتوں میں "جاگیر" اور بعض صورتوں میں "اجارہ داری" کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور ہم اس عبارت کا ترجمہ "شراکتداری اور جاگیرداری سے" یا "شراکتداری یا اجارہ داری سے" کے طور پر کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کے صحیح مفہوم پر اس وقت تک پردہ پڑا رہے گا جب تک کہ اسی سیاق میں اس لفظ کے دوسرے استعمال علم میں نہ آئیں۔

2۔ شیر شاہ اور اس کے جانشین (1555-1541ء)

فی الوقت مغلیہ عہد کے قبل کے غیر مستحکم دور کو چھوڑتے ہوئے ہم شیر شاہ پر پہنچتے ہیں جو مسلم ہندوستان کا ایک ممتاز منتظم اور ایسا واحد حکمران تھا جس کے بارے میں اطلاع ہے کہ اس نے حکومت حاصل کرنے کے قبل، کسانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے انتظام کا عملی تجربہ حاصل کرلیا تھا۔ اس کی انتظامی کارروائیوں کے متعلق معلومات کا واحد مأخذ، عباس سروانی کی سرگذشت ہے جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے۔ لیکن آئینِ اکبری کے ایک باب سے اس مأخذ کی تائید اور اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ سرگذشت[1] بجائے خود ایک اچھی خاصی تصنیف ہے۔ لیکن اس کے قلمی نسخوں میں بہت فرق پایا جاتا ہے اور جہاں تک میری اطلاع ہے، ابھی تک اس کے قطعی متن کے تعین کے جانب کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔

شیر شاہ نے جس انتظامی اکائی کو تسلیم کیا وہ موجود پرگنے تھے۔ ان میں سے ہر ایک، دو عہدہ داروں یعنی شقدار اور امین[1] کے تحت معہ ایک خزانچی اور محرّروں (کارکنوں) کے رکھا گیا، جبکہ نگرانی کے خیال سے پرگنوں کو ملاکر ضلعے بنائے گئے جنھیں اب سرکار کا نام دیا گیا۔ نظامِ حکومت کا عام رویہ ان ہدایات سے واضح ہوتا ہے کہ جو ضلع کے افسران کو دی گئیں یعنی یہ کہ "اگر لوگ لاقانونیت یا باغیانہ ارادہ سے مالگذاری کی وصولی کے سلسلہ میں کوئی رخنہ پیدا کریں تو انھیں سزا اور سرزنش کے ذریعے اس طور پر نیست و نابود اور برباد کرنا چاہئیے کہ ان کی شرارت اور سرکشی سے دوسرے متاثر نہ ہوں"۔ یہاں بیّن طور پر انھیں اصولوں کو دہرایا گیا ہے جن پر اپنی باپ کی جاگیر کے دنوں میں شیر شاہ کا عمل تھا۔ لیکن طریقۂ تشخیص کے سلسلہ میں اب بادشاہ کے خیالات تبدیل ہو گئے تھے۔ بحیثیت ایک منتظم کے اس نے کسانوں کو اپنی پسند کے طریقہ کو منتخب کرنے کا حق دیا تھا، لیکن بحیثیت بادشاہ کے اس نے تقریباً اپنی پوری مملکت میں پیمائش کے طریقہ کو نافذ کیا اور متعدد عبارتوں

سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے عہدہ داروں کے متعلق فیصلے اس طریقہ کے کامیاب عملدر آمد پر منحصر رہتے۔ چنانچہ پنجاب کی پہاڑیوں میں صوبیدار کا تسلّط اس قدر مستحکم تھا کہ کوئی بھی شخص اس کی مخالفت میں سانس لینے کی جرأت نہ کرتا تھا اور وہ پہاڑی باشندوں سے زمین کی پیمائش کے طریقہ پر مالگذاری وصول کرتا تھا اور سنبھل (روہیلکھنڈ) کے صوبیدار نے "اس علاقہ کے شورہ پشت زمینداروں (سرداروں) کو بزور تلوار اس درجہ عاجز اور مغلوب کر رکھا تھا کہ وہ اپنے جنگلوں کو کاٹنے کا حکم دیئے جانے پر بھی سرتابی نہ کرتے تھے..... اور اس نے ان کی چوری اور راہزنی کی روک تھام کر کے ان سے توبہ کرایا اور انھوں نے بطریق پیمائش خطۂ شہر میں اپنی مالگذاری جمع کی"۔

چنانچہ پیمائش کے طریقہ کو ان علاقوں میں بھی نافذ کیا گیا جو سرکشی کے لئے مشہور تھے اور اس کے نفاذ سے مستثنیٰ تحریروں میں مندرج واحد سرزمین، دور افتادہ ملتان کا نواحی علاقہ تھا جہاں بدامنی سے بے حد نقصان پہنچتا تھا اور جس پر تسلّط ہونے سے بادشاہ کو خصوصی مسرّت حاصل ہوئی تھی۔ یہاں صوبیدار کے لئے علاقہ آباد کرنے، مقامی رواجوں کی پابندی کرنے اور پیداوار کے صرف ایک چہارم کو بطور مالگذاری وصول کرنے کے احکام تھے۔ حالات یقینی طور پر اس علاقہ میں استثنا برتے جانے کے موافق تھے اور ممکن ہے کہ دوسری جگہوں پر بھی استثنا برتا گیا ہو، حالانکہ ایسا تحریروں میں درج نہیں ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طریقۂ پیمائش محض نظری طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر بھی ایک عام ضابطہ کا درجہ رکھتا تھا۔

اس مسئلہ پر کہ پیداوار کے کس حصہ پر تشخیص کی شرحیں مبنی ہونی چاہیئے، مأخذ تاریخ ایک دقّت پیش کرتی ہے۔ انگریزی ترجمہ آتا ہے کہ ایک حصہ کاشتکار کو اور نصف چودھری کو غالباً حکومت کے نمائندہ کی حیثیت سے دینا چاہیئے اور اس سے ایک تہائی حصہ کا مفہوم ہوا۔ لیکن یہ فقرہ ان مخطوطات میں سے کسی ایک میں بھی جو میری نظر سے گذرے ہیں نہیں ملتا۔ اگر صرف یہی فرق ہوتا تو اسے کسی قسم کی سہو کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا تھا۔ لیکن آئینِ اکبریؒ کے ایک باب سے، اس مسئلہ کا آخری فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس میں شیر شاہ کی تشخیص کی شرح کے دستور کو نقل کیا گیا ہے جس سے ان شرحوں کے حساب کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ چند مخصوص پیداواروں، خصوصاً سبزیوں کے لئے نقدی شرحیں معین کی گئی تھیں جو درج نہیں ہیں۔ لیکن جملہ اہم پیداواروں کے لئے، "اچھی" "درمیانی" اور "خراب" حاصل فی بیگھہ کی میزان کے ایک تہائی کو "اوسط پیداوار" (محصول) شمار کرتے تھے اور اس کا ایک تہائی مطالبۂ مالگذاری کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔ ایک واحد مثال کا بیان کرنا کافی ہو گا۔ گیہوں

کے متعلق تصور کرلیا گیا تھا یا حساب لگایا گیا تھا کہ اس کی (اچھی) پیداوار 18 من (درمیانی) 12 اور (خراب) 8 من 35 سیر تھی۔ ان اعداد کی میزان کو 3 سے تقسیم کرنے پر اوسط پیداوار 38-13 آتی ہے لیکن اسے 12 من 38 سیر تصور کرلیا گیا اور گیہوں کے ہر بیگھہ پر مالگذاری کا مطالبہ اس کا ایک تہائی یعنی 4 من 12 سیر تھا۔ مجھے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے یہ واضح ہو کہ کسان سے مطالبہ غلّہ میں وصول کیا جاتا تھا یا حکومت کی مقررہ شرحوں کے مطابق نقد میں۔ جیسا کہ پچھلی فصل میں وضاحت آئی ہے، ہم جانتے ہیں کہ لودیوں کے عہد کے دوران غلّہ میں وصولی کا طریقہ دوبارہ نافذ کیا گیا تھا، جبکہ عہدِ اکبری کے اوائل میں نقد وصولی کا عام قاعدہ تھا۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ یہ تبدیلی کب عمل میں آئی۔

اس دستورِ شرح کی تحقیقات کرتے وقت ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ جن اکائیوں میں انھیں ظاہر کیا گیا ہے وہ غیر یقینی ہیں۔ اسے آئین میں محض ایک تاریخی دلچسپی رکھنے والے دستاویز کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات بہت بعید از قیاس ہے کہ ابوالفضل نے اسے اکبری بیگھہ اور من میں جنھیں مذکورہ اکائیوں کو مسترد کر کے بالآخر رائج کیا گیا تھا، تحویل کرنے کی زحمت گوارا کی ہوگی۔ آئین [(1)، 296] سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ شیر شاہ کی عہدِ حکومت میں سکندر لودی کی پیمائشی اکائی مستعمل تھی اور ہم اس اکائی اور اکبری اکائی کی درمیانی نسبت سے بھی واقف ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایسا قطعی طور پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ دستور سکندری بیگھوں میں ہے۔ لیکن مجھے کوئی ایسی سند نہیں ملی جس سے قطعی طور پر یہ واضح ہوتا ہو کہ اس وقت وزن کی کون سی اکائی مستعمل تھی۔ لہٰذا ہم ان دستوروں کو شیر شاہ کے عہد میں زمین کی شرح پیداوار معین کرنے میں استعمال نہیں کرسکتے۔ لیکن ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اکائیاں جو بھی رہی ہوں، شرحوں کی معقولیت کا فیصلہ اولاً پیداوار کے معیاروں اور ثانیاً اس رقبہ سے کیا جانا چاہیئے جس پر انھیں نافذ کیا گیا۔

پہلے نکتہ کے سلسلہ میں یاد رہے کہ "اچھی" "درمیانی" اور "خراب" کی اصطلاحیں کسی اصولی امتیاز پر نہیں بلکہ عام تجربہ پر مبنی ہیں۔ عملی واقفیت اور تجربہ رکھنے والے اشخاص اس طریقہ کو اختیار کر کے صحیح اوسط سے تقریباً بہت ہی قریبی ہندسہ پر پہونچ سکتے تھے۔ ناواقف اشخاص حقیقت سے بہت دور جاسکتے تھے۔ قابلِ تحریر صرف یہ امر ہے کہ شیر شاہ جو اپنی مملکت کا تفصیلی انتظام کرتا تھا، کوئی ایک احمق انسان نہ تھا اور اسے کم از کم اپنی مملکت کے ایک مخصوص گوشہ کی زراعت کے متعلق عملی واقفیت تھی۔ دوسرے نکتہ کے متعلق یہ امر غیر یقینی ہے کہ آیا اس دستور کا ابتداً اطلاق پوری مملکت پر تھا یا یہ کہ یہ ان متعدد مقامی دستوروں میں سے ایک تھا جسے بعد میں اکبر کے عہد میں عام

اطلاق کے لئے منتخب کیا گیا۔ جیسا کہ اگلے باب میں ذکر آئے گا، یہ عام اطلاق میں ناکامیاب رہا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ شیر شاہ کے محض پانچ سالہ عہدِ حکومت کے دوران قائم رہا ہو اور اس کی سیرت میں اس تخیل کے متناقض کوئی بات نہیں ملتی کہ اس نے پوری مملکت میں ایک عمومی دستور نافذ کیا ہو۔ تشخیص کے سلسلہ میں کارروائی کے علاوہ، شیر شاہ نے بظاہر مروجہ نظام میں کوئی بڑی تبدیلی نہ کی۔ جیسا کہ ہمیں متعدد ضمنی حوالوں[16] سے معلوم ہوتا ہے جاگیروں کی منظوری جاری رہی اور ان کے شرائط میں کسی تبدیلی کا اشارہ نہیں ملتا اور مالیت کے سلسلہ میں آگے چل کر اکبر جس قسم کی دقتوں سے دوچار ہوا ان کے ظاہر ہونے کے لئے اس کا عہدِ حکومت غالباً بہت مختصر تھا۔ شیر شاہ کی موت کے بعد کے دس برس انتشار کا زمانہ تھا۔ لہٰذا ہم قدرتی طور پر اس مدت میں مالی انتظام کے متعلق بہت کم سنتے ہیں۔ اطلاعوں کے مطابق اسلام شاہ نے جاگیروں کی جگہ نقد تنخواہیں جاری کیں اور جاگیروں کے تمام پچھلے ضابطوں کو موقوف کر دیا۔[17] لیکن اس کے جلد ہی بعد ہم اسے اپنے بھائی کو اپنے لئے جاگیریں پسند کرنے کا اختیار دیتے ہوئے اور نقدی وظیفوں کو زمین کی معافیوں میں تبدیل کرتا ہوا پاتے ہیں۔ اس طور پر ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ پالیسی میں کوئی مستقل تبدیلی کی گئی اور غالباً اس کے اس عمل کا مقصد محض ایسے بااثر لوگوں پر اور زیادہ قابو حاصل کرنا تھا جن پر اعتماد نہ کرنے کے وجوہ تھے۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات قابلِ تحریر نہیں ہے اور ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سوائے اس صورت میں کہ شیر شاہ کے نظام کے خلاف کوئی حکم صادر کیا گیا ہو، وزارتِ مال جو اب دیوان نہیں، بلکہ دیوانی کہی جاتی تھی اس علاقہ میں جو اب مملکت کا حصہ تھا اسی نظام کو چلاتی رہی۔

میری رائے میں یہ فرض کرنا غلط ہوگا کہ فتوحات بجائے خود اس مستقل ادارہ کو زیادہ متاثر کرتی تھیں۔ ایک غارتگر کے برخلاف، فاتح کا خاص مقصد مفتوحہ علاقہ سے مالگذاری کا وصول کرنا ہوتا ہے اور ایسا کرنے کی غرض سے اُسے ابتداً تشخیص اور وصولی کی موجودہ مشینری پر بھروسہ کرنا ہوتا تھا۔ کسی فتح کا فوری اثر یہ ہو سکتا تھا کہ ایک طرف بعض جاگیرداروں کی جگہ دوسرے جاگیردار آجائیں اور نظام جاگیرداری برقرار رہے اور دوسری طرف وزارت کو ایک نیا آقا مل جاتا تھا اور جب وہ احکام صادر کرتا ان کی تعمیل کی جاتی۔ اس کے نئے احکام نہ جاری کرنے کی صورت میں وزارت غالباً تازہ ترین احکام کی پیروی کرتی اور ان کی تعبیر محکمہ جاتی روایات کی روشنی میں کرتی، مگر کسی باضابطہ سند کے بغیر ان احکام میں کوئی تبدیلی نہ کرتی۔ چودھویں صدی میں غیاث الدین تغلق یا سولھویں صدی میں شیر شاہ ایسے طاقتور بادشاہ اپنے عہد کا افتتاح نئے طریقوں کو رائج کر کے

کر سکتے تھے جبکہ ان سے مختلف قسم کے فاتحین مروّجہ نظام ہی کو قبول کرنے پر قناعت کیا کرتے۔ لہٰذا جہاں کسی تبدیلی کی تحریر نہ ہو، وہاں انتظامی تسلسل کو قیاس کرنا مناسب ہوگا۔ لیکن اب ہم جس عہد میں داخل ہو رہے ہیں، اس میں قیاس آرائی کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے کہ اکبر نے شیر شاہ کے طریقوں کو اختیار کر کے اپنا عہد شروع کیا اور انھیں صرف اس وقت تبدیل کیا جب وہ قطعی طور پر ناکامیاب ہو گئے۔

باب 3

حوالہ جات

1۔ اس سرگذشت کے بیشتر حصہ کا ترجمہ ایلیٹ (4) صفحہ وما بعد میں موجود ہے۔ میں نے ایلیٹ کے مخطوطہ کو جو ایب اورینٹل 1673 کا ایک جزو ہے' اورینٹل 5318 سے جو ستر ہویں۔ اٹھارہویں صدی سے منسوب کیا جاتا ہے موازنہ کرنے کے بعد استعمال کیا ہے۔ ایلیٹ کے مخطوطہ کی خالی جگہیں جن کا ڈاؤسن نے ذکر کیا ہے اس کی اس ابتدائی نقل میں بھی موجود ہیں اور دونوں کو ایک ہی ماخذ تصوّر کرنا چاہئے جہاں تک میں نے دیکھا ہے دونوں میں فرق صرف کتابت کی ان غلطیوں کا ہے جو ڈاؤسن کے نقل نویس سے سرزد ہوئیں' جیسا کہ ڈاؤسن کی تحریر ہے کہ اسکا مخطوطہ "خوش خط مگر غلطیوں سے بھرا ہوا ہے"۔

2۔ مثلاً ہماری اطلاع ہے کہ (ایلیٹ (5) 71' 75) سیّد بادشاہوں کے زمانہ میں لودی خاندان کے پاس مختلف جاگیریں تھیں۔

3۔ تاریخ داؤدی عہد جہانگیری میں' تاریخ سلاطین متاخر عہد اکبری میں تحریر ہوئیں اور مخزن افغانی 1612ء میں مکمل ہوئی۔ اوّل الذکر دو کے لئے میرا انحصار ایلیٹ (4) (5) میں مندرج ان کے ترجمہ پر ہے۔ آخر الذکر کے لئے بھی میں نے ڈورن (DORN) کے ترجمہ 'ہسٹری آف دی افغانس' اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی مخطوطہ (مارلے) سے جسے ڈورن نے استعمال کیا ہے' استفادہ کیا ہے۔

4۔ ایلیٹ (4)' 308-10۔ محفوظ زمین کی موجوگی 'ایضاً (4) 410' (5) 75 سے ظاہر ہوتی ہے۔

5۔ ایلیٹ (4) 327۔

6۔ ایلیٹ (4) 476۔

* جاگیر۔ مورلینڈ نے انگریزی متن میں لفظ 'ASSIGNMENT' (تفویض) استعمال کیا ہے۔ مغل عہد میں اس قسم کی تفویضات کے لئے جاگیر کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی لیکن دلی سلطنت کے عہد میں یہ اصطلاح غیر معروف تھی۔ یہاں میں نے لفظ جاگیر اس کے اصطلاحی معنوں کے بجائے اردو کے عام فہم معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اسی رعایت سے جہاں۔ 'ASSIGNEE' لفظ آیا ہے اس کا میں نے جاگیر دار ترجمہ کیا ہے جبکہ اس عہد میں اس کے لئے مقطی وغیرہ کے

الفاظ کا استعمال تھا۔ از مترجم)

7۔ مزید کی کاروائیوں کو تاریخ شیر شاہی [ایلیٹ (4)' 312] میں بیان کیا گیا ہے۔ جیساکہ ڈاوسن نے بیان کیا ہے اس کی سرگذشت غیر واضح ہے۔ جن قلمی نسخوں کو میں نے دیکھا ہے وہ سب گھٹیا درجہ کے ہیں لیکن وہ اس عبارت کے ایلیٹ کے ترجمہ کی تائید کرتے ہیں۔ اس کی صحیح تاریخ غیر یقینی ہے۔ فرید کے ہاتھ سے ابراہیم کے عہد (26 – 1517ء) میں انتظام کا کام نکل گیا۔ لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ وہ کتنے عرصہ تک اس پر قابض رہا اور اس کی ابتدائی کاروائیاں سکندر کے زمانہ کی ہو سکتی ہیں۔

8۔ تشخیص کے مختلف طریقوں کے اب ہمیں نئے نام ملتے ہیں پیمائش کو 'جریب' اور شرالکنداری کو 'قسمت غلہ' کہا گیا ہے۔ اس تحریر کا بیان پروفیسر قانونگو کی تصنیف 'شیر شاہ' (کلکتہ' 1921ء) کے بیان سے بعض باتوں میں مختلف ہے۔ اختلافات کی وضاحت جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی' 1926ء صـ447 وما بعد پر ملتی ہے۔

9۔ ایلیٹ (4)' 447 ' 8 ۔ چھوٹی معافیوں اور اوقاف کے لئے 'ملک' اور وظیفہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے دوسرے زمانوں میں' وظیفہ سے عام طور پر مراد وہ وظیفہ تھا جو نقد ادا کیا جائے۔

10۔ سرگذشت کے اہم حصے (مترجمہ' ای۔سی۔بیلی) ایلیٹ (4) میں ملتے ہیں قلمی نسخوں کی حالت کے لئے ملاحظہ ہو صـ302۔ اس کے کسی مطبوعہ نسخہ کا مجھے علم نہیں ہیں نے جن قلمی نسخوں کی جانچ کی ہے وہ برٹش میوزیم کا اورینٹل 1782 اور انڈیا آفس کا ایتھے 219 اور ایک اردو نسخہ (ایتھے 220) ہیں یہ سب ایک سلسلہ کے معلوم ہوتے ہیں اور ان میں ترجمہ کے چند اہم حصے حذف کر دئے گئے ہیں۔ واضح طور پر یہ تمام لاپرواہی سے تیار کی ہوئیں نقلیں ہیں جن غیر معروف مخطوطوں پر مترجم نے اعتبار کیا ہے ان کے بالمقابل میں مذکورہ قلمی نسخوں کی سند کا مدعی نہیں ہوں۔

11۔ ایلیٹ (4)' 413 ۔ شقدار کی اصطلاح سے بیّن طور پر ایک شق کا عہدہ ایک پچھلے عہد میں کبھی کبھی اس سے پرگنہ کے ایک مجموعہ کا مفہوم لیا جاتا تھا' منتظم مراد نہیں ہے۔ اس عہد میں یہ اصطلاح تسلسل کے ساتھ ایک واحد پرگنہ کے عہدہ دار مال کے خواہ وہ سرکاری ملازم ہو یا جاگیردار مصداق ہے۔ اپنے افسران ضلع کو شیر شاہ نے "شقداروں کے شقدار" کا لقب دیا تھا جسے ترجمہ میں "چیف شقدار" کہا گیا ہے۔ "امین" ان تمام قلمی نسخوں میں جن کی میں نے جانچ کی ہے ملتا ہے اور واضح طور پر موزوں ہے۔ "امیر" کی مختلف خواندگی جو ترجمہ میں ملتی ہے بعید از قیاس ہے اور میرا اندازہ ہے کہ ترجمہ کے مخطوطہ (جس کا میں پتہ نہ چلا سکا) میں 'ن' کو سہواً 'ر' پڑھ لیا گیا ہے۔

12۔ ایلیٹ (4) 415 ' 416 ۔

13۔ ایلیٹ (4) 399 ۔ مخزن افغانی' انڈیا آفس (ایتھے 66' ورق 121) ۔

14۔ آئین (1)' 297 صفحات وما بعد جیرٹ کا ترجمہ [(2)' 62] بالکل لفظی نہیں ہے۔ پروفیسر قانونگو نے شیر شاہ

پر اپنے مونوگراف صفحہ 323 (کلکتہ 1921ء) میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ شیر شاہ محض ایک چوتھائی حصہ بطور مالگذاری وصول کرتا تھا۔ میں نے جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی، 1926ء ص ص 448 و مابعد میں ان کے دلائل پر تفصیلی بحث کی ہے۔

15۔ لفظ زرِ لُبّی میں 'ی' لاحقہ غیر واضح ہے۔ اس کا ایک مخصوص دستور ترجمہ، محاورہ کے مطابق ہوگا۔ ایسی صورت میں یہ مفہوم ہوگا کہ دستور صرف ایک تھا۔ لیکن اسے ایک دستور بھی سمجھا جاسکتا ہے جس کا یہ مفہوم ہوا کہ یہ منجملہ متعدد کے ایک ہے۔

16۔ مثلاً ایلیٹ (4)، 415 جس میں ایک عہدہ دار کو سرہند یہ اور دوسرے کو کانٹ اور رودبیلکھنڈ کے دو سرے پرگنوں پر قابض دکھایا گیا ہے۔

17۔ ایلیٹ (4)، 479 – 81، (5)، 487 -

باب 4

اکبر کا عہدِ حکومت (1556ء ـ 1605ء)

1- تمہید

ہنگامہ خیز سیاسی تبدیلیوں کے جملہ ادوار کے دوران جس انتظامی تسلسل کی موجودگی کی طرف پچھلے باب میں اشارہ کیا گیا تھا اس کا مغلیہ عہد کے پہلے دور (1526ـ1540) پر اطلاق ہوتا ہے۔ تحریروں میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ بابر یا ہمایوں نے شمالی ہندوستان کے زرعی نظام میں کوئی تبدیلی کی۔ بلکہ ہمیں اس موضوع پر جن چند حوالوں کا پتہ چلا سکا وہ ان کے مروّجہ نظام کو قبول کرنے کی ہی نشاندہی کرتے ہیں۔ تحریری اطلاعوں کے مطابق' بابر نے پانی پت کی لڑائی[1] کے بعد بہت جلد ہی اپنے ساتھیوں کو جاگیریں دینا شروع کر دیں اور مملکت[2] کے متعلق خود اس کے سرسری طور پر لکھے ہوئے حالات لازمتہً ہندوستانی تحریروں پر مبنی رہے ہوں گے' کیونکہ وہ لکھتا ہے کہ میوات اس کے پیشروؤں کے زیر انتظام نہ تھا جبکہ اس کا یہ بیان کہ منجملہ 25 کروڑ کے 8 یا 9 کروڑ "رایوں اور راجاؤں کے پرگنوں سے متعلق تھے جو اپنی سابقہ فرمانبرداری کی بنا پر وظیفہ اور گذارہ پاتے تھے" انتظامی تسلسل کی قطعی شہادت فراہم کرتا ہے۔[3] ہمایوں نے اپنی باپ کی دی ہوئی جاگیروں کی توثیق کی اور ہمیں اس کے بنگال اور دوسرے مقامات پر بھی نئی جاگیروں کے منظور کرنے کی اطلاع ملتی ہے۔ مرکزی نظامِ حکومت کی تشکیلِ نو کے متعلق خواند میر کی سرگذشت میں گو کہ مالی معاملات کو چار وزیروں میں سے ایک کے سپرد کئے جانے کا ذکر آتا ہے مگر اس میں وزارت کے واقعی طریق کار میں کسی تبدیلی کا اشارہ نہیں ملتا اور مجھے ایک بھی ایسی عبارت نہیں ملی جو انتظامات میں کسی اہم تبدیلی کو ظاہر کرے۔ 1555ـ56ء کے چند مہینوں کے مدّت میں جو ہمایوں کے عہدِ حکومت کے دوسرے دور پر مشتمل ہے' یہ ایک واضح امر ہے کہ نظام میں کسی تبدیلی کو شروع کرنے کا کوئی موقع نہ تھا اور ہم بجا طور پر اکبر کی تخت نشینی کو ایک نئے عہد کا آغاز تصوّر کر سکتے ہیں۔

اکبر 1556ء میں جب وہ صرف چودہ سال کا تھا تخت نشین ہوا۔ اس کی ذاتی حکومت 1562ء

میں شروع ہو کر 1605ء میں اس کی موت کے ساتھ ختم ہوئی۔ ہمارے مقصد کے لئے یہ طویل عہدِ حکومت دو مرحلوں پر منقسم ہے۔ سنہ[24] جلوس (80-1579ء) تک شعبۂ مال کے انتظامات کو تجربوں کا ایک سلسلہ کہا جا سکتا ہے؛ جب کہ مأخذ کی اطلاع کے مطابق اس کے بعد کی مدت میں یہ نظام پایۂ استحکام کو پہنچ چکا تھا گو کہ جزویات کو حل کرنا ابھی باقی تھا۔ اس عہد کے ابتدائی دور کے مطالعہ کے لئے ضروری مواد بمقابلہ کسی سابقہ عہد کے کافی زیادہ موجود ہے اور ان سے ماضی اور مستقبل دونوں ہی پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن تحریروں کی تعبیر کسی طور بھی آسان نہیں، اور اس باب میں میرے بیان کئے ہوئے حالات، سابقہ تحریروں سے بعض اہم موضاعات پر مختلف پائے جاتے ہیں۔

اس عہد کے خاص مأخذ، اکبرنامہ اور اس کا اختتامی حصہ، آئینِ اکبری میں۔ آئینِ اکبری گو ایک جداگانہ کتاب ہے مگر اسے اکبرنامہ سے غیر متعلق نہ تصوّر کرنا چاہئے۔ یہ ماخذ سرکاری ہیں اور ان کے علاوہ ہمارے پاس غیر سرکاری سرگزشتیں بھی ہیں جن میں سے اہم ترین کے ساتھ نظام الدین احمد اور بدایونی کے نام وابستہ ہیں۔ غیر سرکاری تحریریں ماحول کے صحیح اندازہ کے لئے ناگزیر ہیں، لیکن زرعی نظام کی تفصیلات کے متعلق وہ بہت تھوڑی براہِ راست معلومات فراہم کرتی ہیں۔ ہمارے لئے ان کی محض چند عبارتیں توجہ طلب ہیں اور ہمیں واقعات کے اہم پہلوؤں کو سرکاری دستاویزات ہی سے اخذ کرنا ہوگا۔

اکبرنامہ اس عہد کی ایک باقاعدہ سرگذشت ہے جسے بادشاہ کے حکم کے تحت شیخ ابو الفضل نے جو اس عہد کا ممتاز ترین مصنّف اور اپنے شاہی آقا کا مخلص کامل تھا، تحریر کیا ہے۔ ایک حد درجہ انفرادی اسلوب بیان اور عام طور پر موضوع کے سلسلہ میں متوازن روّیہ، اس تصنیف کی خصوصیات ہیں اور بحیثیت ایک ادبی تحریر کے ہمیں اسے ایک اونچا مقام دینا چاہئے۔ مورّخ کے لئے اس کا سب سے بڑا نقص ایسے معاملات میں جہاں صحیح واقعات کا اظہار ناخوشگواری کا موجب ہو، وہاں ان کے اظہار میں بخل یا بقول بعض طالب علموں کے انھیں کبھی کبھی غلط طور پر پیش کرنا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس کا تنقیدی مطالعہ دوسری سرگذشتوں کی روشنی میں کیا جائے۔ لیکن ہمارے مقاصد کے لئے یہ نقص بہت زیادہ اہم نہیں ہے۔

آئینِ اکبری جو بہ اعتبار ترتیب اکبرنامہ کا اختتامی حصہ ہے، اس سے بہت زیادہ مختلف خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کی تصنیف کا مقصد جیسا کہ دیباچہ[49] میں درج ہے، اکبر کی

ان سرگرمیوں کو بیان کرتا ہے "جو اس کی سیرت کے دنیاوی پہلو اور بحیثیت بادشاہ اس کی عظمت کی مظہر ہیں" بحیثیت ایک روحانی پیشوا کے اس کے کارناموں سے بالارادہ صرفِ نظر کیا گیا ہے اور اس کا مصنف یہ لکھنے میں کلیۃً حق بجانب ہے کہ وہ طالبانِ علم کو "ایک ایسا تحفہ پیش کر رہا ہے جسے سمجھنا بظاہر دشوار ہے' لیکن یہ ہے واقعۃً آسان' یا زیادہ صحیح طور پر بہ نظام آسان معلوم ہوتا ہے مگر ہے مشکل"۔

یہ تصنیف مختلف عناصر کا ایک مرکب ہے۔ اس کے آخری حصہ کا جس میں خاص طور پر ہندو تہذیب کا بیان درج ہے ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابتدائی حصہ میں جسے میں اب آئین کے نام سے پکاروں گا' ان تمام مختلف شعبوں میں جنہیں منظم کیا جا چکا تھا' اکبر کے انتظامات کو بیان کیا گیا ہے اور اس طور پر یہ حصہ مبینہ مقصد کو پورا کرتا ہے۔ کوئی بھی شخص جس نے آئین اور اکبر نامہ کا ساتھ ساتھ مطالعہ کیا ہو' انھیں ایک ہی مصنف کی تحریر تصور نہیں کر سکتا۔ آئین جملہ اسلوبوں کا ایک بے ترتیب مجموعہ ہے اور اس کا خود کوئی اسلوب نہیں۔ توازن کا فقدان نمایاں ہے۔ طرزِ تحریر اکثر پیچیدہ اور اصطلاحی ہے۔ جیسا کہ بلاکمین نے متن کے دیباچہ میں نشاندہی کی ہے' بعض مختصر حصے واضح طور پر ابوالفضل کے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ امر بھی اسی قدر واضح ہے کہ وہ حصے جن کا ہم سے تعلق ہے بہت سے مختلف مصنفین کے تحریر کئے ہوئے ہیں۔ اس کتاب کو مجموعی طور پر متعدد انتظامی شعبوں کے تحریر کئے ہوئے سرکاری کاغذات کا مجموعہ تصور کرنا چاہیئے' جس کی تالیف ابوالفضل نے کی ہے اور اس میں جستہ جستہ حصے اسی کے قلم سے نکلے ہیں۔ یہ اصلاً ان اطلاعات پر مشتمل ہے جسے مختلف شعبوں نے فراہم کیا اور مولف نے انھیں مسترد نہیں کیا۔ جو ابواب زرعی نظام کے متعلق ہیں انھیں وزارتِ مال کے محض ایک یا دو ایسے عہدہ داروں کی تحریر سمجھا جا سکتا ہے جو اس محکمہ کے معمولات سے اپنی واقفیت کی بنا پر ان کی تفصیلات کی وضاحت کرنے پر قادر تھے اور میرا خیال ہے کہ ان کے اندر شعبہ جاتی خامیوں پر خاموشی اختیار کرنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ ہم ابہام کو ناقص تحریر یا عاجلانہ تدوین کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں' لیکن یہ کبھی تصور نہیں کر سکتے کہ ان کے لکھنے والے اپنے موضوع سے ناواقف تھے۔

یہ دونوں تصانیف ایک دوسرے سے علیحدہ ضرور ہیں مگر غیر متعلق نہیں۔ بعض عبارتوں میں اکبر نامہ میں آئین کا خلاصہ درج کیا گیا ہے اور تفصیلات کے لئے آئین کا حوالہ دیا گیا ہے۔ دوسری

عبارتوں میں، اکبر نامہ ان تفصیلات کو فراہم کرتا ہے جس کی آئین کی متوازی عبارتوں میں کمی ہے۔ آگے چلکر ایک ایسی صورت کا حوالہ آئیگا جس میں اکبر نامہ میں بظاہر ایسے سرکاری دستاویزات کے متن کو بالارادہ درج کیا گیا ہے جنھیں آئین میں حذف کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہمیں ان دونوں کو ایک دوسرے کی مکمل کرنے والی تصنیف کے طور پر پڑھنا چاہیئے۔ ہم جس قدر معلومات معلومات چاہتے ہیں وہ سب ان میں سے کسی ایک سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ لیکن تقریباً سبھی معلومات ان میں سے کسی نہ کسی میں موجود ہیں اور کم از کم بعض امور سے متعلق نا تمام اطلاعات کے متعلق یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ناقص ایڈیٹنگ کا نتیجہ ہیں۔ جو بیان آگے آتا ہے اسے میں مملکت کے مرکزی حصہ یعنی پنجاب سے الہ آباد تک کے علاقہ کی تاریخ سے شروع کرتا ہوں۔ سب سے پہلے تشخیص، بعدہٗ جاگیریں اور پھر ان شرمناک واقعات کی رفتار کو بیان کروں گا جو درمیان میں حائل ہوئے۔ اس کے بعد نظام ضبط کی آخری شکل کے عمل پر بحث آئے گی اور سب سے آخیر میں ان انتظامات کا ایک خاکہ جو عہد کے آخری حصہ میں پوری مملکت میں رائج تھا۔

2۔ تشخیص کے طریقے

اس فصل کا خاص تعلق اس حصۂ ملک سے ہے جو سنہ 24ء جلوس کے بعد سے لاہور، دہلی، آگرہ، اودھ[6] اور الہ آباد کے پانچ صوبوں میں شامل تھا۔ ملتان کا چھٹا صوبہ سلسلۂ واقعات میں پندرھویں سال شامل ہوتا ہے اور ساتویں صوبہ مالوہ کا بھی ذکر تحریروں میں آتا ہے، لیکن اس کے اعداد و شمار ایسے بے اصول ہیں جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس کا اپنا علیحدہ تشخیص کا نظام رہا ہوگا مختصراً یہ کہ ہمیں جس واقعہ کو بیان کرنا ہے وہ تشخیص شرحوں کے تین مجموعوں سے متعلق ہے جنہیں ترتیباً شیر شاہ کی "قانونگوئی" اور "دہ سالہ" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ تینوں اس عام زمرہ کے تحت آتے ہیں جسے ہم نے پیمائش بیان کیا ہے، یعنی رقبۂ زیر کاشت پر پیداوار کے اعتبار سے تبدیل ہوتا ہوا مطالبہ اور شرحوں کے ایک مجموعہ سے دوسرے مجموعہ کو منتقلی، ایک قابلِ عمل نظام سے قربت حاصل کرنے کی طرف تدریجی قدم کی علامت ہے۔

جیسا کہ پچھلے باب میں گذر چکا ہے، اکبر بلکہ اس کے قائم مقام بیرم خاں نے شیر شاہ[7] کی مقرر کی ہوئی تشخیص کی شرحوں کے دستور کو عام استعمال کے لئے شروع ہی اختیار کیا۔ ان شرحوں کے تحت حکومت کا مطالبہ اوسط پیداوار کے ایک تہائی کے مساوی ہوتا تھا جسے بمقدار غلہ ظاہر کرتے تھے اور

محض چند پیداواروں کے لئے نقدی شرحیں مقرر کی جاتی تھیں۔ اکبر کے تحت جملہ صورتوں میں مطالبہ کی شکل نقدی ہوتی تھی اور مروّجہ قیمتوں کے مطابق غلہ کی شرحوں کو نقد میں تحویل کر دیتے تھے۔ اس دستور پر عمل نہ ہو سکا۔ اس کے متعلق مختصر اور جامع سرکاری رائے کا لفظی ترجمہ اس طور پر ہے: "بڑی پریشانی پیش آتی تھی"۔

محفوظ اضلاع میں اس کے استعمال کو تیرہویں سال روک دیا گیا اور ان علاقوں میں اجتماعی تشخیص کے تھوڑے عرصہ تک استعمال کئے جانے کے بعد دوسری یعنی قانونگو کی شرحوں کو رائج کیا گیا۔ شرحوں کے ان دونوں مجموعوں کے واقعی عمل کا پتہ آئین کے باب موسومہ "نوزدہ سالہ" میں جس کی قدرے ابتدائی وضاحت ضروری ہے چلایا جا سکتا ہے۔

اس باب کے مختصر متن[1] سے ہمیں محض اس قدر اطلاع ملتی ہے کہ ہر سال طلب کی جانے والی فی بیگھہ نقدی شرحیں جو اس کے ساتھ منسلک ہیں انہیں انتہائی کاوش کے ساتھ تحقیقات کے بعد جمع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد صوبہ داری گوشوارے آتے ہیں جن میں بمقدار دام (معمولاً 40 فی روپیہ) ہر پیداوار پر ہر سال کا مطالبہ درج ہے۔ یہ چھٹے سال سے شروع ہو کر جو غالباً سب سے پہلا ایسا سال ہے جس کے اعداد موجود تھے، چوبیسویں سال پر جبکہ نقدی شرحوں میں تحویل کرنے کا طریقہ ترک کر دیا گیا، ختم ہوتا ہے۔ بعض قلمی نسخوں میں یہ اعداد نہیں ملتے اور جہاں یہ نقل ہیں، وہاں غلطیاں بہت ہیں جیسا کہ ایسے اعداد و شمار کے گوشواروں میں معمولاً پایا جاتا ہے۔ بلاکمین نے متن پر اپنی یادداشت میں ان اعداد کو فی الجملہ ناقابل اعتبار قرار دیا ہے اور ہم اس کی رائے کو اس لحاظ سے درست تصور کر سکتے ہیں کہ کسی مخصوص عدد پر اس خطرہ کے تحت کہ ممکن ہے وہی عدد بگڑی ہوئی ہو، کسی دلیل کا قائم کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ لیکن ایک لاپرواہ نقل نویس بھی اپنے روبرو موجود اعداد میں سے بیشتر کو صحیح درج کرتا ہے اور اس مخصوص صورت میں ہر صوبہ کے لئے علیحدہ علیحدہ اعداد موجود ہونے کا ہمیں فائدہ حاصل ہے۔ تمام پانچوں صوبوں کے اعداد ایک ہی سمت میں رجحان ہونے کی صورت میں انہیں صحیح صورت حال کی شہادت کے طور پر قبول کرنے میں کوئی خطرہ نہیں اور اس رجحان کی مثالیں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے تفصیلی جائزہ کے بعد مجھے اس امر کا یقین ہو گیا ہے کہ حسب ذیل نتائج کو ایک معقول حد تک صحیح تصور کیا جا سکتا ہے۔

چھٹے سے نویں سال تک محض چند مقامی انحرافات کو چھوڑ کر پانچوں صوبوں کے لئے غلہ کو

نقد میں تحویل کرنے کے لئے شرحوں کا ایک ہی مجموعہ اختیار کیا گیا ہے۔ مثلاً چھٹے اور ساتویں سال ہر جگہ گیہوں کا نرخ 90 دام تھا اور چونکہ ہمیں فصل اور زرخیزی کے معاملہ میں مقامی اختلافات کا جو موجودہ زمانہ میں بھی اتنے ہی زیادہ ہیں لحاظ کرنا ہوگا اور نیز زیادہ مقدار میں پیداوار کے حمل و نقل کے زیادہ اخراجات کے باعث منڈیوں کے بہت محدود ہونے کو بھی نظر میں رکھنا ہوگا۔ لہذا ہمارے لئے یہ یقین کرنا ناممکن ہے کہ لاہور سے الہ آباد تک کی ایسی طویل مسافت کے درمیان واقع تمام شہروں اور دیہاتوں میں قیمتیں ایک رہ سکتی تھیں۔ واحد معقول نتیجہ جو اخذ کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ مروجہ شرحنامہ کی رو سے غلہ کا جو یکساں مطالبہ مقرر کیا جاتا اسے ایک واحد قیمتوں کے نرخنامہ کے مطابق جو غالباً شاہی لشکرگاہ میں مروجہ قیمتوں پر مبنی ہوا کرتا نقد میں تبدیل کر دیتے تھے۔

مذکورہ بالا نتیجہ کو اس بات سے تائید حاصل ہوتی ہے کہ ان برسوں میں غذائی غلوں کی نسبت سے داموں پر تشخیص کا بار بہت زیادہ تھا۔ جیسا کہ پچھلے باب میں وضاحت ہو چکی ہے مستعملہ اکائیوں کے متعلق عدم تیقن، شیر شاہ کے دستور میں مندرج اطلاعات کی بنا پر صحیح شرح پیداوار کے متعلق نتائج اخذ کرنے میں مانع ہے لیکن فی الواقع شرح پیداوار کے بجائے اضافی زرخیزی کو تھوڑی بہت قریبی صحت کے ساتھ متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس شرحنامہ سے اخذ کی ہوئی اضافی زرخیزی اور آئین کی ایک دوسری فصل سے عام اضافی قیمتوں کو لیتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ اگر گیہوں کی قابل تشخیص مالیت کو بمقدار نقد 100 تصور کیا جائے تو جوار (سورگم) کے لئے مماثل عدد 166 اور چنے کے لئے 53 ہوگی۔ چھٹے سال جوار پر تشخیص کا حساب 55 آتا ہے اس طور پر گیہوں کی نسبت اس کی قیمت قدرے کم لگائی گئی ہے لیکن چنے کے لئے عدد بجائے 53 کے 89 تھی اور ایک دوسری دال موٹھ کی بھی اسی پیمانے پر زیادہ قیمت لگائی گئی ہے۔ اس بے ضابطگی کا واضح سبب یہ ہے کہ پورے ملک میں دالوں پر تشخیص ان کی ان اونچی قیمتوں کی بنیاد پر کی جاتی تھی جو جانوروں سے بھرے ہوئے ایک لشکرگاہ میں لازمی طور پر رائج رہی ہوں گی۔ اس تجزیہ کو مزید آگے نہ بڑھاتے ہوئے یہ کہنا واجب ہوگا کہ یہ یکساں نرخیں اور دالوں کی یہ زائد تشخیص بجائے خود تشخیص کو ناقابل عمل بنانے کے لئے کافی تھیں۔

دسویں برس ایک بڑھتی ہوئی تبدیلی کا آغاز اس طور پر ہوا کہ اہم پیداواروں کی مالیت مقامی قیمتوں کی بنیاد پر لگائی گئی۔ اس طریقے سے قدرتی طور پر دالوں کی قیمتوں کا زیادہ لگانا کم

ہوگیا۔ ایک واحد عدد کے بجائے زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم نرخوں کے اب آجانے سے اس تبدیلی کی شہادت فراہم ہوتی ہے۔ مثلاً اودھ میں جوار السلطنت سے قدرے فاصلہ پر واقع تھا جہاں نویں سال میں گیہوں پر لگان 90 دام (فی بیگھہ) لگایا گیا تھا، دسویں سال میں 52 سے 60 تک دام لگایا گیا اور چنا جس پر 80 دام تھے وہ کم ہو کر 40 سے 56 دام تک ہو گئے۔ یہ یقیناً ناممکن ہے کہ ایک مقامی تشخیص کرنے والے عہدہ دار کو 40 یا 56 داموں پر تشخیص کرنے کا اختیار دیا گیا ہوگا۔ اس کی واحد معقول توجیہ یہی ہے کہ یہ وہ مقامی شرحوں میں جن کا صوبہ کے مختلف حصوں پر اطلاق تھا اور چونکہ اب تک غلّہ کا مطالبہ یکساں چلا آرہا تھا لہٰذا نقد مطالبہ میں فرق کا واحد سبب قیمتوں کا فرق تھا۔ یہ فرق کرتے ہوئے کہ مقامی قیمتیں صحیح طور پر مقرر کی گئی تھیں اس کارروائی سے سب سے بڑی خرابی جو ظاہر ہوئی تھی اس کا ازالہ ہوگیا۔ لیکن اب بھی مختلف زرخیزی کے ایک وسیع علاقہ پر یکساں شرح کے مطابق غلّہ کے مطالبہ کا بنیادی نقص قائم رہا۔ یہ ایک ایسی خرابی تھی جسے جیسے زیرِ انتظام علاقہ بڑھتا گیا ویسے ویسے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا ہوگا۔

دسویں سے چودہویں برس تک کی نقدی شرحیں اس مقامی اختلاف میں ایک تدریجی اضافہ کے علاوہ کسی اور عمومی رجحان کو ظاہر نہیں کرتیں۔ لیکن اکبرنامہ کی ایک عبارت [333،2] سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ محفوظ زمینوں کی تشخیص کے سلسلہ میں ان شرحوں کے استعمال کو موقوف کر دیا گیا۔ تیرہویں برس یہ محسوس کیا گیا کہ وزیر مظفر خاں پر جس کے ذمہ عمومی اور مالی دونوں ہی انتظامات تھے کام کا زیادہ بار ہے۔ چنانچہ محفوظ زمینوں کی ذمہ داری اس سے لے کر شہاب الدین احمد خاں کے سپرد کی گئی۔ اس عہدہ دار نے ہر سال کی تفصیلی تشخیص کو بند کر کے اس کے بجائے ایک 'نسق' قائم کیا۔ جیسا کہ ضمیمہ د میں واضح کیا گیا ہے، میں اس اصطلاح کا مفہوم کسی موضع یا پرگنہ کی اجتماعی تشخیص (یا غالباً اجارہ داری) سمجھتا ہوں۔ اس انتظام کی مدت قیام تحریروں میں درج نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے ایک عارضی انتظام تصور کیا جا سکتا ہے، کیونکہ پندرہویں برس قانونگوئی شرحوں کے رائج ہو جانے پر یہ ختم ہوگیا۔

ان شرحوں کے حساب کا طریقہ تحریروں میں درج نہیں ہے اور نہ ہی خود ان شرحوں کو محفوظ رکھا گیا۔ لیکن موجودہ اطلاعات سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہر قانونگو سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے پرگنہ کے لئے فصل کی پیداواروں کا اسی شکل میں ایک گوشوارہ تیار کرے جیسا کہ پہلے زیرِ استعمال تھا۔ اس میں ہر پیداوار پر مطالبہ بمقدار غلّہ اوسط پیداوار کے بقدر ایک تہائی

کے درج کیا جاتا یعنی یہ کہ تشخیص کا بنیادی قاعدہ تبدیل نہ ہوا' لیکن اسے اب بجائے پوری مملکت کے ہر پرگنہ پر علیحدہ علیحدہ نافذ کیا گیا۔ مقامی قیمتوں کی بنیاد پر نقدی مطالبہ کی تشخیص قائم رہی اور ان اعداد کے لئے فصل بہ فصل اب بھی بادشاہ کی منظوری ضروری ہوتی تھی۔ اہم فرق یہ تھا کہ مطالبہ غلہ جن پر اعداد کا اطلاق کیا جاتا اب بجائے عام شرح پیداوار کے مقامی شرح پیداوار پر مبنی کیا جانے لگا۔ "ہر پرگنہ" کہنا غالباً مبالغہ آرائی ہوگی۔ ہر پرگنہ کے لئے ایک قانونگو بیشک ہوا کرتا لیکن ان میں سے بعض کے حدود بہت ہی مختصر تھے اور اس کا امکان ہے کہ بعض اوقات ملحق پرگنوں کے دستور یکساں یا تقریباً یکساں ہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ پرگنہ کے تشخیص حلقوں میں زمرہ بندی جو اس کے بعد آنے والی شرحوں کے مجموعہ کی خصوصیت تھی' درحقیقت اسی وقت وجود میں آئی۔ لیکن اس سلسلہ میں مجھے کوئی سند دستیاب نہ ہو سکی۔

جس وقت یہ تبدیلی عمل میں لائی گئی' وزارت مال مظفر خاں اور راجہ ٹوڈرمل کی سپردگی میں تھی۔ اس وقت تک مظفر خاں عام نظم و نسق کا بھی ذمہ دار تھا اور ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ قانونگوئی شرحوں کا اصل بانی راجہ ٹوڈرمل جو تاریخ اور نیز داستانوں میں اسی قدر ممتاز ہے' رہا ہوگا۔ جیسا کہ آگے آئے گا طریقۂ تشخیص میں اگلی تبدیلی کا لانیوالا ٹوڈرمل نہ تھا۔ لہٰذا جب بعد کے مصنفین اس کی شرحوں کا ذکر کرتے ہیں' تو ہمیں ان کو ان شرحوں کا مصداق تصور کرنا چاہئے جو اس وقت زیر بحث ہیں۔

قانونگوئی شرحوں کی ابتدا کا پتہ "نوزدہ سال" کے اعداد میں جس پر پہلے بحث آچکی ہے' چلایا جا سکتا ہے۔ ہر صوبہ کی پندرھویں برس کی شرحوں میں ایک واضح عدم تسلسل پایا جاتا ہے۔ پہلی بار نئی فصلوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جملہ گوشواروں کو باضابطہ طور پر مکمل کرانے کے لئے واضح کاروائی عمل میں لائی گئی ہے۔ سب سے زیادہ اور سب سے کم شرحوں کا درمیانی خلا نمایاں طور پر بڑھتا ہے اور صوبوں کے باہمی تفاوت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مقامی شرحناموں کے اختیار کئے جانے کے یہ قدرتی نتائج تھے۔ ان میں سال بہ سال' بدلتی ہوئی قیمتوں کی شرح پر نقد میں تحویل کئے ہوئے مقررہ مطالبہ کے بجائے مطالبۂ غلہ اور قیمت کے در بدلتے ہوئے اعداد درج تھے اور مجموعی طور پر ان اعداد سے یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس برس تشخیص میں ایک عمومی تبدیلی عمل میں لائی گئی' حالاں کہ بعض صورتوں میں اس کا پورا اثر اگلے ایک یا دو برس کے قبل ظاہر نہ

ہوا۔

دوسری طرف ہندوستان میں سے جو بیس برس کے درمیان تحریری شرحوں میں کوئی عدم تسلسل نہیں ملتا اور یہ بات اس نتیجہ سے مطابقت رکھتی ہے جو ماخذ کے سکوت کی بنیاد پر نکالا جا سکتا ہے، یعنی یہ کہ اس مدت میں طریقۂ تشخیص غیر متبدل رہا۔ ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ جہاں تک مطالبہ غلّہ کا تعلق تھا شرحیں فی الجملہ منصفانہ تھیں کیونکہ یہ واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ان کے رد کئے جانے کا سبب وہ دشواریاں تھیں جو فصل کے موسم میں جنس کو نقد میں تبدیل کرنے کے دوران پیش آیا کرتی تھیں۔ اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ غلّہ کی شرحیں خود ناقص تھیں۔ آئین [347(1)] میں پیش آنے والی دقتوں کو مملکت کی توسیع کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے: سرکاری مطالبہ کے تعین میں کام آنے والی قیمتوں کے جمع کرنے میں اکثر تاخیر ہو جاتی تھیں۔ کسان اور جاگیر دار دونوں ہی اس کے مستقل شاکی رہا کرتے یہاں تک کہ بادشاہ کو اس کا حل تلاش کرنا پڑا۔ اس امر کے پیش نظر کہ ہر فصل پر تبدیل کی قیمتوں (COMMUTATION PRICES) کے لئے بادشاہ کی منظوری ضروری ہوا کرتی یہ توجیہہ معقول معلوم ہوتی ہے۔ بیشتر اس کے کہ فصلوں کے امکانات کے بارے میں ایک معقول حد تک یقین نہ ہو جائے ان قیمتوں کو تجویز کرنا ممکن نہ ہو سکتا تھا اور عملاً کہ شمالی ہندوستان کا رواج ہے اس مدت اور وصولی کے وقت کے درمیان محض چند ہفتوں کا فرق ہوتا ہے۔ تاخیریں کیونکر پیش آ سکتی تھیں، اسے ہم بہ آسانی قیاس کر سکتے ہیں: مثلاً ملتان کے لئے مجوزہ شرحیں بذریعہ قاصد آگرہ پہنچنے پر یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ بادشاہ پٹنہ یا احمد آباد کے لئے کوچ کر رہا ہے یا یہ کہ اس نے غالباً کشمیر سے اپنی واپسی کو موخر کر دیا ہے۔ ایسی صورتوں میں مقامی حکام کو مجوزہ شرحوں ہی کی بنیاد پر وصولی شروع کرنا ہوتا تھا کیونکہ اس عمل میں کبھی بھی تاخیر نہ کی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد دربار سے تبدیل کی ہوئی شرحیں موصول ہوا کرتیں تھیں جس کی وجہ سے دوران فصل مطالبہ کو بہ عجلت کم و بیش کرنا ہوتا تھا جو متعلق شخص کے لئے پریشانی کا موجب ہوتا تھا۔

اکبر نامہ [282(3)] میں یہی روئیداد زیادہ خوش اسلوب پیرایہ میں بیان کی گئی ہے لیکن اس میں ایک اور نکتہ کا اضافہ ملتا ہے جس سے شعبہ جاتی تحریروں میں صرف نظر کیا گیا ہے یعنی یہ کہ قیمتوں کے متعلق اطلاعات دینے والوں میں سے بعض کے متعلق دیانتداری کی راہ سے انحراف کی افواہ تھی"۔ اس واقعہ کے امکان کو تسلیم کرنے میں ہمیں تامل نہیں ہونا

چاہیئے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ دارالسلطنت کے عہدہ داران یعنی وزارت مال کا عملہ جب تک کہ خود اکبر اس کا کوئی حل نہ نکالتا، متردد اور بے بس رہا کرتا۔ ایسی صورت میں ہمیں ان مسلسل بیانات کو تسلیم کرلینا چاہیئے کہ آخری یا "دس سال" کے شرحناموں کی ایجاد خود اکبر نے نہ کہ اس کے عہدہ داروں نے کی تھی۔

نئے دستور کی امتیازی خصوصیت جیسا کہ آئین میں درج ہے یہ ہے کہ جملہ پیداواروں پر مطالبہ کی شرحیں بمقدار غلہ نہیں بلکہ نقدی معین کی گئیں تاکہ فصلی تبدل کی ضرورت ختم ہو جائے۔ ان کے حساب لگانے کے طریقہ پر پردہ پڑا ہوا ہے[13]۔ لیکن میں نے ماخذ سے یہ سمجھا ہے کہ پچھلے دس برسوں یعنی قانونگوئی شرحوں کے نافذ رہنے کے زمانہ کی مقررہ شرحوں کے اوسط کو اختیار کیا گیا تھا۔ دستور میں پرگنوں کی ایسے حلقوں میں زمرہ بندی کی گئی ہے۔ جنھیں ہم تشخیصی حلقے کہہ سکتے ہیں اور ہر حلقہ کے لئے ایک شرحنامہ (دستور[14]) معین کیا گیا اور یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ زمرہ بندی، فی الجملہ اطمینان بخش تھی کیونکہ بیشتر وہ حلقے جن سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں، بہ اعتبار زرخیزی اچھے خاصے یکساں ہیں۔

اس نظریہ کی جانچ کہ نئی شرحیں دس سال کے تجربہ کے اوسط پر نکالی گئی تھیں، ریاضی کی رو سے نہیں کی جا سکتی۔ قانونگوئی شرحوں کے لئے ہمارے پاس ہر صوبہ میں عائد کیا جانے والا صرف زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم مطالبہ ہے۔ لہذا ہم اس سے زائد اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ان دو حدوں کے درمیان کہیں واقع ہوگا۔ مثلاً جہاں گیہوں پر لگان 40 سے 75 داموں تک لگایا جاتا تھا، وہاں 57½ داموں کو اوسط شرح نہیں تصور کیا جا سکتا، کیونکہ جہاں تک ہمارا علم ہے، یہ انتہائی شرحیں محض چند چھوٹے پرگنوں سے متعلق ہو سکتی ہیں اور صوبہ کے بیشتر حصہ کا مطالبہ ان میں سے کسی ایک کے قریب ہو سکتا ہے۔ اوسطوں کی امداد کے بغیر شرحوں کے دونوں مجموعوں کا صحیح موازنہ ناممکن ہے۔ اندازہ سے معین کی ہوئی امکانی اعداد کو لیتے ہوئے یہ عمومی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ بجبکہ دہ سالہ شرحوں میں بعض قبل کی فصلوں کے مثل انتہائی اعداد نہیں ملتے کیونکہ اوسط نکالنے میں قدرتی طور پر انتہائی اعداد حذف ہو جاتے ہیں، ان شرحوں کے اعداد 10 سے 20 فیصدی شرحوں کی نسبت تک اونچے تھے۔ یاد رہے کہ اکبری بیگھہ سال 31 جلوس تک رائج نہ کیا گیا تھا اور یہ کہ یہ اپنی پیشرو مستعملہ اکائی[15] سے تقریباً 20 فیصدی بڑا تھا۔ میرے خیال میں یہ بہت ہی ناممکن ہے کہ "نوزدہ سال" کی شرحوں

کی ضخیم گوشواروں کو جو یقیناً سابقہ اکائی کی مقدار میں مرتب کیئے گئے تھے کبھی بھی از سرنو اس اکائی کے متروک ہوجانے پر جو نئی اکائی استعمال میں آئی اس کی مقدار میں تحویل کیا گیا ہوگا اور اگر دس سال کی شرحیں حقیقتاً دس سال کے مطالبہ کی اوسط تھیں، لیکن بعد میں پھر انہیں بڑھے ہوئے بیگھہ کے مطابق کرلیا گیا تو انھیں تقریباً ۵ اضافہ ظاہر کرنا چاہیئے جو معائنہ کے بعد واضح ہوتا ہے۔ اس دلیل کو بہت زیادہ وقیع نہ تصور کرنا چاہیئے، کیونکہ جانچ کا عمل قطعیت سے بہت دور ہے۔ میرا کہنا محض اس قدر ہے کہ دس سالہ شرحیں بحالت موجودہ دس سال کے واقعی مطالبوں کے اوسط میں بڑھے ہوئے بیگھہ کی بنا پر اضافہ کرنے کے بعد کی سطح کے کہیں قریب واقع ہیں۔

عہد اکبری میں اس کے بعد تشخیص کے طریقوں میں کسی تبدیلی کی تحریر نہیں ملتی۔ ہم یہ قیاس کرسکتے ہیں کہ جو بیسویں برس جب آئین میں مندرج شرحوں کو نافذ کیا گیا اور چالیسویں برس جب یہ تصنیف پایۂ تکمیل کو پہونچی، ان دونوں مدتوں کے درمیان گو کہ ان شرحوں کی بعض تفصیلات میں ترمیمیں عمل میں آئیں، لیکن عام نظام کو واضح طور پر برقرار رکھا گیا۔ اکبر کی جدت کے دوگونہ نتائج برآمد ہوئے۔ انتظامی اعتبار سے اس نے نقدی تبدل کی زحمت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرکے مقامی حکام کے لئے یہ ممکن کردیا کہ وہ ہر فصل میں مطالبہ کی تشخیص کو ایسے موقع سے مکمل کرلیں کہ اس کی وصولی وقت کے ساتھ ہوسکے اور اس کا معاشی اثر یہ ہوا کہ فصلی انحراف اور دیگر اسباب سے قیمتوں میں ہونے والی کمی و بیشی کا نفع و نقصان حکومت سے کسان کی جانب منتقل ہوگیا۔ تشخیص کی اونچی سطح کے باعث، یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قسم کی منتقلی دانشمندانہ تھی یا کیا ایسا ممکن بھی تھا۔ اس سوال کا جواب بعض ان واقعات میں ملتا ہے جن کا اس منتقلی کے بعد پیش آنا تحریروں میں درج ہے۔ ہمیں تینتالیسویں برس یہ اطلاع ملتی ہے کہ لاہور میں اکبر کے طویل قیام اور اس کے نتیجہ میں مقامی قیمتوں میں اضافہ کے باعث، اس علاقہ کی مالگذاری کے مطالبہ میں 20 فیصدی کا اضافہ کردیا گیا تھا۔ وہاں سے اس کی روانگی پر قیمتیں کم ہوگئیں اور اس کے حکم کے تحت اس اضافہ کو ختم کردیا گیا۔ اس صورت میں اس طریقہ کے تحت جو نفع کسان کو پہنچنا چاہیئے تھا اس کا کم از کم ایک جزو حکومت کے تصرف میں آیا۔ یہ ایک واحد واقعہ ہے جو مجھے مل سکا۔ لیکن ایسے معاملات میں، سرگذشتوں کا سکوت کسی طور پر فیصلہ کن نہیں ہے۔

دوسری طرف، ایسے واقعات کا ایک قابل توجہ سلسلہ ملتا ہے جس میں حکومت اس بات پر مجبور ہوئی کہ وہ اس بار کے ایک جزو کو جسے اس نے کسانوں کی طرف منتقل کر دیا تھا خود برداشت کرے۔ عہدِ اکبری کے تیسویں اور بتیسویں برس غیر معمولی طور پر اچھی فصلیں ہونے کے باعث، شمالی ہند ایک مصیبت سے دوچار ہوا۔[16] اس وقت کے حالات کے تحت فاضل پیداوار کے لئے کافی منڈیاں نہ تھیں۔ قیمتیں لازمی طور پر بہت کم ہو گئیں اور جو پیدا کرنے والے اپنے ذخیروں کو فروخت نہ کر سکے انھیں مالگذاری کی ادائیگی میں دقّت ہوئی۔ تیسویں برس اور دوبارہ اکتیسویں برس، الہ آباد، اودھ اور دہلی کے تین صوبوں میں معقول مقدار میں تخفیف کی گئی۔ تینتیسویں برس، انھیں صوبوں میں بشمول آگرہ کے اور بتیسویں برس ان کے کچھ حصّوں میں دوبارہ چھوٹ دی گئی۔ اس کے مخالف اسباب یعنی ناموافق فصلوں کی بنا پر، حالانکہ ہمارے علم میں آتا ہے[17] کہ انھیں خطّوں میں اس کے پانچ برسوں بعد قحط کی شدت تھی، مگر مالگذاری میں کسی چھوٹ کا ذکر نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس کی توجیہہ اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ مروّجہ نظام کے تحت خرابی فصل کی بنا پر مطالبہ میں از خود تخفیف ہو جاتی تھی لہٰذا اس موضوع پر کسی خصوصی حکم کی تحریر نہیں ملتی۔ لہٰذا ہم عمومی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکومت ان منافعوں اور نقصانات میں جنھیں اس نے نظری طور پر کسانوں کی طرف حکمتہً منتقل کر دیا تھا، عملاً تھوڑا بہت شریک ہوتی رہی۔

اس عہد کے دوران، نسبتاً زیادہ قدیم صوبوں میں تشخیص مطالبہ کی تاریخ کے متعلق میری تعبیر اس طور پر ہے۔ اولاً تمام صوبوں میں غلّہ کی پیداوار فی بیگھہ شرحوں کا اطلاق قیمتوں کی ایک شرح کی مدد سے کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا اطلاق مقامی قیمتوں کی رو سے ہوا۔ اور جب پیداوار کی مالیت کا مقامی قیمتوں کی شرحوں کے مطابق نقد میں اندازہ لگانے کے طریقہ میں دشواری پیش آنا شروع ہوئیں تو سابقہ تجربہ کی بنا پر نقدی شرحوں کے گوشوارے مقرر کئے گئے جو جہاں تک ہمارے علم میں ہے، عہدِ حکومت کی بقیہ مدّت تک برقرار رہے۔ مطالبۂ مالگذاری کی نظریاتی بنیاد یعنی اوسط پیداوار کا ایک تہائی بجنسہٖ محفوظ رہی۔ جو تبدیلیاں کی گئیں وہ انتظام سے متعلق تھیں یعنی یہ کہ وہ مطالبہ کے حساب کے طریقوں کو متعین کرتی تھیں۔ یہاں بہر حال اس بات کا اضافہ ضروری ہوگا کہ عہدِ اکبری کی آخری دہائی کے متعلق ہماری معلومات نامکمل ہیں۔ آئین میں تاریخی حالات چوبیسویں برس پر پہنچ کر دفعتہً ختم

ہو جاتے ہیں۔ اکبرنامہ میں جو ان حالات کے بیان کو آگے بڑھاتا ہے تینتالیسویں برس کے بعد جب اس کا مصنف دکن کی ملازمت پہ مامور کر دیا گیا' تفصیلات کم ہو جاتی ہیں اور چالیسویں برس اس کے قتل کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ کتاب کا "تکملہ" جسے ایک بعد کے مصنف نے طیار کیا بہت ہی مختصر ہے اور اس میں زرعی موضوعات پر توجہ نہیں دی گئی ہے۔ پس ایسی صورت میں ممکن ہے کہ اس دور میں قطعی تبدیلیاں عمل میں لائی گئی ہوں۔ بلکہ میرے خیال میں زیادہ ممکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تدریجی ارتقار کا سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن ان نکتوں پر قیاس آرائی کار فضول ہے۔

ایک اہم سوال ابھی رہ جاتا ہے۔ کیا تشخیص کی ان شرحوں کا نفاذ پورے صوبہ یعنی جاگیروں میں دئے ہوئے اور نیز محفوظ علاقوں پہ تھا یا صرف استوار حصہ پر جو وزارتِ مال کے براہِ راست زیرِ انتظام تھا؟ پہلے گذر چکا ہے کہ لودی سلطانوں کے عہد میں جاگیرداروں کو تشخیص کے معاملہ میں عملاً پوری آزادی حاصل تھی۔ ہمیں کوئی چیز یہ واضح کرنے والی نہیں ملی کہ اس آزادی کا سلسلہ عہدِ اکبری تک پہونچایا شیر شاہ نے اس میں تخفیف کر دی تھی۔ بہرحال' اسقدر واضح ہے کہ دوسری یعنی قانونگوئی شرحیں جاگیرداروں کو براہِ راست متاثر کرتی تھیں' کیونکہ نقدی تبدل میں تاخیر کے متعلق ان کی شکایات صراحت کے ساتھ درج تحریر ہیں [آئین (1) 348] اور اکبرنامہ [(3)' 381] کی ایک عبارت بالکل واضح کرتی ہے کہ جاگیرداران اور سرکاری محصّلین دونوں ہی دس سالہ شرحوں کے پابند تھے۔ چنانچہ اگر پورے دورِ حکومت میں نہیں تو اس کے بیشتر حصہ میں تشخیص کی مقررہ شرحوں کی ملک کے اس پورے حصہ میں جن میں وہ نافذ تھیں پابندی لازمی تھی۔ اس سے مستثنیٰ امکانی طور پر تحریری طور پر نہیں وہ علاقے تھے جن کے لئے سرداران سالانہ مالگذاری کی کوئی بدلتی ہوئی سالانہ رقم کے بجائے ایک معین خراج ادا کرتے تھے۔

اس کا یہ لازمی مفہوم نہیں کہ ہر جاگیردار مروّجہ شرحنامہ کی مکمل طور پر پابندی کرتا تھا۔ ایک عام انسان جس کا واحد مقصد اپنے حق کی آمدنی بلکہ اگر ممکن ہو تو اس سے قدرے زائد کی وصولی ہو قدرتی طور پر وہ راہ اختیار کرے گا جس میں کم از کم مزاحمت ہو اور جن طریقوں کو وہ رائج پائیگا انھیں سے موافقت کرے گا۔ میرے خیال میں اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ مقررہ تشخیص کی شرحیں پورے ملک میں مطالبہ کا معیار متعین کرتی تھیں۔ عام حالات میں

کوئی بھی جاگیردار ان شرحوں سے جس قدر آمدنی ہو سکتی تھی اس سے کم پر نہ قناعت کرتے ہوئے اس سے زائد ہی وصول کرنے کی کوشش کرتا ہوگا۔ لیکن رسوائی کا خوف' اسے اس سمت میں کوشش کرنے سے باز رکھتا تھا۔ جیسا کہ آگے آئے گا' جاگیرداروں کے متعلق اپنی منظور شدہ آمدنی سے جس قدر زائد وصول کرنے کا علم ہوجاتا اس قدر ان سے واپس لیا جا سکتا تھا اور اس زائد وصولی کے کوئی بڑی رقم ہونے کی صورت میں' جاسوس اور دشمن سرگرم عمل ہوجاتے تھے' درانحالیکہ بادشاہ شکائتیں سنتا تھا اور غالباً اکبر تو تشخیص کے متعلق اپنے احکام کی کھلی ہوئی خلاف ورزی پر سخت بازپرس کرتا تھا۔ بس اس عہد کے حالات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ کسی جاگیردار کے کسان' محفوظ علاقوں کے کسانوں سے بہت زائد نہیں بلکہ اسی قدر ادا کرتے تھے۔

3- جاگیریں

ابھی گذر چکا ہے کہ ایک اہم معاملہ میں اکبر کے تحت مروّجہ جاگیرداری کا نظام صدی کے ابتدائی دور میں رائج نظام سے مختلف تھا اور اس روشنی میں یہ فرض کرنا کہ پورے مسلم دورِ حکومت میں اس نظام کی نوعیت تبدیل نہ ہوئی صحیح نہ ہوگا۔ مغلیہ دور میں اس اس نظام کے بیشتر خطوط کو بہ سہولت متعین کیا جا سکتا ہے اور ان کا مطالبہ لازمی ہے' کیونکہ تقریباً پورے دورِ حکومت کے دوران مملکت کا بہت بڑا اور بعض اوقات کل کا ⅞ حصہ جاگیرداروں کے زیر تصرف تھا۔

جیسا کہ اس کے نام کا مفہوم ہے' اس نظام کا خلاصہ یہ تھا کہ بار بار پیش آنیوالے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے بار بار ہونے والی آمدنی کی مخصوص مدیں علیحدہ کردی جائیں یہ اخراجات لازمتہً تو نہیں مگر معمولاً شاہی عملہ کی تنخواہیں اور ان کے مصارف ہوا کرتے۔ عہدِ مغلیہ میں ملازمتوں (SERVICES) کے بجائے عملہ کہنا ہی درست ہوگا' کیونکہ اس زمانہ میں عملاً فرائض منصبی میں کسی فرق کا وجود نہ تھا۔ ایک بار مقرر ہوجانے کے بعد عہدہ دار کے پورے اوقات کا مالک بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ وہ ملکی انتظام یا فوجی خدمات پر مامور ہو سکتا تھا اور کسی خاص خدمت پر مامور نہ ہونے کی صورت میں' جب تک کہ اسے کہیں اور جانے کی اجازت نہ مل جائے اس کے لئے دربار میں حاضر رہنا ضروری تھا۔ ملازمت کی

اس عمومی بندش کے علاوہ اپنے صوبہ پر ایک ایسی متعین گھوڑ سوار فوج رکھنے کا ذمہ دار ہوتا جو بادشاہ کی ضرورت پر بروقت دستیاب ہو سکے۔ وہ عہدہ دار جو ایسا کرتا اپنے منصب کے اعتبار سے نقد میں قطعی طور پر متعین کی ہوئی ایک آمدنی کا مستحق ہوتا۔ بعض عہدہ دار بطور انعام مستقل رقمیں بھی پاتے تھے جو بہ الفاظِ دیگر ان کی آمدنی میں ایک ایسا اضافہ ہوتا جس کے خرچ پر کوئی بندش نہ ہوتی۔ چنانچہ کسی عہدہ دار کی آمدنی بشمول انعام کے جو اس نے پایا ہو ہمیشہ نقد میں واضح کی جاتی تھی۔ لیکن واقعی ادائیگی خزانہ سے نقد یا ایک مخصوص علاقہ کی مالگذاری کی جاگیر یا کچھ اس شکل میں اور کچھ دوسری شکل میں ہو سکتی تھی۔

سترہویں صدی کے اختتام تک ایک مختصر مدت کو چھوڑ کر، جاگیر کے ذریعہ ادائیگی مملکتِ مغلیہ کا عام قاعدہ تھا اور خزانہ سے ادائیگی مستثنیات میں تھی۔ چند جاگیریں جن کے ساتھ انتظام کے خصوصی اختیارات وابستہ ہوتے، بادشاہ کے ذاتی حکم سے دی جاتی تھیں۔ چنانچہ رنتھمبور یا کالنجر کے ایسے قلعے کے نواحی جاگیر معمولاً قلعہ کی فوجداری کے ساتھ ملحق رہتی اور قنوج یا جونپور کے ایسے بعض تاریخی علاقوں کی بھی یہی حیثیت تھی۔ لیکن عام طریقہ کار کے تحت جاگیروں کی تقسیم، وزارتِ مال کا کام تھا۔ بادشاہ کے کسی تقرری یا ترقی یا انعام کو منظور کر دینے کے بعد اس کے متعلق حکم برائے تعمیل وزارتِ مال کو جاتا تھا۔ اس کام کا بار بیشک زیادہ ہوا کرتا۔ تاریخی کتابوں سے تقرریوں اور ترقیوں کی کثرت کا پتہ چلتا ہے اور ہر حکم کی تعمیل اس کی مناسبت سے جاگیر دے کر کی جاتی تھی۔ دوسری طرف ہر تبادلہ کے نتیجہ میں متعدد انتظامات کرنے ہوتے تھے، کیونکہ ایک عہدہ دار جسے مثلاً لاہور سے پٹنہ تبدیل کیا گیا ہو، اکثر پنجاب میں اپنی جاگیر کے بہار کی کسی جاگیر سے باہمی تبادلہ کو ترجیح دیتا یا کبھی کبھی اس سے ایسا کرنے کی ہدایت دی جاتی۔

مجھے عہدِ اکبری میں وزارتِ مال کی داخلی تنظیم کے متعلق صحیح تفصیلات نہیں مل سکیں لیکن بعض ضمنی حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اگلی صدی کی طرح اس وقت بھی اس کے دو خاص شعبے تھے جن میں سے ایک محفوظ ضلعوں کا انتظام کرتا تھا اور دوسرا جو تنخواہ کا دفتر کہا جاتا، جاگیروں کے جملہ مسائل کا انتظام کرتا تھا۔ موخرالذکر شعبہ کے کام کو آسانی سے تصور کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا حکم موصول ہوتا ہے کہ فلاں عہدہ دار کے لئے کوئی جاگیر فراہم کی جائے جس کی آمدنی مثلاً ایک کروڑ دام ہو۔ دام اکائی تھی جس کی مقدار میں تنخواہیں بلا لحاظ

معین کیے جاتے تھے۔ اب ایسے خالی ضلعے یا پرگنے معلوم کرنے کے لئے جن کی تخمینی آمدنی اس سے زائد نہیں بلکہ ٹھیک اسی قدر ہو، کاغذات کو تلاش کرنا ضروری ہوتا تھا۔ اس فراہمی کے سلسلہ میں ہو سکتا تھا کہ موجودہ انتظامات میں ردوبدل کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔ چنانچہ ہر متعلقہ شخص، محض نیا جاگیردار ہی نہیں، بلکہ موجودہ جاگیرداروں میں جو تبدیل کئے جانے یا تبدیل نہ کئے جانے کے خواہشمند ہوتے وہ سب کے سب اپنے مفاد کے تحفظ کے خاطر سرگرم عمل ہو جاتے اور جیسا کہ آگے آئے گا بعض اوقات حصول مقصد کے لئے رشوتیں پیش کیا کرتے[20]۔ ایسے انتظامات کے سلسلہ میں، ان کاغذات کی جن میں اس آمدنی کا تخمینہ درج ہوتا جو کوئی جاگیردار کسی ضلع یا پرگنہ سے حاصل کرنے کی معقول طور پر توقع کر سکتا تھا بڑی اہمیت ہوتی۔ اس فصل میں جن واقعات کا بیان آئے گا ان کا بیشتر تعلق ان کاغذات کے نشیب و فراز سے ہے جس کے لئے میں نے، جیسا کہ باب دو میں وضاحت آچکی ہے، مالیت کی اصطلاح منتخب کی ہے۔

ہمیں اس کی کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ پہلی مالیت، کیسے، کب اور کس بنیاد پر قائم کی گئی۔ ہماری اطلاع صرف اس قدر ہے کہ اسے رقمی، جو ایک مشتبہ مفہوم کی اصطلاح ہے بیان کیا گیا ہے۔ یہ اوائل عہد اکبری میں مستعمل تھی اور اسے بے اعتباری کی بنا پر مسترد کرنا پڑا[21]۔ سرکاری تحریروں کو میں اس طور پر سمجھا ہوں کہ بیرم خاں کی شاہی نیابت کے دوران شروع میں جاگیریں بہ افراط دی گئیں اور اس وقت کی چھوٹی مملکت مطلوبہ آمدنی فراہم کرنے کی اہل نہ تھی۔ وزارت مال نے مالیت کے اندراج کو من مانی طور پر بڑھا کر اس دقت کو حل کیا۔ اس طور پر، مثلاً ایک کروڑ دام کے کسی جاگیردار کو کاغذات میں مندرج اسی قدر آمدنی کا ایک ضلع ملتا مگر اس کا واقعی حاصل اس سے کم ہوتا۔ ایسے حالات میں، ہماری اطلاع کے مطابق جو بدعنوانیاں پیش آئیں وہ واضح طور پر ناگزیر تھیں۔ مالیت میں مندرج اعداد غیر حقیقی ہو چکے تھے۔

ہر جاگیردار بحد ممکنہ زیادہ سے زیادہ حقیقی آمدنی حاصل کرنے کا خواہشمند رہتا اور گو کہ اس کے حق کو ضابطے کے اندر پورا کر دیا جاتا تھا لیکن اس کی حقیقی آمدنی کی مقدار وزارت کے لطف و کرم پر کلیتہً منحصر رہا کرتی جو اسے ایسے دو اضلاع کا حق انتخاب پیش کر سکتی تھی جو تحریری طور پر تو مساوی مالیت کے ہوتے لیکن حقیقتاً ان میں سے ایک کا حاصل تحریری مقدار کا صرف نصف اور دوسرے کا حاصل تین چوتھائی ہوتا۔

نتیجتہً اس مالیت کا اعتبار اٹھ گیا اور اکبر نے عہدِ حکومت کے گیارہویں برس نئی مالیت کی طیاری کا حکم صادر کیا۔ اس کی طیاری کے طریقہ کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد حقیقی حاصل کے حساب پر رکھی گئی تھی لیکن اسے بظاہر کسی طور پر ترتیب سے رکھ دیا گیا تھا کیونکہ جن اعداد کو بالآخر اختیار کیا گیا وہ نکالی ہوئی تحقیقی حاصل کے مساوی نہیں بلکہ اس کے قریب قریب تھیں۔ یہ مالیت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ یہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی۔ اکبرنامہ [(3) 117] کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ کاغذات میں تبدیلی کے ساتھ وزارت کے طریقِ عمل کی اصلاح نہ کی گئی حکمران اعداد کو بے حساب بڑھا دیتے تھے اور وہ انہیں بڑھانے اور گھٹانے کے سلسلہ میں "رشوت کا ہاتھ پھیلاتے تھے"۔ ہر شخص اپنے حصولِ مقصد کے لئے جو چاہتا کرتا تھا جس کے نتیجہ میں شاہی ملازمت کے انضباط اور خود اعتمادی کے لئے جس میں بے اطمینانی سرایت کر گئی تھی ایک شدید خطرہ لاحق ہو گیا۔

اکبر نے اس صورتِ حال کو بظاہر بہت شدت سے محسوس کیا کیونکہ اس نے اٹھارہویں برس [(3)، 69] اپنے ملازموں کے بیشتر حصہ کو نقد تنخواہ ادا کرنے اور شمالی صوبوں کو براہِ راست اپنے انتظام میں لانے کے سمت سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا گیا یا ممکن ہے، اس خیر مقدم کا محرک راجہ ٹوڈرمل رہا ہو۔ لیکن اس کے افسرِ اعلیٰ مظفر خاں نے اس کی مخالفت کی۔ لہٰذا اس پر عمل درآمد کو اگلے سال تک جبکہ مظفر خاں مردودِ بارگاہ ہوا، موخر کیا گیا۔ انیسویں برس محصلوں کا ایک کثیر عملہ مقرر کر کے [(3) 117] اس مقصد سے قائم کئے گئے حلقوں پر انھیں مامور کیا گیا۔ اس وسیع انتظامی کارِ عظیم کے ضابطوں پر اگلی فصل میں بحث آئیگی اور فی الوقت صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ ہماری اطلاع کی حد تک اسے پانچ برسوں تک جاری رکھ کر ترک کر دیا گیا۔ براہِ راست انتظام کے حدود میں ملتان اور لاہور، دہلی اور آگرہ، اودھ اور الہ آباد جنھیں ہم پرانے صوبے کہہ سکتے ہیں، اور نیز اجمیر و مالوہ شامل کئے گئے۔ لیکن یہ فرض کرنے کے وجوہ نہیں پائے جاتے کہ اس کا اطلاق کم از کم نسبتاً زیادہ اہم سرداروں کے علاقوں پر کیا گیا اور اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ آخرالذکر دو صوبے جہاں ایسے سرداروں کی کثرت تھی نئے انتظام سے بہت زیادہ متاثر نہ ہوئے۔

براہِ راست زیرِ انتظام لائے گئے علاقوں میں، تاریخی کتابوں میں زیرِ بحث عہد کے دوران جاگیروں کی موجودگی کے مجھے صرف تین حوالے ملتے ہیں۔ ان میں دو قصبے چنار اور رنتھمبور ایسے

انتظامی علاقے تھے جن کے ساتھ جاگیریں منسلک تھیں اور ہم انھیں براہِ راست انتظام کے اصول سے ایک عمومی انحراف کا مظہر نہیں تصور کر سکتے تیسرا حوالہ بعض راجپوتوں کے متعلق ہے جنھیں بظاہر سیاسی وجوہ کی بنا پر پنجاب کی جاگیروں پر آباد کیا گیا تھا جن پر انھوں نے تیئیس برس تک اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ ہم اسے بھی بجا طور پر ایک استثنائی صورت تصور کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انیسویں سے چوبیسویں برس تک اس علاقہ میں معمولاً جاگیریں نہ دی جاتی تھیں جس کی وجہ سے مالیت کی ضرورت نہیں تھی۔[24]

چوبیسویں برس حالیہ تجربہ کی بنیاد پر ایک ہی مالیت طیار کی گئی۔ ماخذ کی مبہم عبارتوں کو جیسا میں سمجھ سکا ہوں اس کے مطابق دس برس کے سرکاری مطالبہ کا اوسط نکالا گیا۔ یہ وہ مدت تھی جس کے دوران قانونگوئی شرحیں رائج تھیں۔ پھر اس اوسط کو اس مدت کے دوران پیداواروں میں جو بہتری ظاہر ہوئی تھی اس کے پیش نظر بڑھا دیا گیا۔ بہرحال تفصیلی طریقۂ کار جو بھی رہا ہو اس امر سے کہ ایک نئی مالیت طیار کی گئی یہ قوی اشارہ ملتا ہے کہ اب جاگیرداری کے سابقہ نظام کی طرف مراجعت کا فیصلہ کیا جا چکا تھا اور میرے خیال میں اگلی دہائی کے دوران صوبوں میں جاگیرداروں کے جو حوالے ملتے ہیں وہ اس قیاس کی قطعی طور پر تائید کرتے ہیں۔ ہم اس شہادت کی اس طور پر تلخیص کر سکتے ہیں۔ جو حوالے دیئے جاتے ہیں وہ اکبرنامہ کے متن کی تیسری جلد سے متعلق ہیں۔

چوبیسویں برس کے اختتام پر صوبجات الہ آباد اودھ کے چند نامزد اشخاص اور دیگر جاگیرداروں کے نام احکام (287) صادر ہوئے۔

پچیسویں برس مالوہ (314) اور اجمیر (318) کے جاگیرداروں کے نام احکام صادر ہوئے جبکہ لاہور میں دوسرے جاگیرداروں کے بھی حوالے (345) آتے ہیں۔

چھبیسویں برس ہمیں لاہور میں دو جاگیروں (348، 350) بہرائچ (اودھ) میں متعدد جاگیروں (370) اور لاہور میں بعض دوسرے جاگیرداروں (372) کی اطلاع ملتی ہے۔

ستائیسویں برس، ہم دہلی میں ایک جاگیر (397) کے بارے میں اور اٹھائیسویں برس اودھ اور الہ آباد میں متعدد جاگیروں کے نام احکام (398) کے بارے میں اور کالپی (آگرہ) کے جاگیردار (415) اور رائے سین (مالوہ) کے جاگیردار کے بارے میں (422) سنتے ہیں۔

تیئیسویں برس عمومی احکام شمال کے جملہ جاگیرداروں کو دکن کی مہم کے لئے طیار ہونے کے

متعلق جاری ہوئے۔

اکتیسویں برس، ہمیں مالوہ میں ایک جاگیر کی (489) اور اجمیر میں دوسری (512) کی اطلاع ملتی ہے۔

بتیسویں برس ہمیں لاہور میں جاگیروں کی (525) اور چونتیسویں برس ملتان میں جاگیروں کی (536) اطلاع ملتی ہے۔ بظاہر یہ مسلّم صوبہ جاگیروں میں دے دیا گیا تھا۔

مزید براں، مالگذاری کی چھوٹ کے کاغذات میں جن پر پہلے بحث آ چکی ہے، الہ آباد، اودھ، آگرہ اور دہلی کے محفوظ علاقوں میں چھوٹ کی منظور شدہ رقمیں اس قول کے ساتھ درج کی گئی ہیں (533) کہ جاگیرداروں کی دی ہوئی چھوٹ کی رقموں کا انھیں اعداد کی بنیاد پر تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔

حالانکہ پالیسی میں کسی تبدیلی کا کوئی باضابطہ اندراج نہیں ملتا مگر واقعات قطعی طور پر شاہد ہیں کہ چوبیسویں برس کے بعد جاگیریں ان تمام صوبوں میں جہاں یہ متروک ہو گئی تھیں دوبارہ عام ہو گئیں۔ یہاں اس بات کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد جو احکام صادر کئے (تزک 4) اُن سے اس میں ذرا بھی شبہہ باقی نہیں رہتا کہ اس وقت تک مملکت کا بیشتر حصّہ، جاگیرداروں کے قبضہ میں تھا۔ اس موضوع پر بعض پچھلے مصنفین نے (بشمول میرے) اکبر کے اپنے عہد کے اٹھارہویں برس کے فیصلہ کا یہ مفہوم لیا ہے کہ وہ جاگیرداری کے نظام کو ناپسند کرتا تھا اور اس نے اسے ختم کرنے کا مصمّم ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن جن حقائق کی اوپر تلخیص کی گئی ہے وہ اس تعبیر کو ناممکن بنا دیتے ہیں۔ ممکن ہے اس نے فی الوقت اس نظام سے متنفر ہو کر اس کی متبادل صورت کی تلاش کی کوشش کی ہو۔ لیکن اس صورت میں متبادل صورت کے متعلق پانچ سال کے تجربہ سے صحیح صورتِ حال اس کے سامنے آ گئی۔ میرے خیال میں یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس کے اس عمل کا مقصد اس نظام کو صرف اس وقت تک کے لئے معرضِ التوا میں رکھنا ہو جب تک کہ ایک واقعی قابلِ عمل مالیت کے لئے کافی مواد اکٹھا نہ ہو جائے اور یہ کہ مطلوبہ تجربہ حاصل ہو جانے کے بعد اس نے اسے دوبارہ بحال کیا۔ اس مسئلہ کے متعلق جو بھی خیال قائم کیا جائے یہ حقیقی امرِ واقعہ ہے کہ پچیسویں برس اور اس کے بعد سے نظام جاگیرداری پوری مملکت کے زرعی نظام کے معمولات میں تھا اور سترہویں صدی ختم ہونے تک یہ صورت برقرار رہی۔

اوپر گذر چکا ہے کہ جاگیردار کو صرف اپنی منظور شدہ آمدنی کی حد تک کی وصولی کی اجازت

تھی اور اسے اپنی زائد وصول کی ہوئی رقم کے لئے شاہی خزانہ میں حساب دینا ہوتا تھا۔ مجھے بہرحال عہدِ اکبری میں اس موضوع پر کوئی اہم حوالہ دستیاب نہ ہو سکا۔ لہذا ہمیں اس موضوع پر بحث کو ایک اگلے عہد کے لئے جب کہ زیادہ شہادتیں ملتی ہیں ملتوی کر دینا چاہئے۔ اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ مالیت پر بار بار نظرِثانی کئے جانے کے ایک متبادل صورت کے طور پر زائد رقم کی وصولی کے طریقہ نے بتدریج نشو ونما پایا ہو۔ لیکن اس موضوع پر میرے پاس کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ازسرِنو کسی دوسری عمومی مالیت کی طیاری کے متعلق جیساکہ چوبیسویں برس عمل میں آئی، اس کے بعد کوئی تحریری اندراج نہیں ملتا۔

اس موضوع کو ختم کرنے کے قبل، ملازمتی جاگیروں (بشمول انعامات) اور ان مختلف عطیات اور اوقاف کے درمیان جنھیں اس عہد کی تحریروں میں 'سیورغال' کے زمرہ میں رکھا گیا ہے، امتیاز کے متعلق کچھ لکھنا مناسب ہوگا۔ عملی طور پر ان کے درمیان خاص امتیازِ طریقِ کار کا تھا۔ بادشاہ اپنی مرضی سے عطیات بہ شکل نقد یا زمین منظور کرتا تھا اور ایسا ہی تقرریوں اور ترقیوں کے معاملہ میں بھی تھا۔ لیکن عطیات کے متعلق اس کے احکام کی بجاآوری وزارتِ مال نہیں بلکہ حکومت کا ایک اعلیٰ عہدہ دار 'صدر' کرتا تھا۔ اس شعبہ کے انتظام کی تاریخ میں گونا گونی رہی ہے[26] اور اس پر بحث ضروری نہیں۔ اس کی تاریخ میں فراخدلی بلکہ اسراف کے ساتھ ساتھ کفائیت کے دور بھی آتے رہے ہیں۔ لیکن فی الجملہ اس طریقہ سے جو آمدنی منتقل کی گئی تھی اس کی مقدار کافی زیادہ تھی۔ ان عطیات کی میعاد کو "مرضی کے دوران" ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے متعدد ایک یا ایک سے زائد زندگی کی مدت تک کے لئے تھیں۔ لیکن جیسا کہ بلاکمین کی منقول عبارتوں سے ظاہر ہے پالیسی یا اشخاص تک کی تبدیلی کے نتیجہ میں منسوخی یا بہت زیادہ تخفیف عمل میں آسکتی تھی۔

ضابطۂ کار میں ایک مزید فرق یہ تھا کہ جاگیریں تو بمقدار آمدنی، لیکن زمینی معافیاں عام طور پر بمقدار رقبہ دی جاتی تھیں۔ اس کے حقدار کو زمین کے معین بیگھے کسی نامزد علاقہ میں منظور کئے جانے کے بعد مقامی عہدہ داروں کو اس کی حد بندی کرنے اور اس پر قبضہ دلانے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ اس عہد کے مروجہ ضابطہ کو گجرات کے ایک پارسی خاندان کے پاس محفوظ دستاویزات کے ایک مجموعہ میں[27] مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض دستاویزات میں معافیاں بالکل شخصی ہیں اور بعض دستاویزات معافیدار اور "اس کی اولاد" کے حق میں تحریر کئے گئے ہیں۔ اس فقرہ

کی ایک سے زائد تعبیر ہو سکتی ہے لیکن اس سے یہ قطعی طور پر واضح ہے کہ معافی کم از کم دو اشخاص کو دی گئیں۔ ان دستاویزوں سے ایک دلچسپ تفصیل جو سامنے آتے ہیں وہ یہ ہے کہ اکبر نے اپنے عہد کے چالیسویں اور اڑتالیسویں برس کے دوران گجرات میں گذارہ کی تمام زمینی معافیوں کو بقدر نصف کم کرنے کے عمومی احکام صادر کئے تھے۔ اس عمل سے مذکورہ بالا نتیجہ کی عطیات کی میعاد بالکل بادشاہ کی "مرضی کے دوران" محدود رہا کرتی قطعی شہادت فراہم ہوتی ہے۔ دوسری طرف مستقلیوں یا تجدیدوں کی مثالوں اور مقامی حکّام کے نام احکام کی عبارت سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ماتحت حکّام بھی معافیداروں کے معاملات میں عملاً دخیل ہو سکتے تھے۔

بہر حال باوجودیکہ کوئی بھی معافی بلا تامل مسترد یا ترمیم کی جا سکتی تھی، لیکن یہ سوچنے کے وجوہ موجود ہیں کہ اس کی منظوری کے بعد اس کے پانے والے کو کچھ ایسی امید بندھ جاتی تھی کہ وہ اور اس کے اہل خاندان حکومت کی فراخدلی سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ مذکورہ بالا مطبوعہ دستاویزات کے علاوہ، دارالمطالعون یا نجی طور پر لوگوں کے پاس ایسے متعدد دستاویزات کی موجودگی میرے علم میں آئی ہے جن کے محفوظ رکھے جانے سے ان کی اہمیت کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ہم ان تحریروں کو کسی مخصوص علاقہ یا کسی معینہ آمدنی کے دستاویزات ملکیت تو نہیں تصوّر کر سکتے لیکن یہ اس امر کی شہادت فراہم کرتی ہیں کہ ماضی کے کسی عہد میں وہ خاندان جن کے قبضے میں یہ تحریریں ہیں بادشاہ کی عنایت سے مستفیض ہو چکے ہیں اور مسلم دور میں جب بھی عطیہ کے لئے کوئی نئی استدعا پیش کی جاتی تو غالباً اس حقیقت کی کچھ اہمیت رہا کرتی تھی۔

4۔ محصّلین

پچھلی فصل میں، تمام شمالی صوبوں میں محصّلین کی تقرری کے تذکرہ میں سرکاری بیان کی تقلید کی گئی ہے جو میری رائے میں جیسا کچھ بھی ہے درست ہے۔ لیکن یہ بعض پہلوؤں سے نامکمل ہے۔ اس فصل میں میری تجویز عبدالقادر بدایونی کی تحریر کی ہوئی سرگذشت میں مندرج بیان پر بحث کرنے کی ہے جو بادی النظر میں ابوالفضل کے بیان سے بہت زیادہ متناقص ہے۔ بدایونی کے بیان پر غور کرتے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس نے ایک دل شکستہ انسان کی حیثیت سے اسے لکھا تھا کیونکہ وہ حسبِ خواہش ترقی حاصل نہ کر سکا تھا اور اس کے مذہبی جذبات بھی اکبر کے اسلام کے تئیں روّیہ سے پامال ہو چکے تھے۔ لہذا

وہ قطعی طور پر مخالفوں میں تھا۔ میرا اپنا رجحان اس کی سرگزشت کو تاریخ کے بجائے مشاہدات یا صحافت تصور کرنے کا ہے۔ اس نے اپنے موضوعات کو ان کی اصل اہمیت کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنی دلچسپی کی بنا پر منتخب کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس نے قیاس آرائی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اپنے پسندیدہ حقائق پر اپنے ذاتی محسوسات یا میلانات کا رنگ چڑھا کر انھیں طنزیہ اور تیز الفاظ میں پیش کیا ہے۔ لیکن ہمیں ان کو بہت زیادہ لفظی معنوں میں نہ لینا چاہئے۔ محصلین کے متعلق اس کا بیان ایک قدرے طویل داستان پر مختصر تبصرہ کی شکل میں ہے۔ اس نے تاریخیں درج کرنے کی زحمت نہیں گوارا کی ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں نے سمجھا ہے اس نے ان باتوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جو اسے دلچسپ معلوم ہوئیں جس حصّہ سے ہمارا تعلق ہے حسب ذیل ہے۔

اس سال (۱۸ جلوس) ملک کی کاشتکاری کو بڑھانے اور کسانوں کی حالت سدھارنے کا نیا خیال پیدا ہوا۔ ملک کے پرگنوں خواہ وہ خشک ہوں یا زیر آبپاشی شہروں میں واقع ہوں یا پہاڑوں پر ریگستانوں میں ہوں یا جنگلوں میں دریاؤں کے کنارے ہوں پانی کے ذخیروں یا کنوؤں کے کنارے سب کی پیمائش کرنی چاہئے .... تاکہ تین سال کی مدت میں تمام ویران زمین کی کاشت ہو جائے اور خزانہ کی ترقی ہو ....

مگر بالآخر ان احکام کی صحیح طور پر تعمیل نہیں ہوئی۔ محصلین کی لوٹ مار سے ملک کا ایک بڑا حصّہ ویران ہو گیا، کسانوں کی عورتیں اور بچے فروخت ہو کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور ہر چیز میں افراتفری پھیل گئی۔

لیکن راجہ ٹوڈرمل نے محصلوں کا محاسبہ کیا اور بہت سے اچھے اچھے لوگ شدید زدوکوب اور شکنجوں اور موچیوں کی صعوبت سے مر گئے۔ حکام مال کے قید خانوں میں مسلسل بند رہنے کے باعث ان میں سے اتنے زیادہ ہلاک ہو گئے کہ جلاد یا تیغ زنوں کی ضرورت باقی نہ رہی اور کوئی بھی ان کے لئے قبر یا کفن کا تلاش کرنے والا نہ تھا۔

یہ عبارتیں بدایونی کے اسلوب تحریر کی بخوبی وضاحت کرتی ہیں۔ ابتدائی فقرے نظام الدین احمد کی تصنیف طبقاتِ اکبری پر مبنی ہیں جسے اس نے اپنی سرگذشت کے ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لیکن عبارت میں تقریباً غلط بیانی کی حد تک مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے بیان کے تاریخ واری سلسلہ کو توڑ کر حالات کا بقیہ حصّہ جس کا سابقہ سرگذشت

(طبقات اکبری) میں حوالہ نہیں آتا تحریر کرتا ہے۔ جو نکتے ہماری توجہ کے مستحق ہیں تین ہیں محصلین کی تقرری کی غایت، تقرری کے بعد ان کی بدعنوانیاں اور ٹوڈرمل کی محاسبہ کے سلسلہ میں سخت کارروائیاں۔

بدایونی کا بیان ہے کہ براہِ راست انتظام کا منشا رکاشت کی توسیع، کسانوں کا نفع اور مالگذاری میں اضافہ تھا۔ سرکاری بیان کے مطابق جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے اس کا منشا نگرانی کے ان اسباب کا ازالہ تھا جو شاہی عملہ کے انضباط اور خود مختاری کو تباہ کر رہا تھا طبقاتِ اکبری کی عبارت جس پر بدایونی کا بیان مبنی ہے اس طور پہ ہے:

"چونکہ ہندوستان کی بہت سی زمین غیر مزروعہ اور بیرتی ہونے کے ساتھ ساتھ اس لائق تھی کہ پہلے برس اس کی کاشت کی جائے جو کسانوں اور وزیر مال دونوں کے لئے یکساں طور پر فائدہ مند صورت ہوتی لہذا بادشاہ (القاب) نے بہت غور و فکر کے بعد حکم صادر کیا کہ مملکت کے پرگنوں کے رقبہ کی جانچ کی جائے اور یہ کہ اسی قدر زمین جس کا کاشت کے بعد حاصل ایک کروڑ ٹنکہ ہو علیحدہ کر کے ایک عہدہ دار (القاب) کے سپرد کر دی جائے۔ اس عہدہ دار کو کروڑی کے نام سے موسوم کریں اور اسے ایک محرّر (کارکن) اور خزانچی کے ساتھ پرگنہ پر روانہ کر دیں تاکہ اس کی کوششوں اور مشقت سے غیر مزروعہ زمین زیرِ کاشت آکر صحیح مطالبہ وصول ہو سکے"

اس طور پر ہمارے پاس سرکاری بیان کے متناقض دو غیر سرکاری سرگذشتیں ہیں۔ نظام الدین احمد اور بدایونی کا بیان کیا ہوا منشا اپنی جگہ قابلِ یقین ہے اور جو بات اس سے زیادہ مناسب متوقع ہے اسے عہد اکبری کے سرکاری حلقوں میں بہت زیادہ قابلِ یقین خیال کیا جاتا ہوگا۔ پھر ہم اسے ایک سرکاری اور معمولی ایک مدّحیہ تحریر میں کیوں نظر انداز کر دیں جس میں اس کے برخلاف ناقابلِ یقین واقعات بیان کئے گئے ہیں، کیونکہ ایک صحیح مالیت کو طیار کرنے کا اہل نہ ہونا متعلقہ انتظامیہ کے قطعاً شایانِ شان نہیں؟ میرے خیال میں ایسی صورت میں ہم اس لحاظ سے سرکاری اور کم قابلِ یقین بیان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ تبدیلی کا براہِ راست سبب حقیقتاً اکبر کا شاہی ملازموں کے معاوضہ کو زیادہ قابلِ اطمینان بنیادوں پر استوار کرنے کا عزم تھا۔ لیکن اس نظریہ کو قبول کرنے کا مفہوم غیر سرکاری مصنفین پر یہ الزام عاید کرنا نہیں ہے کہ انہوں نے عمداً ایک نسبتاً زیادہ قابلِ یقین منشا گڑھ لیا۔ میرا قیاس یہ ہے کہ اکبر کا اپنا خود

ایک منشا رتھا لیکن وزارتِ مال نے غالباً اس کے اتفاق رائے سے ایک دوسرا منشا رشامل کردیا۔ اس تبدیلی کا شعبہ جاتی نکتہ نگاہ سے کیا مفہوم رہا ہوگا اسے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ابھی تک وزارت مال زرعی ترقی کی روایتی پالیسی کو محض اپنے براہِ راست انتظام کے چھوٹے علاقوں میں نافذ کر سکتی تھی۔ لیکن نئے احکام کے تحت اب اس کے عمل کا دائرہ پورے شمالی ہندوستان پر ملتان سے لے کر الہ آباد تک پھیل گیا۔ یہ پورے وثوق کے ساتھ فرض کیا جا سکتا ہے کہ زرعی ترقی کی اس روایتی پالیسی کو اس وقت مقرر کئے گئے محصلین کی کثیر تعداد کو ذہن نشین کرایا گیا ہوگا اور غالباً اس قدر مبالغہ کے ساتھ کہ بدایونی کو اس کا مذاق اڑانے کی ترغیب ہوئی۔

پھر ہم یہ مشکل ہی سے باور کر سکتے ہیں کہ اکبرنامہ میں مندرج ناقابلِ یقین واقعات کو مشتہر کرنے کی وزارت مال خواہشمند رہی ہوگی۔ اس لئے واضح راہ یہ تھی کہ وہ ایک ثانوی اہمیت کی حامل مگر زیادہ قابلِ یقین محرک پر زور دیتے ہوئے دیگر زیادہ اہم مقصد کو نظر انداز کردے۔ اکبرنامہ کی تحریر کے دوران اس مسئلہ پر سکوت اختیار کرنے کے اسباب باقی نہ رہے تھے کیونکہ واقعات زیرِ بحث اب تاریخ کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ لیکن فی الوقت سب سے زیادہ دانائی کی راہ یہ تھی کہ ان کے متعلق کوئی بات بالاعلان نہ کہی جائے بلکہ اسی بیان کی اشاعت کی جائے جنھیں غیر سرکاری وقائع نگاروں نے تحریروں میں محفوظ کر دیا ہے۔

یہ تصوّر کرنا ضروری نہیں کہ یہ راہ اختیار کرنے میں وزارت نے خود مختاری سے کام لیا کیونکہ ممکن ہے کہ خود اکبر نے ایک ایسے بیان کو مشتہر کرنا جو اس کی اصل منشا کو صحیح صحیح ظاہر نہ کرتا ہو زیادہ تر عقل خیال کیا ہو۔ بہر حال یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ غیر سرکاری روایت کو کیونکر اشاعت حاصل ہو سکتی تھی۔ لیکن میرے خیال میں یہ تصوّر کرنا مشکل ہے کہ اکبرنامہ میں مندرج کمزور روایات ابوالفضل کی ایجاد ہے۔

اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کے سلسلہ میں اکبرنامہ کے مصنّف کا سکوت ایک ایسا قدرتی عمل ہے جو توجیہ کا محتاج نہیں۔ مصنّف کے نقطۂ نگاہ سے پچھلے رسوا کن واقعات کے متعلق سرکاری تحریروں کا سکوت کسی خاص اہمیت کا حامل نہ تھا۔ لیکن فی الحقیقت اکبرنامہ میں مندرج دو دستاویزات، میرے خیال میں بدایونی کے بیان کی بخوبی گو بالواسطہ طور پر تائید کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اس طور پر کہ ان سے اولاً محصّلین کے انتہائی مظالم اور ثانیاً محاسبہ میں بے رحمی اور پھر راجہ ٹوڈرمل کے عملاً بیدخل کئے جانے کا پتہ چلتا ہے۔ یہ دستاویزات

پیچیدہ اور ساتھ ساتھ اہم ہیں اور ان کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ نظم و نسق کے سلسلہ میں راجہ کی حیثیت کو قدرے تفصیل سے سمجھا جائے۔

سب سے پہلے ہمیں اس مسلسل روایات کو یاد رکھنا چاہئے کہ ٹوڈرمل دیانتداری اور اپنی عظیم صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ضد، بدمزاجی اور کینہ پروری کے خصائل سے بھی متصف تھا اور ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ایک ممتاز مالی منتظم کے علاوہ، وہ میدان جنگ میں بحیثیت ایک سپہ سالار کے مسلسل کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ لہٰذا اکثر فوجی خدمات کے لئے وہ وزارت مال سے بلالیا جاتا تھا اور انیسویں اور چھبیسویں برس کے دوران اس کا وزارت کے کاموں سے بہت کم تعلق رہا۔ اٹھارہویں برس وہ بہار اور اس کے بعد بنگال بھیجا گیا تھا۔ اس وقت ایک عارضی انتظام کیا گیا تھا جس کے تحت اس کے وزارتی عملہ کو تبدیل نہ کیا جا سکتا تھا اور اس کی پالیسی پر عمل درآمد ضروری تھا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ حقیقت میں ابتداً بھرتی کئے گئے محصلین کی ذمہ داری اسی پر تھی حالانکہ وہ ان کی تقرری کے وقت واقعۃً وزیر نہ تھا۔ وہ بیسویں برس وزارت پر واپس ہوا لیکن اس کے تقریباً فوراً بعد ہی بنگال روانہ کر دیا گیا اور اب خواجہ شاہ منصور نے وزارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ بنگال سے راجہ گجرات گیا اور پھر بائیسویں برس، ہم اسے اور شاہ منصور کو وزارت میں ایک ساتھ کام کرتا ہوا پاتے ہیں لیکن ان کے درمیان واضح طور پر اختلاف تھا اور سابق وزیر اعظم مظفر خاں کو بظاہر ان کے مابین مصالحت کرانے کی غرض سے دربار میں واپس بلالیا گیا کیونکہ ان دونوں کو اس کے "مشورہ سے" کام کرنے کی ہدایت دی گئی۔ اگلے سال ٹوڈرمل ایک کار خاص پر پنجاب گیا اور مظفر خاں کے دربار سے ہٹنے پر، شاہ منصور تنہا وزیر مال کی حیثیت میں رہ گیا اور چوبیسویں برس تک اس طور پر کام کرتا رہا۔ اکبر کا ارادہ تھا کہ اس برس کی اصلاحات کو یہ دونوں مشترکاً نافذ کریں، لیکن اسنے ٹوڈرمل کو دوبارہ بنگال بھیجنے کی ضرورت محسوس کی جہاں وہ چھبیسویں برس تک مقیم رہا۔

اس اثناء میں راجہ اور شاہ منصور کی درمیان سخت نزاع پیدا ہوئی اور آخر الذکر کو تاتحقیقات قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ بحال ہوا، لیکن چھبیسویں برس کے اختتامی دنوں میں دشمن کے ساتھ باغیانہ خط و کتابت کے الزام میں اسے قتل کر دیا گیا۔ اگلے سال ٹوڈرمل وزارت پر واپس ہوا اور ستائیسویں برس وہ عملاً پوری مملکت کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اپنی ترقی کے انتہائی عروج پر پہونچا۔ اس نے اس عہدہ پر فائز ہونے کے بعد مذکورہ دو میں

سے پہلے دستاویز کو تحریر کیا جس کی ہمیں جانچ کرنی ہے۔ اس دستاویز میں مقامی مالی انتظام کی خرابیوں کے ازالہ کے لئے تجاویز کا ایک مجموعہ ملتا ہے جس کی بادشاہ نے باضابطہ منظوری دے دی تھی۔ اگلے برس اسکی ذمہ داریوں کو کم کر کے محض مالی معاملات تک محدود کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد جلد ہی اسے تھوڑے عرصے کے لئے عملاً بے دخل کر کے اسے فتح اللہ شیرازی کے مشورہ سے کام کرنے کی ہدایت کی گئی۔ فتح اللہ ایک غیر ملکی شخص تھا جسے اکبر نے بیجاپور سے اپنے دربار میں طلب کر لیا تھا۔ اسے عارضی طور پر امین الملک کے عہدہ پر مامور کر کے مظفر خاں کے زمانہ یعنی تقریباً تئیسویں برس سے وزارت مال میں جس قدر پرانے مقدمات چل رہے تھے انھیں ختم کرنے کا حکم دیا گیا۔ امین الملک نے دوسرا دستاویز ترتیب دیا تھا جسے اکبر نے تئیسویں برس منظور کیا۔

پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکیسویں سے پچیسویں برس تک شاہ منصور صحیح معنوں میں وزیر مال رہا۔ اب بدایونی کے بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ براہِ راست انتظام کی ابتداً اچھی رہی، اس کے بعد وہ ناکامیاب ہوا کیونکہ اس کے قول کے مطابق بالآخر ضابطوں کی بہ طریق مناسب تعمیل نہ ہوئی۔ لہٰذا اہم ناکامیابی کو شاہ منصور کے دورِ وزارت سے منسوب کر سکتے ہیں۔ ٹوڈرمل نے عہدہ وزارت کو مؤثر طور پر سنبھالنے کے بعد معاملات کو سدھارنے کی کوشش کی اور اگر ہم اس کی تجاویز کو جو لفظ بہ لفظ اکبر نامہ [3)' 381] میں درج ہیں' ایسی عملی کاروائیاں جن کا مقصد واضح نقائص کو رفع کرنا تھا تصور کر لیں تو یہ سمجھنا کہ نقائص واقعتہً کیا تھے آسان ہو جائے گا۔ مقامی حکام نے تشخیصی شرحوں کو تبدیل کر دیا تھا اور وہ کسانوں سے بہت زیادہ طلب کرتے تھے۔ سالانہ پیمائشوں کے سلسلہ میں مظالم کے نتیجہ میں کاشتکاری میں بڑھتی ہوئی تخفیف ہو رہی تھی۔ کسانوں کو بغیر معقول ضمانت کے قرضے دیئے گئے تھے۔ آفات کی تحریروں میں جعلسازیاں کی گئی تھیں، وصولیاں کرنے اور ان کے جمع کے سلسلہ میں بہت سی بدعنوانیاں ہوئی تھیں۔ مقامی حکام پر کوئی مؤثر نگرانی نہ تھی۔ اس فردِ الزام جس کا مدار ٹوڈرمل کی شہادت پر ہے اور بد انتظامی کے متعلق بدایونی کے خطیبانہ بیان میں کوئی بنیادی فرق نہیں پایا جاتا۔ کاشتکاری میں ایک اضافہ پذیر تنزلی سے "ملک کے ایک بہت بڑے حصہ کے ویران کئے جانے" تک یہ محض ایک چھوٹا سا قدم ہے۔ ظالمانہ زائد وصولی اور وصولی میں جعلسازی کے نتیجہ میں قدرتی طور پر عورتیں اور بچے فروخت کئے جاتے تھے جو بقایوں کی وصولی کا ایک مسلّمہ طریقہ تھا اور فی الجملہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بدایونی کے بیان کی

تصدیق سرکاری تحریر سے ہوتی ہے۔

بدایونی کے ٹوڈرمل کی سختی کے بیان کے طرف رجوع کرتے ہوئے میرے خیال میں امین الملک کی تقرری کا سوائے اس کے کوئی اور مفہوم نہیں ہو سکتا کہ اکبر نے یہ محسوس کیا کہ راجہ نے حدود سے تجاوز کیا ہے۔ ٹوڈرمل کی کاروائیاں جیسا کہ یہ بدایونی کے بیان سے ظاہر ہوتی ہیں واضح طور پر حساب فہمی کے اس پرانے اور ظالمانہ عمل کی تکرار تھی جنھیں محاسبہ کہتے تھے۔ اور جس پر ہم چودھویں صدی میں عمل ہوتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔ یہ عمل ابھی تک متروک نہ ہوا تھا کیونکہ اسی مصنف سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے [(2) 280] کہ بنگال میں مظفر خاں نے قدیم رواج کے مطابق محاسبہ کے طریقہ پر عمل کیا" اور یہ غالباً ایک معنی خیز امر ہے کہ امین الملک کو جن مقدمات کو طے کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا ان میں سے بعض اس زمانہ کے تھے جب افسر بالا وزارت مال میں کام کر رہا تھا۔ یہ کاروائیاں واضح طور پر برسوں سے چل رہی تھی اور محصلین سے بہ طرز قدیم، کوڑے مار کر اور ایذائیں پہونچا کر محاسبہ کیا جا رہا تھا یہاں تک کہ اکبر نے اس صورت حال کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس خیال کی امین الملک کی تجاویز کی نوعیت سے مکمل طور پر تائید ہوتی ہے۔ یہ دستاویز انتہائی مبہم ہے کیونکہ اس میں وزارت اور مقامی عملہ کے باہمی تعلق کی جزوی تفصیلات پر بحث آئی ہے۔ لیکن اس کا عمومی مقصد بجا طور پر محصل کی حالت کو بہتر بنانا بیان کیا گیا ہے۔ اس کے شرائط سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس زمانہ کے طریقہ کے مطابق ہر منفرد محصل اپنے علاقہ پر تشخیص کی گئی مالگذاری کا ذاتی طور پر ذمہ دار ہوتا تھا۔ لیکن موجودہ اصطلاح کے مطابق "وصولیوں کی جانچ" مسلسل نہیں بلکہ کبھی کبھی کی جاتی تھی۔ یعنی یہ کہ محصل کو کچھ دنوں تک اپنے حسابات کو کھلی ہوئی حالت میں رکھنے دیتے تھے اور اس کی برطرفی یا تبادلہ کے موقع پر یا جب کبھی بھی اسے صدر مقام پر طلب کرتے اس وقت ان حسابات کو موقع پر نہیں بلکہ وزارت کے دفتر میں جانچتے تھے۔ اس وقت اسے محاسبین کو مطمئن کرنا ہوتا تھا کہ اس نے کل واجب مطالبہ وصول کر کے خزانہ میں جمع کر دیا ہے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اسے اس رقم کو جس کا وہ اطمینان بخش جواب نہ دے سکے خود پورا کرنا ہوتا تھا۔

اس طریقہ کے پس منظر میں امین الملک کی یادداشت کے مطالعہ اور اس کی تجاویز سے لے کر پچھلے حالات تک جن کی اصلاح کے لئے وہ کوشاں تھا دلائل لانے کے بعد ہم خبس

صورتحال پر پہونچتے ہیں اس کی تلخیص اس طور پر پیش کی جا سکتی ہے[31]۔

1۔ محاسبین لاپرواہ تھے اور انھوں نے احکام کے ساتھ غفلت برتی تھی۔ صحیح اعداد کے بجائے انھوں نے قیاسی اعداد پر بھروسہ کیا تھا اور بقایہ کو بہت بڑھا کر دکھایا تھا نتیجتاً مالک لوگوں کو نفع اور ایمانداروں کو نقصان پہونچا تھا۔ اگر بقائے کم رہتے تو محصلین انھیں طے کر سکتے تھے مگر بڑھائے ہوئے مطالبہ کی حساب سے وہ خائف تھے۔

2۔ اس قاعدہ کو کہ حساب کسانوں کو دی گئی رسیدوں کی فہرست پر مبنی ہونے چاہئیں نظر انداز کر دیا گیا تھا اور وصولیوں کے غیر مصدقہ گوشواروں کو رشوت لے کر قبول کر لیا گیا تھا۔

3۔ محصلین سے جو مطالبات کئے گئے تھے وہ حقائق پر نہیں بلکہ معیاری اعداد یا بہ عجلت فراہم کی گئی معلومات پر مبنی تھے۔

4۔ زائد وصولیوں کا بہ طریق مناسب حساب نہیں دیا گیا تھا (اس فقرہ کی تفصیلات مبہم ہیں)

5۔ محاسبین نے زراعت کے ناگزیر نشیب و فراز کے لئے کوئی گنجائش نہ رکھی تھی جس کے نتیجہ میں بعض مواضعات ترقی کر رہے ہیں اور بعض تنزلی۔ انھوں نے جملہ خرابیوں کے لئے محصلین کو ذمہ دار ٹھہرایا تھا لیکن ترقی کے لئے ان کی تعریف نہ کی جاتی تھی، مناسب طریقہ یہ تھا کہ نتائج کو مجموعی طور پر دیکھا جائے۔

6۔ محصّل کی جو تہائی تنخواہ امکانی بقایوں کی ضمانت کے طور پر جمع کرالی جاتی تھی اور ایسا بلا کسی امتیاز کے کیا گیا تھا، حالانکہ ایسا محض مجرمانہ غفلت کی صورت میں کرنا چاہیئے تھا۔

7۔ محصلین کو مطلوبہ عملہ فراہم نہ کیا گیا تھا اور نہ ہی برطرفی کے احکام جاری ہونے کے بعد وہ جتنے دنوں اور کام کرتے یا اس مدت کے لئے جس میں حساب فہمی کے سلسلہ میں انہیں حاضر رہنا ہوتا، انھیں تنخواہیں دی گئی تھیں۔

8۔ محصلین کو بے نتیجہ خط و کتابت کر کے پریشان کیا گیا تھا۔

میں نے اس خلاصہ سے چند ایسے فقروں کو جو مقامی انتظام پر اثر انداز بعض معاملات سے متعلق ہیں حذف کر دیا ہے، لیکن میں نے جس قدر بھی تلخیص کی ہے اس سے میرے خیال میں اس امر کا قطعی ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ امین الملک نے حساب فہمی کے جن طریقوں پر عمل ہوتا ہوا پایا وہ ایسے تھے جو ایک دیانتدار محصّل کے لئے ناقابل برداشت تھے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جن بعض معاملات کی اس نے تحقیقات کی وہ برسوں سے چل رہے تھے۔ یادداشت کا لب

لباب یہ ہے کہ محصّلین فی الواقعی ان پر جس قدر واجب تھا اس سے بہت زائد کے ذمہ دار قرار دئے گئے تھے اور ایسی صورت میں کہ جب ٹوڈرمل ایسا ضدی اور انتظام پسند وزیر اپنے جانی دشمن کے مقرر کئے ہوئے عملہ کے ساتھ معاملہ کر رہا ہو تو ہمیں بدایونی کے بیان کو جو جزویات میں تو مبالغہ آمیز ہو سکتا ہے مگر مستحکم واقعات پر مبنی ہے یقین کرنے میں دقّت نہ ہونی چاہئے ۔ اکبر نامہ کا مصنّف اس معاملہ کے متعلق اپنے بیان کو یہ کہہ کر ختم کرتا ہے کہ اس طور پر پرانے حسابات طے کئے گئے اور انصاف پسند اور دانا امین الملک کی کوششوں سے وزارت "خوشی کا گھر" بن گئی۔ یہ بجا طور پر نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس بیان کا امین الملک کی اصلاحات کے قبل، وزارت پر اطلاق نہ تھا۔

پس فی الجملہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم بدایونی کے بیان کو اس مسئلہ پر سرکاری تحریر کے ضمیمہ کے طور پر قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن زیر بحث دو دستاویزات سے ایک ادبی مسئلہ جو سامنے آتا ہے اس پر ایک مختصر سی بحث کا اضافہ ضروری ہوگا۔ یہ دستاویزات سرے سے اکبر نامہ میں کیوں شامل کئے گئے ؟ ان کا صحیح مقام آئین اکبری میں "دس سالہ مدّت" کے باب کے بعد تھا جو بالکل دفعتہً ختم ہو جاتا ہے۔ آئینِ اکبری کے متن کی رو سے 'اکبر نے چوبیسویں اور چالیسویں برس کے درمیان مالی معاملات کے سلسلہ میں کوئی قابلِ تحریر کارروائی نہ کی۔ باوجود اس کے 'اکبر نے ان دستاویزات میں مندرج کارروائیوں کو اس قدر اہم خیال کیا کہ اس نے اپنے معمول کے خلاف انھیں مفصل درج کیا ہے۔ مجھے کسی اور طویل اور اصطلاحی شعبہ جاتی تحریروں کے اکبر نامہ میں مسلّم طور پر درج کئے جانے کی مثال نہیں ملتی اور ادبی نقطۂ نگاہ سے' جیسا کہ اس کے مصنّف کا نقطۂ نگاہ تھا' ان کی شمولیت اس کی تصنیف کے لئے انتہائی بدنمائی کا موجب ہے۔ اس نے اسے اس قدر بدنما کیوں کیا جب وہ انہیں آئین میں بہ سہولیت شامل کرا سکتا تھا؟ اس مسئلہ پر کسی شہادت کا مجھے علم نہیں مگر اس کا کوئی خاص مقصد رہا ہوگا جس کی نوعیت کے متعلق محض قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ میرا خود اپنا قیاس اس طور پر ہے۔ آئین کے مسوّدہ میں اس فصل میں زیر بحث معاملات کا بشمول ان دونوں دستاویزات کا پورا بیان شامل تھا۔ لیکن ابوالفضل نے اس کی تالیف کرتے وقت اس حصّہ کو نامناسب تصوّر کرتے ہوئے حذف کر دیا۔ پھر آئین میں عام ضابطوں کے بیان کے بند ہو جانے پر اس نے خود فیصلہ کیا یا اکبر نے حکم دیا کہ ان اہم دستاویزات کو محفوظ ہونا چاہئے' لہٰذا اس نے انھیں اکبر نامہ کی تیسری جلد میں جو اگلی زیرِ

ترتیب تھی، بلکہ حقیقتاً اس کی وفات تک نامکمل تھی شامل کر دیا۔ یہ محض ایک قیاس ہے جو واقعات سے منتج ہوتا ہے، لیکن ان سے ثابت نہیں ہوتا۔ میں اس مسئلہ کو محض اس غرض سے پیش کر رہا ہوں کہ اسے اس موضوع کے طالب علم کے سامنے آنا ضروری ہے۔

امین الملک کے کام کی تکمیل پر، ہم مالی انتظام کے ایک بظاہر مستحکم دور پر پہونچ جاتے ہیں۔ یہ دور، اگر ہم ماخذ کی خاموشی پر اعتماد کریں تو عہدِ اکبری کے خاتمہ تک قائم رہا۔ چوبیسویں برس جو تبدیلیاں کی گئیں یعنی نقدی شرحِ تشخیص کا اجرا اور جاگیروں کی منظوری پر مراجعت، ان کی حیثیت بنیادی تھیں۔ لیکن جہاں تک شمالی صوبوں کے براہِ راست زیرِ انتظام حصّوں کا تعلق ہے ان کے لئے ضلعی اور وزارتی دونوں سطحوں پر ضابطوں کے اصلاح کی ضرورت اب بھی باقی تھی۔ ضلعی سطح پر ٹوڈرمل نے اصلاح کی تھی اور وزارتی سطح پر فتح اللہ شیرازی نے۔ اس فصل کو ختم کرنے کے لئے اب صرف بعض ان تبدیلیوں کا حوالہ دینا ضروری ہے جو وزارت کی تنظیم میں بعد میں کی گئیں۔ چونتیسویں برس ٹوڈرمل کی وفات ہوگئی۔ اس کے دو برس بعد محفوظ علاقوں کا کام، علاقوں کی بنیاد پر، وزارت کی ماتحتی میں صدر مقام پر کام کرنے والے چار عہدہ داروں کے درمیان تقسیم کیا گیا اور چالیسویں برس ایک اور زیادہ اہم تبدیلی عمل میں لائی گئی[33]۔ ہر صوبہ میں علیحدہ علیحدہ ایک دیوان مامور کیا گیا جسے براہِ راست وزیرِ مال کے تحت کام کرنا ہوتا تھا۔ میں اسے انتظامی دو عملی یعنی دیوانی اور فوجداری کی ابتدا کی ایک علامت تصوّر کرتا ہوں جو اگلی دو صدیوں کی ایک بہت ہی معروف خصوصیت ہے۔ اس کے بعد سے ہر صوبہ کے مالی انتظام کو وزیرِ مال کے احکام کے تحت انجام دیا جانے لگا اور انتظامِ عامّہ کے ذمہ دار حکّام سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا۔ ابھی تک صوبجاتی دیوان، صوبیدار کے عملہ کا ایک عہدہ دار ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد سے یہ شاہی عملہ کا ایک عہدہ دار ہوگیا۔

5۔ نظامِ ضبط کا طریقِ عمل

ہمیں اکبر کے مالی نظام کا اس شکل میں مطالعہ جو اس کی غائیتی صورت معلوم ہوتی ہے اور جسے ہم نظامِ ضبط کہہ سکتے ہیں آئین کے ان ابواب[34] میں کرنا چاہئے جن میں محصّل اور محرر کے فرائض معین کئے گئے ہیں۔ یہ ابواب ایک ایسے مجموعہ سے متعلق ہیں جس کے بارے میں ہم صرف یہ خیال کرسکتے ہیں کہ اس میں وہ دستور العمل درج ہے جو آئین کی

تالیف کے وقت مختلف حکام کے لئے نافذ تھے۔ یہ کسی تاریخی مقالہ یا نظام کا بیان نہیں بلکہ صورتاً اور نیز مضمون دونوں اعتبار سے قطعی طور پر ایسے احکام ہیں جن کے عمل درآمد کے طریقہ کو، نظام سے واقفیت کے مفروضہ پر معین کیا گیا ہے۔ لہذا ہم انھیں بجا طور پر فی الواقعی مروجہ احکام تصور کر سکتے ہیں۔ اس کے بعض نکتوں سے واضح ہوتا ہے کہ ٹوڈرمل کے ستائیسویں برس کی تجاویز مع بعد کی ترمیمات کے مفصلاً اس میں شامل کی گئی ہیں۔ دیگر ضابطوں سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ تھوڑی تھوڑی ترمیم کے ذریعہ تدریجی نشوونما عمل میں آئی، بالکل اسی طور پر جیسا کو فی زمانہ انتظامی ضابطہ ناموں کے معاملہ میں ہم پاتے ہیں اور ان کی نوعیت اور مقصد کے متعلق کسی شبہہ کی گنجائش نہیں۔

اس مجموعہ میں شامل ابواب میں بعض عجیب وغریب اختلافات ملتے ہیں۔ کسی صوبیدار کے سلسلہ میں، متعین فرائض کے بجائے اس کے عام طور طریقہ پر زور دیا گیا ہے اور خطیبانہ زبان مین ایک اعلیٰ معیار پیش کرتے ہوئے اس میں شاعروں کے موزوں کلاموں کو نقل کر کے زور پہونچایا گیا ہے۔ لیکن ہم جیسے جیسے نیچے کی طرف آتے ہیں خطابت ختم ہو کر معینہ فرائض کی تفصیلات نمایاں ہوتی ہیں یہاں تک کہ ہم مقامی خزانچی تک پہونچتے ہیں۔ اس کے متعلق باب کا ہم برطانوی عہد کے غیر فوجی حسابات کے ضابطہ نامہ سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی توجہ محصّل اور اس کے محرر کے ابواب تک محدود رکھیں تو سب سے پہلے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کا کلّی اطلاق صرف ان علاقوں تک محدود تھا جو براہِ راست انتظام کے لئے محفوظ کر لئے گئے تھے۔ جیسا کہ کسی پچھلی فصل میں گذر چکا ہے، اس وقت تک نظام جاگیرداری تمام میں بحال ہو چکا تھا اور باوجودیکہ تشخیص شرحوں کے منظور شدہ گوشواروں کے جاگیردار پابند تھے لیکن کوئی چیز یہ ظاہر کرنے والی نہیں ملتی کہ ان پر مفصلاً یکساں طور پر ضابطوں کو نافذ کرنے کی کوئی کوشش کی گئی ہو۔ جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے کوئی ایسی تحریر نہیں ہے جس سے یہ واضح ہو کہ اس عہد میں محفوظ علاقہ کا رقبہ کس قدر تھا یا مقرر کئے گئے محصّلین کی تعداد کیا تھی اور صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ضابطوں کا براہِ راست اطلاق مملکت کے ایک جزو بلکہ غالباً ایک چھوٹے سے 'جزو' پر تھا، حالانکہ ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ احکام بالواسطہ طور پر جاگیرداروں کے زیرِ قبضہ علاقوں کے لئے بھی ضابطہ کا ایک معیار مقرر کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک باب کی ایک واضح ساخت

ہے اور ان میں یکے بعد دیگرے کام کی مختلف شاخوں پر بحث آتی ہے۔ لہٰذا ہر علیحدہ ضابطہ کا جملہ صورتوں پر بلا کسی امتیاز کے اطلاق نہ کرنا چاہیئے۔ بعد کی راہ اختیار کرنے سے ہم مختلف اقسام کے تضاد سے دوچار ہوں گے، کیونکہ ہمیں ایک چیز کی ایک جگہ اجازت اور دوسری جگہ ممانعت ملے گی۔ لیکن اگر عبارت کے سیاق پر مناسب توجہ دی جائے تو بظاہری تضاد رفع ہو جاتے ہیں اور ہم اسے بہ احتیاط مرتّب کیا ہوا ایک ایسا دستور العمل پاتے ہیں جو تفصیلات میں طویل، لیکن بہت سی باتیں جنھیں ہم چاہتے ہیں، وہ اس میں نہ ملیں گی لیکن یہ فی الجملہ سمجھ میں آنے والا اور بظاہر ان حکام کے لئے جو اس نظام سے اور شعبہ میں استعمال ہونے والی اصطلاحی زبان سے مانوس ہوں قابلِ عمل ہے۔

جس ماحول میں اس دستور العمل کو نافذ کرنا مقصود تھا اسے باضابطہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن ہم اس کے ضابطوں میں کسی موضوع کے ان عناصر کو پہچان سکتے ہیں جن سے ہم بعد کے زمانہ میں مانوس ہوتے ہیں، مثلاً متعدد کسان جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی اراضی پر جداگانہ قابض ہوا ہو اور خصوصی حیثیت رکھنے والے ایک یا زائد چودھری اور ایک محاسب یعنی پٹواری، جو کاشت، تشخیص اور وصولیوں کے ان کاغذات کو رکھتا تھا جنھیں انتظامیہ حاصل تو کر سکتا تھا لیکن ان کا موجودہ حکومت کی طرح مالک نہ تھا۔ محصّل کے کسانوں کے ساتھ رویّہ کو متعین الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔ اسے کسانوں کا دوست ہونا چاہیئے اور بلا کسی درمیانی اشخاص کے ان کی اس تک رسائی ہونی چاہیئے۔ اسے ہر کسان کو ایک فرد تصوّر کرنا چاہیئے اور ایسا کرنے کے لئے اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ زراعت کی مقامی خصوصیات سے واقفیت حاصل کرے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ بحیثیت ایک پیدا کرنے والی اکائی کے موضع کو ترقی دینے کے سلسلہ میں چودھریوں کی حیثیت کو سمجھے اور جن صورتوں میں ان کی کوششیں کامیاب ہوں، وہ انھیں اس کے نتائج میں شریک کرے۔ مزروعہ رقبہ پر $2\frac{1}{2}$ فیصدی کے تناسب سے لگائے گئے حساب کو معقول تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن اسے چودھریوں سے کسی مسلّم موضع کے مطالبۂ مالگذاری کی تشخیص کا معاملہ کرنے سے منع کیا گیا تھا اور اس طریقہ کے غیر موثر اور ظالمانہ ہونے کی بنا پر مذمّت کی گئی تھی۔ چودھری حقیقتاً ایک کارآمد شخص ہوا کرتا، لیکن اسے بہت زیادہ اختیارات نہ دینے چاہئیں۔

میں نے جس چیز کو ترقی کی روایتی پالیسی کہا ہے، اسے ایک نمایاں مقام دیا گیا ہے۔

یہ محصّل کے فرائض میں تھا کہ وہ کاشتکاری کو توسیع کرے اور فصلوں کے اقسام کو بہتر بنائے۔ عام تخیل یہ تھا کہ اسے کسانوں کو پیداوار بڑھانے کی ترغیب دینے کے لئے فیاضانہ شرائط کی پیش کش کرنی چاہیئے اور کسی معاہدہ کے ہوجانے پر ان سے اس کی تعمیل میں سختی برتنی چاہیئے۔ بہتر قسم کی پیداوار کے حصول کے خاطر اسے اونچے قسم کی پیداوار پر تشخیص کی شرحوں کو کم کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ دوسری طرف توسیع کاشت کے سلسلہ میں' اسے نظام ضبط کے تحت پیمائش کے ذریعہ تشخیص کے طریقہ سے ہٹ کر کسان جس طریقہ کو بھی پسند کرے یعنی نسق یا اجتماعی تشخیص اور ادائیگی بہ نقد یا جنس کو قبول کر لینے کا اختیار دیا گیا تھا۔ یہ ایک قدرے قابلِ توجہ امر ہے کہ کنوؤں کے کھودنے کا کوئی حوالہ نہیں ملتا حالانکہ یہ موضوع' اس نوعیت کے بعض بعد کے دستاویزات میں نمایاں طور پر ملتا ہے۔ ضرورت مند کسانوں کو قرضے دئے جانے کی گنجائش ملتی ہے اور قیاس ہے کہ اس گنجائش میں کنوؤں کے لئے قرض کا دیا جانا شامل ہوگا۔ مگر پھر بھی اس کی غیر موجودگی قابلِ لحاظ ہے۔

یہ ضابطہ کہ اجتماعی تشخیص جیسے کسی مسلّم موضع کے لئے منع کیا گیا تھا' نئی کاشت میں لائی ہوئی زمین کی صورت میں اختیار کی جا سکتی تھی' ہمیں ستائیسویں برس ٹوڈرمل کی پیش کی ہوئی ایک تجویز کی طرف لے جاتا ہے۔ صحیح معنوں میں' تشخیص کے مروّجہ طریقہ کے تحت ہر فصل میں ہر زیرِ فصل کھیت کی پیمائش کرنی ہوتی تھی اور کھیتوں کے بخوبی متعین اور مسلسل زیرِ کاشت ہونے کی صورت میں' یہ عمل محنت کی زیادہ تکرار اور معروف کسانوں کے لئے پریشانی کا موجب ہوا کرتا تھا۔ راجہ ٹوڈرمل نے محفوظ اضلاع میں کاشت کی بڑھتی ہوئی تنزلی کے سلسلہ[۵۵] میں لکھا ہے کہ "اگر کاشت کی ہوئی زمین کی ایک بار پیمائش ہو چکی ہو تو کسانوں کی صلاحیت کو ہر سال بڑھاتے ہوئے جزوی اجتماعی تشخیص کو منظور کرنا چاہیئے"۔ میں اس کا یہ مفہوم سمجھتا ہوں کہ ہر فصل پر پیمائش کرنے کے بجائے مسلسل کاشت میں لائے ہوئے متعین کھیتوں کی صحیح جسامت کو تحریروں میں سال بہ سال دہراتے رہنا چاہیئے جب کہ نوتوڑ زمین کی تفصیلی پیمائش کے بجائے ان پر بالمقطع سرسری تشخیص کر دینی چاہیئے۔ یہ تجویز منظور کی گئی۔ لیکن غالباً تجربہ سے معلوم ہوا کہ کسانوں کی مختلف جماعتوں کی پسند میں اختلاف کے لحاظ سے زیادہ لچک کی ضرورت تھی۔ چنانچہ بعد کے قاعدوں میں حقِ انتخاب دیا گیا جبکہ ٹوڈرمل کی تجاویز میں ایسا نہ تھا۔ یاد ہوگا کہ شیرشاہ نے اپنے ابتدائی برسوں ہی میں معلوم کر لیا تھا کہ دو پرگنوں تک کے حدود میں کسان تشخیص

کے ترجیحی طریقہ کے معاملہ میں متفق نہ تھے۔ لہذا اس سے ایک بہت بڑے علاقہ میں جس پر اکبر کے قاعدوں کا نفاذ تھا، تنوع کا لحاظ کیا جانا بالکل معقول تھا۔

آئین کے ان ابواب[36] سے جو ایسی زمینوں کی تشخیص سے بحث کرتے ہیں جو ایک بار کاشت بند ہو جانے کے بعد از سرِ نو زیر کاشت لائی گئی ہوں، ترقی کی پالیسی پر کچھ مزید روشنی حاصل ہوتی ہے۔ تشخیص کے لئے تین پیمانوں کو تسلیم کرتے تھے جنھیں حالات کے لحاظ سے نافذ کیا جاتا۔ ان میں سے پہلے کے تحت تشخیص عام شرحوں کے $\frac{2}{5}$ سے شروع ہو کر پانچویں برس تک پوری شرح پر پہونچ جاتی تھی۔ دوسرے پیمانہ کے تحت جو کسانوں کے لئے زیادہ موافق تھا، پہلے سال غلہ کی ایک بہت ہی قلیل مقدار لی جاتی تھی جو تدریجاً پانچویں برس پورے مطالبہ پر پہونچ جاتی تھی اور تیسرے پیمانہ کے تحت، جس کا اطلاق ایسی زمینوں پر ہوتا تھا جو پانچ یا اس سے زائد برسوں تک بغیر کاشت رہی ہوں ابتدائی مطالبہ برائے نام ہوتا جو پھر بڑھتے ہوئے $\frac{1}{6}$، $\frac{1}{4}$ اور آخر میں پیداوار کے $\frac{1}{3}$ پر پہونچ جاتا تھا۔ اس طور پر محصّل اس حیثیت میں ہوتا تھا کہ وہ ان مواضعات کی بحالی میں جو آفات کے نتیجہ میں مفلس ہو گئے ہوں مادی طور پر حصّہ لے سکے۔

ترقی کے موضوع سے گذر کر، ضابطے ہر فصل پر بذریعہ پیمائش تشخیص کے مفصل طریق کار کو بیان کرتے ہیں۔ یہ واضح نہیں کہ پچھلی تحریروں سے متعین کھیتوں کے رقبوں کو اخذ کرنے کا طریقہ اس وقت رائج تھا یا نہیں۔ ضابطے محض پیمائش کرنے کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس اصطلاح کا مفہوم ایک ایسا مختصر کیا ہوا طریق کار ہو سکتا ہے جس کے تحت رقبہ کی ایک موجود تحریر قبول کر لی جاتی یا اس کی محض جانچ کر لی جاتی تھی۔ ضابطوں کے اس جزو کی اہم ترین خصوصیت نقصان فصل کا بیان ہے۔ نقصان کے رقبوں کو دوران پیمائش معلوم کر کے، کسی اراضی پر مطالبہ قائم کرنے کے قبل اسے کل اراضی سے وضع کرنا ہوتا تھا۔

دوسری طرف تشخیص کے مکمّل ہو جانے کے بعد فصل کے جو نقصانات علم میں آتے ان کی اطلاع معہ متاثرہ رقبہ کی تفصیلات کے جس حاکم کے پاس گوشوارۂ تشخیص بھیجا گیا ہوتا اس کے پاس بھیجنا ہوتا تھا۔ یہ ضابطے واضح طور پر اس نظام کے اہم اجزا ہیں کیونکہ تشخیص کی اونچی سطح کے پیش نظر، نقصانِ فصل ضرور ایک بہت ہی سنگین معاملہ ہوا کرتا۔ ان کے علاوہ بقیہ طریقۂ کار سیدھا سادہ تھا۔ ہر کھیت کی پیداوار کو پہلے لکھ لیتے تھے۔ پھر ہر کسان کے متعلق اندراجات کو جمع کر کے اس پر ایک فصل کے مطالبہ کو منظور شدہ تشخیصی شرحوں کے مطابق

نکالتے تھے۔ ان میزانوں کو جمع کرنے سے موضع کا مطالبہ آجاتا تھا۔ پھر اس کا ایک گوشوارہ ’تشخیص ہماری اطلاع کے مطابق ”دربار میں“ اور غالباً اس عہد میں وزارت مال کو بھیجتے تھے، حالانکہ تنظیم میں تبدیلی کے بعد جس کا پہلے ذکر آچکا ہے، اسے منظور کرنے کا اختیار صوبجاتی دیوان کو حاصل رہا ہوگا۔

اس کے بعد ضابطے تشخیص سے گذر کر وصولی کے موضوع پر پہونچتے ہیں کسانوں کو اپنی اپنی مالگذاری کو ہر قسط کے واجب الادا ہو جانے پر خزانہ نقد پہونچانے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ لیکن جمع کرنے والے گماشتے بھی مواضعات میں بھیجے جاتے تھے اور چودھری و گانوں کے پٹواری بھی اس کام میں حصّہ بٹاتے تھے۔ مالگذاری میں جو غلّہ آتا تھا اس کے انتظام کے متعلق کوئی احکام نہیں ملتے اور یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس طور پر وصولی اس قدر شاذ ہوتی تھی کہ اس سلسلہ میں کسی عام قاعدہ کی ضرورت نہ تھی۔ بقیہ ضابطے خزانہ کے طریق کار اور متفرق معاملات سے متعلق ہیں اور اس میں متعدد میعادی گوشوارے شامل ہیں۔ یہاں اب صرف اس قدر لکھنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ معافیوں کی حدبندی کے سلسلہ میں، محصّل صدر کے مقامی نمائندہ کے فرائض انجام دیتا تھا اور یہ کہ متفرق جبری وصولیوں کی ایک طویل فہرست یعنی جزیہ یا شخصی محصول جیسے اسلامی قانون نے نافذ کیا تھا مگر جس کا اکبر دعویدار نہ تھا، سے لیکر چودھریوں کے طرف سے حاضری کے موقع پر پیش کی جانے والی دستوری نذر (سلامی) تک کے متعلق رسمی ممانعت اس امکان کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ناجائز آمدنی کا ایک معقول مقدار محصّل کی رسائی کے اندر تھی۔

ہم جب ان تفصیلی ضابطوں کی غور سے جانچ کرتے ہیں جن کے تحت محصّل اور اس کے محرّر پر اس قدر زیادہ تعداد میں مخصوص فرائض عاید کئے گئے تو قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان سب کی انجام دہی عملاً ممکن تھی۔ اس عہد کے محصّل کے حلقے کے حدود کا ہمیں علم نہیں۔ لیکن یہ فرض کرتے ہوئے کہ انیسویں برس معین کئے ہوئے ایک کروڑ داموں کے معیار میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی تھی اور یہ کہ فی بیگھہ مطالبہ کی شرح جیسا کہ تشخیصی شرحوں سے ظاہر ہوتا ہے تقریباً 40 دام تھی، ایک حلقہ زمین زیر فصل کے تقریباً 250,000 بیگھوں پر مشتمل رہا ہوگا۔ ایسی صورت میں محصّل کے لئے یہ ممکن نہ رہا ہوگا کہ وہ حسب ضابطہ اپنے جملہ فرائض کو بذات خود انجام دے سکے۔ لہٰذا ہمیں انھیں ایک ایسے عملہ کا جسے اس نے خود اپنی

ذمہ داری پر مقرر کیا ہو سربراہ تصوّر کرنا چاہئے۔ ہمارے علم میں ہے[37] کہ محصّلین حقیقتاً گماشتے رکھتے تھے اور ہم یہ بھی فرض کر سکتے ہیں کہ اسی طور پر محرّر بھی کاتبوں کا ایک عملہ رکھتا تھا جن میں کا ایک فرد ہر پیمائش کرنے والی جماعت کے ساتھ جاتا تھا۔ یہ امر کہ ایسی متعدد جماعتیں بیک وقت ہر حلقہ میں مصروفِ کار رہا کرتیں، ٹوڈرمل کی تجاویز [اکبرنامہ (3) 382] سے واضح ہے۔ پس کام کرنے والوں کی تعداد زیرِ پیمائش رقبہ کی رعایت سے ہونی چاہیئے اور محصّل خود کو ایسے مرکزی مقام پر رکھے جہاں سے وہ ان میں سے ہر ایک کے پاس پہونچ سکے۔

میرے خیال میں ایک عام کسان کے سامنے اس نظام کی جو شکل آتی تھی اسے ایک عمومی انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ حکومت کے تئیں اپنی ذمہ داری کے حدود سے پہلے سے واقف رہتا تھا اور اسے جس قدر رقم کی ضرورت ہوتی اس کا علم رکھتے ہوئے وہ ہر فصل میں اپنی کاشت کے اقسام کو مرتّب کر سکتا تھا۔ لیکن وہ لازماً اپنی پیداوار کی قیمتوں سے ناواقف رہتا۔ جہاں تک مطالبۂ مالگذاری کا تعلق ہے وہ گاؤں میں متعدد اشخاص کی حکومت کے مظالم سے محفوظ تھا لیکن دوسری طرف اسے پیمائش کرنے والی جماعت اور وصولی کا کام کرنے والے ماتحتوں کی جبری وصولیوں کو بھگتنا پڑتا ہوگا۔ مزید برآں وہ ایک مستعد محصّل کے ذریعہ جو علاقہ کے امکانات کا لحاظ کئے ہوئے بغیر توسیع کاشت اور اقسام پیداوار میں بہتری کا خواہاں ہو پریشان کیا جا سکتا تھا یا اس کے اور ایک فہیم اور دانا حاکم کے درمیان تعلقات قائم ہو سکتے تھے جو اپنے وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے میں اس کا معاون ہو سکتا تھا۔ پس اس نظام کے اثرات کلّی طور پر اس کے انتظام کے طریقہ پر ضرور منحصر رہے ہوں گے۔ حالات کے مطابق یہ اثرات اس کے لئے معاون یا ناقابلِ برداشت حد تک پریشان کن ہو سکتے تھے اور کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ واضح ہو کہ ان میں سے کون سی صورت حقیقت سے قریب تر رہی ہوگی۔ ہم بجا طور پر یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی صورت کلّی طور پر صحیح نہ تھی اور یہ کہ محصّلین اچھے اور برے دونوں ہی طرح کے تھے اور بنیادی طور پر یہ صورتِ حال بادشاہ کے ذاتی اوصاف پر مبنی رہی ہوگی۔ لہٰذا اگر ہم چاہیں تو یہ یقین کر سکتے ہیں کہ اکبر کے دورِ حکومت کے دوران محفوظ اضلاع میں یہ نظام اچھا خاصہ چلتا رہا مگر عہدِ جہانگیری میں یہ پارہ پارہ ہو گیا۔ لیکن ہم بہرحال صرف اس قدر جانتے ہیں کہ یہ اورنگزیب کی تخت نشینی کے قبل ختم ہو چکا تھا۔

لیکن محفوظ علاقوں کے کسان، بہرحال کل کا ایک بہت تھوڑا حصّہ تھے اور ایک عام انسان

کوان جاگیرداروں کے طرف ہی دیکھنا ہوتا تھا جنھیں ایسے حالات نے جو اس کے قابو کے باہر تھے، اس کی قسمت کا مالک بنادیا تھا۔ سولہویں اور سترہویں صدی کی تحریریں بجائے خود اس قابل نہیں کہ ان سے ہم جاگیرداروں کے طور طریقہ کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرسکیں۔ صرف اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ جاگیروں میں بار بار تبدیلیاں بلاشک ان کے ناقص اور ظالمانہ انتظام کا سبب تھیں، کیونکہ یہ تعمیری پالیسی کے قسم کی کسی چیز کو کارِ فضول بنادیتی تھیں۔ ایک محصّل اپنے ضلع کو ترقی دینے کے صلہ میں انعام کا مستحق ہوسکتا تھا جب کہ ایک جاگیردار اپنی کوششوں کے ثمرات کے ظاہر ہونے کے قبل ہی اپنی زمینوں سے محروم کیا جاسکتا تھا اور اس کے لئے ان حالات میں ایسی موہوم ضمانت پر سرمایہ کا لگانا بہت ہی غیر دانشمندی کا کام ہوتا۔

اس عہد میں جاگیروں کی مدّت کے صحیح تعین کے لئے کافی شہادتیں دستیاب نہیں ہیں۔ اس موضوع پر مجھے کوئی ایسی تحریر نہ مل سکی جس میں اس کا کوئی رسمی ضابطہ درج ہو جبکہ سرگذشتوں میں وسیع علاقوں کے قابضین کے تھوڑے تھوڑے وقفہ پر تبدیل ہونے کی مثالیں موجود ہیں لیکن ایسی مثالیں بہت ہی تھوڑی ہیں جو کسی قابلِ اعتماد عام کلیہ کی بنیاد بن سکیں۔ غالباً جس قدر مثالیں ہم سنتے ہیں اس سے زائد ایسی ہیں جن میں جاگیرداران نے اس قدر مدّت تک اپنا قبضہ قائم رکھا جو کسی بھی تعمیری پالیسی پر عمل کرنے کے لئے کافی ہو۔ لیکن تحریری واقعات شاہد ہیں کہ قبضہ کی مدّت بہرحال بالکل غیر یقینی رہا کرتی اور جاگیردار کے اپنے قبضہ کے متعلق مطمئن نہ ہونے کی صورت میں، ہم یہ تصوّر نہیں کرسکتے کہ کوئی بھی عام انسان کسی طویل المیعاد پالیسی پر عمل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ آمدنی کی وصولی کے علاوہ کچھ اور کرے گا۔ پس ایک باصلاحیت محصّل کے تحت کسی محفوظ ضلع کے لئے غالباً ترقی کرنے کا فی الجملہ زیادہ امکان پایا جاتا تھا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ محفوظ علاقہ اور جاگیر کا درمیانی امتیاز گو کسی محدود وقت کے لئے واضح حالت میں رہ سکتا تھا لیکن یہ بہرحال کوئی مستقل چیز نہ تھی۔ سرگذشتوں میں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں جس میں ایک علاقہ ایک زمرہ سے دوسرے میں منتقل کیا گیا اور کچھ ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزارتِ مال کا نصب العین قدرتی طور پر زرخیز ترین اور سب سے زیادہ آسانی سے قابلِ انتظام زمینوں کو اپنے قبضہ میں رکھنے کا تھا۔ چنانچہ اکبر کے ایک قدیم محصّل کے بیان کے مطابق، اس کی اس شکایت پر کہ اس کا زیرِ انتظام ضلع مخصوص کئے جانے کے قابل نہ تھا اسے جاگیر میں دے دیا گیا۔ اسی ماخذ سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ ایک پرگنہ اس سبب سے دیوان

ہوگیا کہ اسے جاگیریں دیئے جانے کی تجویز کے نتیجہ میں محصّل نے اس سے غفلت برتی تھی[38]۔ بدقسمتی سے ضمنی اطلاعات جن سے صحیح صورت حال ظاہر ہو اس قدر شاذ ہیں کہ وہ نتائج کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔ بعض علاقے مستثنیٰ مخصوص کئے ہوئے حصّے تھے لیکن ایسی معلومات دستیاب نہیں ہیں جو یہ ظاہر کریں کہ وہ کون سے علاقے تھے جہاں کسان تھوڑا بہت انتظامی استحکام کی امید کر سکتا تھا اور صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ عدم استحکام معمول سے زیادہ قریب تھا۔

6۔ آخری صورتِ حال

جن معلومات کو اس فصل میں استعمال کیا ہے وہ بیشتر آئین کے اس حصّہ[39] سے ماخوذ ہیں جس کا عنوان "بارہ صوبوں کے حالات" ہے۔ اس حصّہ میں صرف حالات کا بیان ہے اور ہم اسے اکبر کی مملکت کا تقریباً ایک گزیٹر کہہ سکتے ہیں۔ ہر صوبہ کا یکے بعد دیگرے بیان ہے۔ جغرافیائی خصوصیات، زراعت، مالی نظام، صنعت و حرفت اور معیارِ زندگی کے متعلق اطلاعات فراہم کی گئی ہیں جو معتبر ہونے کے لحاظ سے مختلف النوع ہے۔ اس کے بعد مخصوص مقامات اور علاقوں کا ذکر آتا ہے، پھر بعض صوبجاتی شماریات اور آخیر میں اس کی تاریخ۔ مختلف معلومات کی ترتیب اس کے خاکہ میں واضح یکسانی کی شاہد ہے لیکن اس کے نفاذ میں بہت کم یکسانی ملتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر صوبہ کے حالات کو کسی ایسے عہدہ دار نے مرتّب کیا ہے جو اس کے بارہ میں خصوصی واقفیت رکھتا ہو اور ایک معینہ منصوبہ کے تحت کام کر رہا ہو مگر منصوبہ کی جملہ جزویات کا سختی سے پابند نہ ہو۔ یہ بیان ہر مخطوطہ میں نہیں پایا جاتا اور یہ بظاہر آئین کے بقیہ حصّہ کی طیاری کے قطعاً ختم ہو جانے کے بعد مرتّب یا مکمّل کیا گیا کیونکہ اس کے عنوان میں تو چوبیسویں برس کے بارہ صوبوں کا ذکر ہے مگر دیباچہ میں تین اور صوبوں، برار، خاندیش اور احمد نگر جو بعد میں فتح کئے گئے کا حوالہ آتا ہے اور ان میں سے پہلے دو قدرے تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس طور پر یہ معلومات جس مدّت سے متعلق ہیں وہ صحیح طور پر متعین نہیں ہیں، لیکن ہم انھیں ۱۶۰۰ء جلوس کے لگ بھگ مملکت کے حالات کی ایک عمومی واقفیت حاصل کرنے کے لئے استعمال میں لا سکتے ہیں۔ یہاں اس بات کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ ان حالات کو مبین طور پر ابوالفضل نے بذاتِ خاص[40] مرتّب کیا تھا اور مزید یہ کہ وہ اس قدر بعد یعنی تینتالیسویں برس تک اس کام میں مصروف رہا۔

بیشتر صوبوں میں رائج مالی نظاموں کو متعین سرکاری اصطلاحات میں بیان کیا گیا ہے اور جن صورتوں میں باضابطہ اطلاعیں غیر موجود ہیں وہاں ہم صحیح صورتِ حال کو معمولاً اس تذکرہ میں مندرج دیگر معلومات سے متعین کر سکتے ہیں۔ واقعات کی اس طور پر تلخیص کی جا سکتی ہے۔

چھ نسبتاً پرانے صوبے، ملتان اور لاہور، دہلی اور آگرہ، اودھ اور الہ آباد جو مملکت کے قلب کے درجہ میں تھے، بیشتر مگر کلیۃً نہیں، نظامِ ضبط جس کا ذکر پچھلی فصل میں آچکا ہے کے تحت تھے۔ مطالبۂ مالگذاری نقدی شرحوں کے گوشوارہ کا پابند تھا جسے ہر فصل کے زیرِ کاشت رقبہ پر منطبق کرتے تھے اور آئین میں مفصلاً مندرج ان گوشواروں کا اطلاق، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، جاگیروں اور نیز مخصوص کئے ہوئے علاقوں پر تھا۔ لیکن بعض علاقوں کا انتظام اس سے مختلف خطوط پر ہوا کرتا تھا۔ ان میں دو سب سے بڑے صوبۂ دہلی کا پہاڑی ضلع کمایوں اور صوبہ الہ آباد میں واقع ایک نسبتاً غیر واضح حدود کا علاقہ جسے ضلع بھٹہ گورا کا نام دیا گیا ہے، تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بالکل سرداروں کے قبضہ میں چھوڑ دیا گیا تھا جن میں سے کچھ عملاً خود مختار تھے۔ چند ذیلی تقسیموں کے متعلق شماریات[41] سے اشارہ ملتا ہے کہ یہی صورتِ حال تھی۔ لیکن باعتبار میزان وہ مجموعی رقبہ کا محض تھوڑا سا جز ہیں۔

اس صدری حصہ کے باہر کے صوبوں میں اس سے کم یکسانیت ملتی ہے، لہٰذا ان میں سے ہر ایک کا علیحدہ بیان ضروری ہوگا۔ مغرب میں ٹٹہ یا نچلے سندھ میں نسق کے ذریعہ تشخیص تھی اور پیداوار کا ایک تہائی حکومت کا حصہ تھا۔ ہمیں یہ ظاہر کرنے والی کوئی چیز نہیں ملی کہ مالگذاری کو جنس میں طلب کرتے تھے یا نقد میں تبدیل کر دیتے تھے۔

اجمیر کا مغل صوبہ اس کے مشرقی حصہ کو چھوڑ کر جو آگرہ میں تھا، فی الجملہ موجودہ راجپوتانہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ عہدِ اکبری میں اس صوبہ میں طرح طرح کا نظام رائج تھا۔ اس کے کچھ حصے نظامِ ضبط کے تحت اور بقیہ سرداروں کے سپرد تھے۔ مطالبۂ مالگذاری کا معیار پست تھا۔ اسے پیداوار کا $\frac{1}{7}$ یا $\frac{1}{8}$ "اور تھوڑا سا نقد" بیان کیا گیا ہے۔ اس فقرہ کا مفہوم مخفی ہے اور اس سے غالباً یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بمقدارِ جنس ادائیگی کا رواج تھا۔ شماریات کی ترتیب کے اعتبار سے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اجمیر، رنتھمبھور اور ناگور کے تین ضلعے بیشتر نظامِ ضبط کے تحت تھے۔ شمار میں آئے ہوئے دیگر ضلعوں میں بیکانیر بظاہر پورا، وہاں کے سردار کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ سروہی کو چار سرداروں کے درمیان تقسیم کیا گیا تھا جبکہ جودھپور اور چتوڑ بیشتر سرداروں کے

قبضہ میں تھے، گوکہ ان کے بعض پرگنوں کا براہِ راست انتظام کیا جاتا تھا۔ بیکانیر اور سروہی کے علاوہ تمام ضلعوں کے گوشوارے دئے گئے ہیں۔ ان دو کے گوشوارے مہیا نہیں کئے گئے تھے۔" لیکن جودھپور اور چتوڑ میں ان گوشواروں کے اطلاق کو محض ذیلی تقسیموں پر تصوّر کرنا چاہئے جو مغلیہ حکّام کے براہِ راست انتظام میں تھے۔

مالوہ ایک ایسا دوسرا صوبہ تھا جہاں مختلف النوع انتظام رائج تھا۔ یہاں نظامِ ضبط کو کم از کم رسمی طور پر تو شروع کر دیا گیا تھا لیکن یہ مغرب میں ضلع 'مروسور (منڈاسور) یا مشرق میں ضلع گڑھا میں نافذ نہ تھا۔ ان اضلاع کے تعداد کی تعبیر محض اس نظریہ کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے کہ یہ مختلف سرداروں کے قبضہ میں تھے۔ صوبہ کے دوسرے حصّوں کی صورتِ حال کے متعلق شبہہ کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ یہاں صحیح واقعات کو مفصلاً متعین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس قدر یقینی ہے کہ منجملہ تین مندرج تشخیصی حلقوں کے محض ایک (رائے سین۔ چندیری) کا شرحنامہ قابلِ عمل تھا۔ دوسرے حلقہ مانڈو میں ربیع کی فصلوں کے لئے بجز تربوز و خربوزہ کے کوئی اور شرحیں نہ تھیں اور جہاں تک خریف کی فصلوں کا تعلق ہے، محض گنّے، کپاس، چنا اور سنگھاڑہ کے لئے شرحیں درج ہیں جو اس علاقہ کی فصلوں کی مضحکہ خیز طور پر ایک ادھوری تصویر ہے۔ تیسرا گوشوارہ بھی جس کا بظاہر سات ضلعوں پر اطلاق تھا، خریف کی فصلوں کے معاملہ میں ناقص ہے اور ربیع میں یہ محض پوستہ، تلہن، خربوزہ، تربوزہ اور بعض سبزیوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایسی تشخیصی شرحیں جو مالوہ کی اہم پیداوار، باجرہ، کودوں اور گیہوں و دالوں کو نظرانداز کرتی ہوں صحیح صورتِ حال کا مظہر نہیں ہو سکتیں اور ایسا مشکل ہی سے تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ آئین کے مولفین نے فی الواقعی جملہ مروّجہ شرحوں کو نہیں بلکہ محض چند کو درج کیا ہوگا۔ تسامحات میں مندرج معلومات کی واحد توجیہہ جو میری سمجھ میں آتی ہے یہ ہے کہ نظامِ ضبط اپنی صحیح شکل میں محض رائے سین اور چندیری کے دو ضلعوں میں نافذ کیا گیا تھا اور دوسرے ضلعوں میں بس اس قدر کیا گیا تھا کہ چند قابلِ فروخت فصلوں کے لئے نقدی شرحیں مقرر کر کے غذائی غلّوں کی تشخیص کو کسی اور طریقہ پر جس کی نوعیت درجِ تحریر نہیں ہے، کئے جانے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔

بہار ان صوبوں میں شامل نہیں جنھیں انیسویں برس براہِ راست انتظام میں لیا گیا تھا۔ لہٰذا پانچ برسوں بعد یہاں کے نقدی شرحناموں کی طیاری کے لئے کافی مواد نہ رہا ہوگا اور نہ ہی ایسے شرحنامے تحریروں میں ملتے ہیں۔ بہرحال، اس تذکرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نظامِ

ضبط کو صوبہ کے بیشتر حصّہ پر نافذ کیا گیا تھا اور ہمارا قیاس یہ ہے کہ یہ قدم پچیسویں سے لے کر چالیسویں برس کے درمیان کسی وقت اٹھایا گیا ہوگا۔ اس نظام کو ضلع مونگیر پر نافذ نہ کیا گیا تھا او بعض دوسرے ضلعوں میں بھی کچھ ایسے پرگنے ہیں جو بظاہر سرداروں کے تحت چھوڑ دیئے گئے تھے۔ منجملہ کل ۱۹۹ پرگنوں کے 138 "نظامِ ضبط" کے تحت تھے۔

اکبر نے بنگال میں تشخیص کے اسی طریقے کو بحال رکھا جو اس کی فتح کے وقت وہاں نافذ تھا۔ اسے "نسق" کہا گیا ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم جیسا کہ ضمیمہ د میں واضح کیا گیا ہے غیر متعین ہے۔ اس سے مبین طور پر موضع یا اس سے کسی بڑی اکائی پر تشخیص کئے جانے کی نشاندہی ہوتی ہے، لیکن اس میں اس مسئلہ کو کہ تشخیص چودھریوں کے ساتھ کی جاتی تھی یا کاشتکاروں کے ساتھ مشتبہ حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس صورتِ حال میں منظور شدہ تشخیصی شرحوں کی بنیاد کوئی تحریر نہیں ہے اور اٹھارہویں صدی کی اس روایت کی کہ ٹوڈرمل نے منفرد کسانوں پر ایک تفصیلی تشخیص قائم کی تھی، کسی بھی ہمعصر سند سے تائید نہیں ہوتی۔

اس تذکرہ میں اڑیسہ کو بنگال کے ایک جزو کے طور پر دکھایا گیا ہے اور اس کی تشخیص کے طریقوں کو علیحدہ سے نہیں بیان کیا گیا ہے۔ شماریات کی شکل دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ صورتِ حال بنگال کے مثل تھی۔ لیکن کلنگ، دنڈپات اور راج مہندرا کے دو ضلعے بظاہر علیحدہ اکائیوں کے طور پر سرداروں کے قبضہ میں تھے اور بعض دوسرے ضلعوں میں بھی، نسبتاً ایک چھوٹے پیمانہ پر سرداروں کے مقبوضات کا پتہ چلتا ہے۔

اڑیسہ کے پورب میں جو خطّہ واقع تھا اس کا بعض اوقات صوبہ گونڈوانہ کے طور پر حوالہ آیا ہے، لیکن اس وقت اس نام کا کوئی صوبہ نہیں بنایا گیا تھا۔ یہ علاقہ خود مختار سرداروں یا ایسے سرداروں کے قبضہ میں تھا جنھوں نے کسی نہ کسی قسم کی اطاعت قبول کر لی تھی اور مؤخرالذکر زمرہ کی زمینوں کو ملحق صوبوں میں دکھایا گیا ہے۔ اس علاقہ سے گذر کر ہم برار پہونچتے ہیں فتح کئے جانے کے وقت یہ صوبہ عرصہ سے نسق کے تحت تھا اور اکبر نے اسی نظام کو قائم رکھا۔ یہاں بھی مثل بنگال کے یہ امر غیر یقینی ہے کہ مواضعات کی تشخیص چودھریوں کے ساتھ کی گئی تھی یا کاشتکاروں کے ساتھ۔ لیکن صوبہ کا ایک بڑا حصّہ بظاہر سرداروں کے قبضہ میں چھوڑ دیا گیا تھا اور بعض پرگنے گو کہ شماریات میں ان کے نام موجود ہیں، مسلّمہ طور پر ابھی تک خود مختار تھے۔

خاندیس جسے آئین میں دان دیس کہا گیا ہے ایک ایسا چھوٹا صوبہ تھا جسے دریائے نربدا سے متصلاً بہ سمت جنوب ایک ضلع کے طور پر بنایا گیا تھا۔ وہاں کا مروّجہ نظامِ تشخیص واضح نہیں ہے، لیکن شماریات کی ترتیب سے پتہ چلتا ہے کہ یہ برار کے مثل رہا ہوگا۔

گجرات کے متعلق جو فہرست کا آخری صوبہ ہے کچھ دقتیں سامنے آتی ہیں یہ انیسویں برس براہ راست انتظام کے تحت نہیں لایا گیا تھا۔ لیکن اس کی تشخیصی شرحیں، بہ طریقِ معمول نہ طیار کی جا سکی ہونگیں اور نہ ہی اس کے تشخیصی شرح نامے تحریروں میں درج ہیں تذکرہ کے متن میں ہمیں یہ فقرہ "بیشتر نسق اور پیمائش بہت ہی تھوڑی رائج ہے" ملتا ہے۔ لیکن (بجز سورتھ کے) تمام ضلعوں کے شماریات میں بیشتر پرگنوں کے رقبوں کو تشخیص کیا ہوا، یا مالیت قائم کیا ہوا دکھایا گیا ہے اور چونکہ ہم ان اعداد کو مشکل ہی سے قیاسی تصوّر کرتے ہوئے نظر انداز کر سکتے ہیں، لہذا ہمیں یہ تصوّر کرنا چاہیئے کہ کسی نہ کسی وقت مزروعہ رقبہ کی پیمائش کی گئی ہوگی۔ ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ انیسویں برس کے بعد کسی وقت یہاں نظامِ ضبط کو شروع کیا گیا تھا اور پھر اس طور پر حاصل کی ہوئی معلومات کی بنا پر قائم کی ہوئی مستاجری یا اجتماعی تشخیص کے بالمقابل اپنے مسترد کر دیا گیا۔ لیکن کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس پر کسی قطعی نتیجہ کی بنیاد قائم کی جا سکے۔ شماریات سے سورتھ کے پورے ضلع اور دیگر دوسری چند جگہوں پر سرداروں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔

مذکورہ بالا تلخیص میں کشمیر اور افغانستان کے کوہستانی علاقوں میں مروّج نظاموں کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ ان خطوں کے انتظامات پیچیدہ اور نرالے تھے کیونکہ انھیں مقامی حالات کے مطابق ڈھالا گیا تھا اور آئین میں مندرج حالات میں بہت کچھ ایسا مواد ہے جو مقامی موّرخ کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے، لیکن اس سے پوری مملکت کے مالی نظام کے طریق کار پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ جن واقعات کو اوپر یکجا کیا گیا ہے اس سے بجا طور پر یہ عمومی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اکبر کم از کم ۴۰ سنہ جلوس تک نظامِ ضبط کا پابند رہا اور اسے جہاں تک حالات نے اجازت دی پھیلایا، لیکن اس نے اسے مقامی حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے نافذ کرنے کی کوشش نہ کی۔ اب دلچسپ ترین سوال یہ باقی رہتا ہے کہ ضبطی نظام کے علاقوں میں کس حد تک مقامی حالات کا لحاظ رکھا جاتا تھا یا بہ الفاظ دیگر ان علاقوں کا کس قدر حصہ فی الواقعی سرداروں کے حدودِ اختیار کے اندر چھوڑا گیا تھا؟

جو اطلاعات تحریروں میں ملتی ہیں، ان کی بنا پر ہم اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کیونکہ جن اشارات پر ہمارا انحصار ہے ان میں کچھ زیادہ اور کچھ کم قابل اعتبار ہیں۔ ہم یہ اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ راجپوتانہ کا زیادہ حصہ سرداروں کا علاقہ تھا اور ہم گونڈوانہ کے چاروں طرف یعنی الہ آباد اور بہار کے جنوب میں، اڑیسہ کے مغرب میں، برار کے شمال میں اور مالوہ کے مشرق میں، سرداروں کے حلقے کے قسم کی کسی چیز کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ لیکن مملکت کے سندی حصے کے متعلق بہت زیادہ عدم تیقن پایا جاتا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ انتظامیہ کا عام رویہ معاندانہ رہا ہو اور یہ کہ ابوالفضل کا اکبرنامہ [(2) 60] میں مندرج یہ قول کہ "ہندوستانی زمینداروں کا عام رواج یکسوئی کی راہ سے انحراف کا اور ہر طرف دیکھنے کا اور جو شخص بھی فاتح ہو یا زیادہ شورش پیدا کرنے کا اہل، اس سے متحد ہو جانے کا ہے" درست ہے اور ہم شاید یہ تصور کر سکتے ہیں کہ عام صورتوں میں بنائے قیاس سرداروں کے خلاف تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اکبر اس قسم کا انسان نہ تھا جو کسی عام اصول کی انتظام حکومت کے عملی کاموں میں بہت زیادہ پابندی کرتا ہو۔

اس سلسلہ میں وہ علاقہ جو اب اودھ کہلاتا ہے، ایک خصوصی دلچسپی کا حامل ہے کیونکہ مقامی روایات سے یہ واضح اطلاع دستیاب ہوتی ہے کہ بہت سے راجپوت سرداروں نے پورے مغلیہ عہد کے دوران اپنے اقتدار کو عملاً محفوظ حالت میں رکھا۔ "تذکرہ" میں مندرج اس صوبہ کے بیان میں اس قسم کی کسی چیز کی نشاندہی نہیں ملتی اور نہ شماریات ہی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ضلع کی ایک بھی ذیلی تقسیم کی حیثیت کسی لحاظ سے استثنائی تھی اور سرکاری تحریریں جیسی کہ یہ ہیں، ان کی بنا پر ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس صوبہ کے ہر ضلع میں نظام ضبط رائج تھا۔ یہ تسلیم کہ مقامی روایتوں کا رجحان، سرداروں کے اختیارات کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرنے کا ہے، لیکن انھیں مسلّم طور پر نظرانداز بھی کر دینا آسان نہیں۔ میرا شبہہ یہ ہے کہ حقیقت ان دونوں بیانات کے درمیان کہیں واقع ہے اور یہ کہ انتظام حکومت کے موثر طور پر بہ طریق معمول کام کرنے کی صورت میں، یہ نظام عملاً بیشتر سرداروں کی وساطت سے کام کرتا تھا جنھیں اپنے کسانوں کی ادائیگی کے ایک جز کو خود رکھ لینے کی اجازت تھی۔ لیکن اس نظریہ کی تائید میں مجھے کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جسے شہادت کہا جا سکے اور جب تک نئے واقعات علم میں نہ آئیں، اس وقت تک اس سوال کا جواب نہیں دیا جا سکے گا۔

***

باب 4

حوالہ جات

1۔ گلبدن' 11 ب۔

2۔ بابرنامہ، 520۔ بابر کے دیئے ہوئے اعداد کو فارسی نسخہ میں 'جمع' بیان کیا گیا ہے (ایضاً ضمیمہ ص 54)

3۔ گلبدن' 30 ب' 158۔ ایلیٹ (5)' 123' 141

4۔ آئین (1)' 7۔ بلاکمین (1)' (10)

5۔ اسلوب تحریر کے متعلق ملاحظہ ہو بلاکمین کا دیباچہ (1)' 4۔

6۔ میں نے 'AWADH' کی ہجے کو اس امر کی ایک سکت یاددہانی کے طور پر اختیار ہے کہ اکبر کا اس نام کا صوبہ باعتبار وسعت ملک کے اس حصے سے جو اب A U D H کہا جاتا ہے بہت مختلف تھا۔

7۔ آئین (1)' 297' 347۔ اس فصل کے سلسلے کی عبارتوں پر ضمیمہ ذ میں بحث آئی ہے۔

8۔ فراواں سخن تقی' ۔ آئین (1)' 347۔

9۔ اکبر کے عہد میں جن قیمتوں کو معقول خیال کرتے تھے وہ آئین (1)' اوراق 60 ومابعد پر درج ہیں۔ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی 1918ء اوراق 375 ومابعد پر میں نے واضح کیا ہے کہ ان قیمتوں کی باہمی نسبت بہت کچھ وہی ہے جو 1910۔12ء میں تھی اور جن تمام دیگر اعداد کی میں نے جانچ کی ہے ان کے درمیان بھی یہی نسبت پائی جاتی ہے، مثلاً گیہوں اور چنے کی قیمتیں چھ صدیوں کی مدت میں بہت زیادہ تبدیل ہوئی ہیں، لیکن بمقدار چنے کے ایک پاؤنڈ کے گیہوں کے ایک پاؤنڈ کی قیمت، تاریخ کی مستحکم ترین نسبتوں میں سے ہے۔ یہاں اس امر کا اضافہ مناسب ہوگا کہ بعض جدید تصنیفوں میں جہاں چنے کے لئے غلط عدد لے لی گئی ہے اس نسبت پر پردہ پڑ گیا ہے۔ تاریخی کتابوں میں کبھی کبھی چنے کی دو قیمتوں کا حوالہ آیا ہے۔ "کابلی" جو غیر ملکی تھا گیہوں سے گراں تھا اور "سیاہ" عام قسم کا کم قیمت تھا۔ ایڈورڈ ٹامس نے 'THE CHRONICLES OF THE PATHAN KINGDOMS OF DELHI' صفحہ 280 میں اکبر کے عہد میں چنے (نخود) کی قیمت کو ½ 19 درم درج کیا ہے جو غیر ملکی چنے کی قیمت ہے دیسی چنے کی قیمت 8 درم تھی۔

۱۵ اس موضوع پر جملہ اطلاعات کو ضمیمہ ذ میں لکھا گیا ہے۔

۱۱ خافی خاں کی سرگذشت میں مندرج ٹوڈرمل کی شرحوں کے بہت بعد کے بیان کو جن وجوہ سے میں نے مسترد کیا ہے وہ ضمیمہ ر میں دکھائے گئے ہیں۔

۱۲ خاص طور پر انیسویں برس جبکہ بعض مصنفین نے تشخیص شرحوں پر نظرثانی کئے جانے کی نشاندہی کی ہے تبدیلی کی کوئی علامت نہیں ملتی۔

۱۳ ماخذ پر ضمیمہ ذ میں بحث آئی ہے۔

۱۴ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی، 1918ء ص ص 12، 13 میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ آئین میں دستور کے معنی کوئی مقامی رقبۂ زمین نہیں ہے جیسا کہ بعض عہدِ حاضر کے مصنفین نے اس سے منسوب کیا ہے، بلکہ یہ ریٹ سے مختلف ہے جس سے غلّہ کی شرحوں کا مفہوم ہوتا ہے اور نقدی شرحنامہ کا صحیح سرکاری نام ہے۔

15 آئین (1)، 294، 296۔

۱۶ اکبرنامہ (3)، 463، 464، 533، 577۔

17 ایلیٹ (6)، 193۔ فصل کے نقصان کے باعث چھوٹ کے لئے ملاحظہ ہو آئین (1)، 288۔

18 انعامات جو ہمارے مطالعہ میں آتے ہیں ان سے معمولاً اعلیٰ عہدہ دار مستفید ہوتے تھے۔ اس اصطلاح میں شاہزادے اور خاندانِ شاہی کے دیگر افراد شامل ہیں۔ خاص طور خواتین معمولاً اپنی آمدنی کے کم از ایک جزو کو انعام کی شکل میں پاتی تھیں۔

19 طریقۂ کار کی تفصیل آئین (1)، 193 پر ملتی ہے۔ لیکن یہ مسلّم باب فوجی شعبہ کے طریقِ کار سے جہاں احکام مرتب کئے جاتے تھے متعلق ہے۔ اس باب میں وزارت جس نہج پر ان احکام کی تعمیل کرتی تھی اسے بیان نہیں کیا گیا ہے ہمیں اسے مختصر عبارتوں سے اخذ کرنا ہوگا۔

20 ایک سابق محصّل بایزید ہمیں بتاتا ہے (ورق 154) کہ جب اکبر نے اسے ایک پرگنہ بطور پنشن منظور کیا تو وہ کس طرح پر تفصیلات طے کرنے کے لئے وزارت میں پہونچا اور راجہ ٹوڈرمل سے جو اس وقت اس کام کا نگراں تھا اس سلسلہ میں حجت ہوئی۔ ہاکنس (EARLY TRAVELS ص 114)، میں اپنے جاگیروں میں مستقل تبدیلیوں کا ذکر کرتا ہے، یہاں تک کہ ہر چیز کا انحصار اس امر پر رہا کرتا کہ ایک شخص کس درجہ میں وزیر کا دوست تھا یعنی وزارتِ مال کے سربراہ کا۔ غالباً اس کے زمانہ میں بمقابلہ عہدِ اکبری کے حالات زیادہ خراب تھے، لیکن اصلاً نظام وہی تھا۔

۲۱ اس موضوع سے متعلق عبارتوں پر ضمیمہ ذ میں بحث آئی ہے۔

۲۲ اس عہد میں ان علاقوں کو صوبے کہنا سہولیت کا تو سبب ہو سکتا ہے مگر اصل میں یہ صحیح نہیں ہے۔ مملکت کے صوبوں

کے اندر تقسیم کی ابتداً سنہ 24 جلوس سے ہوتی ہے (اکبرنامہ (3) 282 ۔

23 چنار کے لئے اکبرنامہ (3)، 158، تھتھیور کے لئے (3)، 210 اور پنجاب کے لئے (3)، 248 ۔

24 ان عبارتوں پر ضمیمہ ذ میں بحث آئی ہے۔

25 اکبرنامہ [(3)، 117] کی جس عبارت میں ناگہانی ضرورت کا ذکر آیا ہے اس میں آگے چلکر درج کیا گیا ہے کہ بادشاہ نے پہلے ملک کو براہ راست اپنے انتظام میں لیا۔ لفظ "پہلے" (نخستیں) کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہو سکتا ہے کہ یہ عمل مزید کارروائیوں کا محض پیش خیمہ تھا۔ لیکن مجھے سلسلۂ عبارت میں "دوسرے" کا لفظ نہیں ملتا ۔

26 طریق کار کو آئین (1) 198 اور بلاکمین نے اس باب کے اپنے ترجمہ میں آئین کی جو تلخیص [(1) صہ 270 وما بعد] کی ہے اس میں بیان کیا ہے ۔ اس عہد میں نقدی گذاروں کو وظیفہ اور زمینی عطیات کو 'ملک' یا 'مدد معاش' کہتے تھے۔

27 ان دستاویزوں کے لئے ملاحظہ ہو ایس۔ ایچ ہوڈی والا (STUDIES IN PARSI HISTORY) صہ 107 وما بعد ۔ جے۔ مودی (THE PARSIS AT THE COURT OF AKBAR) جے۔ آر۔ اے۔ ایس (بمبئی) 1902ء صہ 69 وما بعد اور (A FARMAN OF EMPEROR JAHANGIR) مصنف ایضاً 1920ء، صہ 419 وما بعد ۔

28 بدایونی (2)، 189۔ میں عام طور پر لو (LOWE) کے ترجمہ کی جیسا کہ اغلاط نامہ میں اس کی ترمیم کی گئی ہے تقلید کرتا ہوں ۔ ابتدائی فقرہ کے لئے لو "اس کے ذہن میں ایک نیا خیال پیدا ہوا" لکھتا ہے۔ لیکن متن میں کسی ایسے شخص کا ذکر نہیں ہے جس کی طرف "اس کے" کی ضمیر رجوع کرے اور میں اس فقرہ کو لا شخصی اور حقارت آمیز تصور کرتا ہوں ۔

29 اس عبارت کا میرا ترجمہ اورینٹل 2274 ورق 203 ب جس کی میں نے ایڈیشنل 6543، ورق 258 اور آر۔ اے۔ ایس 46 (مارلے) ورق 262 سے جانچ کی ہے مبنی ہے۔ ایڈیشنل 6543 میں ابتدائی فقرہ ناقص ہے کیونکہ اس کا نقل کرنے والا پہلے کو چھوڑ کر دوسرے "غیر مزروعہ" کے لفظ پر پہونچ گیا ہے ۔ آر۔ اے۔ ایس 46 میں بہت سی فاش غلطیاں ہیں، لیکن اس میں عمومی مطابقت پائی جاتی ہے ۔ ایلیٹ (5)، 86 کی عبارت کافی زیادہ مختلف ہے۔ جن مخطوطات پر یہ مبنی ہیں ان کی صراحت نہیں کی گئی ہے، لہٰذا میں اختلافات کی تفصیل جانچ نہ کر سکا۔

30 اکبرنامہ (3)، 861 ۔ ماثر الامرا (2) صہ 123 وما بعد۔ اس کے بعد ٹوڈرمل کی ملازمت کا جو خلاصہ بیان کیا گیا وہ اکبرنامہ (3)، 80، 108، 193، 207، 214، 215، 248، 250، 265، 282، 316، 327، 372، 381، 403، 457 پر مبنی ہے۔

31 یہ خلاصہ اکبرنامہ (3)، صہ 874 وما بعد کے متن پر مبنی اور مسٹر بیورج کے ترجمہ کی بعض عبارتوں سے مختلف ہے ۔

32 بایزید کی تحریر (ورق 154) سے ہمیں اس وقت فتح اللہ کی وزارت میں کام کی ایک دلچسپ جھلک ملتی ہے ۔ جیسا کہ پیشتر کسی نوٹ میں ذکر آچکا ہے، ٹوڈرمل کو بایزید پر اس کے پرگنہ کے متعلق گفت و شنید کے سلسلہ میں غصہ آ گیا تھا۔

اس تنازعہ کے کچھ دنوں قائم رہنے کے بعد فتح اللہ نے مداخلت کی اور معاملہ کو اکبر کے سپرد کردیا جس نے بایزید کے موافق فیصلہ کیا۔

33۔ اکبرنامہ (3) 605، 670۔ میرے یہ خیال ظاہر کرنے کے (جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی، 1922ء حصہ 22) وقت تک ممکن ہے کہ اس تبدیلی کی ابتدا جہانگیر کے عہد حکومت سے ہوئی ہو یہ بعد والی تحریر میری نظر سے نہیں گذری تھی۔

34۔ آئین (1)، 285۔ 288۔ ان ابواب کو ایک ساتھ پڑھنا چاہئے۔ آخرالذکر باب کی تفصیلات اول الذکر میں مندرج عمومی نوعیت کے ضابطوں میں اضافہ کرتی ہیں۔

35۔ اکبرنامہ (3)، 381۔

36۔ آئین (1)، 301۔ جیرٹ کے پیداوار کے $\frac{2}{3}$ سے $\frac{1}{3}$ تک کے ترجمہ کی تصدیق متن سے نہیں ہوتی اور یہ ناممکن بھی ہے کیونکہ اس طرح حساب کرنے پر "گھٹا ہوا" "مطالبہ"، $\frac{1}{3}$ کے عام مطالبہ سے زاید ہوجائے گا۔

37۔ ملاحظہ ہو مثلاً اکبرنامہ (3) 574 جس میں گماشتہ کی بد اطواری کو بیان کیا گیا ہے۔

38۔ بایزید ورق 149، 154۔ ہاکنس (ارلی ٹریولیس 114)، بادشاہ کے جاگیر کی زمین کو واپس لینے کا ذکر کرتا ہے، "اگر یہ زرخیز زمین ہو اور اس سے زیادہ حاصل کا امکان ہو"۔

39۔ آئین (1) صفحہ 386 و مابعد۔ حالات میں مندرج اطلاع کو بعض صورتوں میں تشخیصی شرحوں کے گوشواروں سے جو صفحہ 3..؟ پر شروع ہوتے ہیں جانچا جاسکتا ہے۔

40۔ مالوہ کے بیان کی ابتدائی عبارتوں پر آئین (1)، 455 تا ابوالفضل کی تحریر کی چھاپ موجود ہے اور اس میں اس کا تینتالیسویں سال میں اُجین کا اس وقت کا ایک ذاتی مشاہدہ شامل ہے جب وہ دکن جاتے وقت وہاں سے گذرا تھا۔

41۔ ان اشاروں کی وضاحت ضمیمہ زمیں کی گئی ہے۔

42۔ آئین (1)، 381۔ مالوہ میں تشخیصی حلقوں کی زمرہ بندی نافہم ہے۔ متن کو اس کی موجودہ حالت میں پڑھتے ہوئے، دوسرے صوبوں میں جن خطوط کی تقلید کی گئی ہے ان کی بنیاد پر اجین اور رائے سین ایک حلقہ میں ہونے چاہئیں۔ لیکن گوشوارہ میں انھیں علیحدہ علیحدہ دکھایا گیا ہے اور بیان میں کچھ الفاظ بظاہر حذف ہوگئے ہیں۔ سب سے زیادہ امکانی خواندگی اس طور پر ہے (1) گڑھا اور مردسور کے لئے گوشوارے نہیں طیار کئے گئے تھے (2) ایک گوشوارہ چندیری کا اور رائے سین میں (3) دوسرا گوشوارہ مانڈو میں (4) ایک تیسرا اچین نام کا، بقیہ سات ضلعوں میں نافذ تھا۔ قارئین جن کا انحصار جیرٹ کے ترجمہ پر ہے گڑھا کے اعداد کو قنوج کے غلط اعداد کے تحت پائیں گے [(2) 199]۔

43۔ اس عہد کی بعض تصنیفوں میں بہار کے نام کو اس علاقہ تک محدود رکھا گیا ہے جو دریائے گنگا کے جنوب میں واقع ہے۔ لیکن آئین میں دراصل اس کے موجودہ معنی لئے گئے ہیں یعنی سارن، چپارن اور ترہت کو جو دریا کے شمال میں

واقع ہیں اس میں شامل کیا گیا ہے۔

لک یہ ممکن ہے کہ ٹوڈرمل نے تیئیسویں برس اپنے سفر کے دوران "مالیت کو صحیح کرنے اور گجرات کا انتظام کرنے کی غرض سے پیمائش" جاری کی ہو (طبقاتِ اکبری، ایڈیشن 6543، ورق 247 آر) لیکن مجھے اس امر کی وضاحت کرنے والی کوئی تحریر نہ ملی کہ اس نے اس وقت کیا کیا۔

باب 5

سترھویں صدی

1۔ جہانگیر اور شاہ جہاں (1605-1658)

سترھویں صدی کے نصف میں مروجہ زرعی نظام کے متعلق ہماری معلومات ناکافی اور نامکمل ہیں۔ مجھے اس عہد کے متعلق کوئی ہم عصر سرکاری دستاویزات نہ مل سکے۔ ہم عصر سرگذشتیں کوئی اہم تبدیلیاں نہیں ظاہر کرتیں اور ہم ان کی خاموشی پر اعتماد کریں تو اس نتیجہ پر پہونچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اکبر کے تحت تشخیص کے جن طریقوں کو مکمل کیا گیا تھا اور جنھیں ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں، اس عہد میں انہیں طریقوں پر ان کی اصل شکل میں عملدرآمد ہوتا رہا۔ لیکن ہمارے اس نتیجے کی 1665ء میں اورنگزیب کے جاری کئے ہوئے احکام سے جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس وقت تک اکبر کے طریقے تقریباً مکمل طور پر متروک ہو چکے تھے، قطعی طور پر نفی ہوتی ہے۔ لہذا ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ 1594ء جبکہ آئین مکمل ہوئی اور اورنگزیب کی تخت نشینی کی درمیانی مدت میں یا تو غیر مندرج تبدیلیاں باضابطہ طور پر عمل میں لائی گئی تھیں یا بصورت دیگر اور میرے خیال کے مطابق قدرے زیادہ امکانی صورت یہ ہے کہ عہد اکبری کے ادارے بتدریج زوال پذیر ہو گئے تھے۔ اورنگزیب کے احکام سے جو صورت سامنے آئی جس پر تفصیلی بحث اگلی فصل میں آئے گی اس طور پہ ہے کہ ایک طرف بعض غیر متعین اور پسماندہ خطوں میں تو غلہ بخشی کی منظوری دی گئی مگر مملکت کے لئے عام قاعدہ اجتماعی تشخیص کا رکھا گیا اور دوسری طرف ضبط اور غلہ بخشی کے متبادل طریقوں کو صرف ان صورتوں میں استعمال کرنے کے لئے جبکہ چودھری مطالبۂ مالگزاری کی کسی سالانہ رقم کو قبول نہ کریں، محفوظ رکھا گیا۔ میں اس قسم کی کسی تبدیلی کے قانونی شکل دیئے جانے کے متعلق کسی حکم کا پتہ نہ چلا سکا اور میرے یہ سوچنے کے لئے کہ یہ تبدیلی خود بخود پیش آگئی یہ اسباب ہیں: اول یہ کہ اگر اس کے لئے باضابطہ احکام جاری ہوئے ہوتے تو

ہمیں یہ توقع کرنی چاہیئے کہ ان کا سرگذشتوں میں کچھ ذکر آتا اور دوسرے یہ کہ اس وقت کے حالات کے تحت اکبر نے طریقوں کا تدریجی انحطاط ہی متوقع تھا۔

پچھلے باب کے مندرجات سے یہ واضح ہوگا کہ فصلی پیمائش کا طریقہ خرچ طلب اور بوجھل تھا۔ ہم اسے ایک طاقتور انتظامیہ کے تحت ایک موثر ترکیب کا تو درجہ دے سکتے ہیں لیکن وزارت کے کمزور ہونے یا اسے بادشاہ کی قوتِ عمل کا سہارا حاصل نہ ہونے کی صورت میں یہ طریقہ غالباً ناقابلِ عمل اور تقریباً یقینی طور پر ظالمانہ تھا۔ دوسری طرف اجتماعی تشخیص کا ارزاں اور آسان تر طریقہ دسترس کے اندر تھا جسے اکبر نے تو بے شک محفوظ علاقوں میں ممنوع کردیا تھا لیکن وزارتِ مال اس طریقہ سے بالکل مانوس تھی اور یہ فی الواقعی مملکت کے اہم حصوں میں زیرِ عمل بھی تھا۔ اکبر کے شخصی اثر کے ہٹ جانے کے بعد ضبط کے طریقہ میں انتظامی دشواریوں کے دوبارہ ظاہر ہونے پر اجتماعی تشخیص کے تدریجی پھیلاؤ میں کم از کم رکاوٹ محسوس کی گئی۔ کم از کم کچھ مدت کے لئے اس تبدیلی میں کسی خرابی کا ظاہر ہونا امر لازم نہ تھا۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ اس وقت جو حالات تھے ان کے پیش نظر شمالی ہندوستان کے لئے بہترین انتظام یہ تھا کہ دو متبادل صورتیں یکے بعد دیگرے اختیار کی جائیں یعنی پہلے ضبط کے طریقہ پر اس قدر کافی عرصہ تک عمل کیا جائے کہ پیداواری صلاحیت کے متعلق ضروری مواد فراہم ہوجائے اور پھر اس کی جگہ اس مواد پر مبنی اجتماعی تشخیص کو لاکر اسے اس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک کہ معاشی تبدیلیوں کے باعث یہ متروک نہ ہوجائے۔ یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ زیرِ بحث تبدیلی کے پسِ پشت کچھ اسی قسم کا تخیل کارفرما رہا ہو۔ لیکن عمل کے اعتبار سے ان دونوں طریقوں کے باری باری اختیار کئے جانے کی کوئی علامت نہیں ملتی۔ تاہم جب کبھی بھی یہ تبدیلی پیش آئی ہو ہمیں اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرنا چاہیئے۔ مگر اورنگ زیب کے احکام کی تفصیلی جانچ کے قبل، مناسب ہوگا کہ صدی کے نصف اول سے متعلق جو تھوڑی قطعی اطلاعات ہمارے پاس موجود ہیں انہیں یکجا کردیا جائے۔

اس عہد کی سرگذشتوں میں جاگیر میں دیئے جانے والے اور محفوظ علاقوں کے درمیان ایک واضح امتیاز ملتا ہے۔ مالگزاری زمین کے معاملہ میں، مملکت کے ایک مختصر سے حصہ کا انتظام وزارت کے براہِ راست احکام کے تحت صوبجاتی دیوانوں کے سپرد تھا اور بیشتر حصہ کو پچھلے باب میں مندرج خطوط پر جاگیر میں دے دیا گیا تھا۔ ۱۶۴۷ء میں پوری مملکت کی 22 کروڑ روپے کی سالانہ آمدنی میں، محفوظ علاقہ کی آمدنی ۳ کروڑ تصور کی جاتی تھی۔ اس طور پر کسانوں کی بڑی اکثریت جاگیرداروں

کے تحت میں تھی اور ہو سکتا ہے کہ یہ تناسب وقتاً فوقتاً کم و بیش ہوتا رہا ہو مگر اس بیان کا عمومی اطلاق پورے زیر بحث عہد پر ہوتا ہے۔ یہاں مآثر الامرا نام کے تذکرہ میں مندرج اس صدی کی مالی تاریخ کے خاکہ کا ایک خلاصہ پیش کرنا کار آمد ہوگا۔ یہ کتاب اس عہد کے لئے کوئی بلاواسطہ ماخذ نہیں ہے اور اس کے شماریات کی صحت پر شبہہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن امکان نہیں کہ اس خاکہ کے مندرجات طبع زاد ہوں اور اگر اس کا ہر جز نہیں تو اس کا مغز غالباً صحیح ہے۔ اس ماخذ کی رو سے، اکبر کے تحت تیزی سے بڑھتے ہوئے شاہی اخراجات کو مملکت کے پھیلاؤ نے ضرورت سے زائد پورا کر دیا تھا اور محفوظ رقم کی شکل میں کافی نقد جمع ہو گیا تھا۔ جہانگیر نے انتظام حکومت کے معاملہ میں غفلت برتی جس کے نتیجہ میں دھوکہ بازی عام تھی اور بالآخر محفوظ علاقوں کی آمدنی گھٹ کر ۵۰ لاکھ روپے ہو گئی جبکہ سالانہ خرچ ۱۵۰ لاکھ تھا۔ مجبوراً جمع کئے ہوئے خزانہ سے بڑی بڑی رقمیں برآمد کی گئیں۔ شاہجہاں نے تخت نشین ہونے کے بعد مالیات کی بنیاد کو مستحکم کیا۔ اس نے اس قدر علاقہ کو محفوظ قرار دیا جس کی آمدنی کا شمار ۱۵۰ لاکھ تھا اور اس نے معمول کے اخراجات کو ۱۰۰ لاکھ پر معین کیا۔ اس طور پر اس کے پاس ہنگامی ضرورتوں کے لئے ہر سال جمع ہونے والی کثیر بچت جمع ہو گئی۔ پھر اخراجات اس حد سے بہت زیادہ تجاوز کر گئے۔ لیکن ایک چوکس نظام حکومت کے باعث محفوظ رقم بڑھ کر ۱۶۴۷ء تک ۳۰۰ اور اختتام عہد تک تقریباً ۴۰۰ لاکھ ہو گئی۔ اورنگزیب نے شروع میں تو آمدنی اور خرچ میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن دکن میں اس کی طویل جنگیں تباہ کن ثابت ہوئیں اور اس کی وفات پر خزانہ میں صرف ۱۰ یا ۱۲ کروڑ روپے بچ رہے تھے جسے اس کے جانشینوں نے بہت تیزی کے ساتھ ضائع کر ڈالا۔

جہاں تک جہانگیر کا تعلق ہے، مذکورہ بالا بیان گزشتوں کی اطلاعات اور نیز ہندوستان میں مقیم غیر ملکیوں کے مشاہدات سے قریبی مطابقت رکھتا ہے۔ اس نے اپنے عہد حکومت کے آخری دور میں نظام حکومت کو بالکل اپنی ملکہ اور اس کے بھائی کے ہاتھ میں چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس کا قدرتی نتیجہ اسراف اور نااہلی کی شکل میں ظاہر ہونا تھا اور وزارت مال کے حالات کے متعلق اس کی اپنی تزک میں خاموشی سے مالی معاملات سے اس کی بے تعلقی کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس تصنیف کی چند عبارتیں قابل توجہ ہیں۔ ان میں سے ایک اس کے اپنی تخت نشینی پر جاری کئے ہوئے ضابطوں کا فقرہ سات (تزک، 4) ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ سرکاری عمال اور جاگیرداروں کو کسانوں کی زمین کو بہ جبر خود اپنی کاشت میں نہ لانا چاہئے۔ ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس

قسم کے واقعات پیش آئے تھے جو بدنامی کا باعث ہوئے تھے۔ مملکت کے بیشتر حصوں میں فاضل زرخیز زمین موجود تھی لیکن ساتھ ساتھ ایسی منتخب قطعات بھی تھے جو اپنی پیداواری اور محل وقوع کے لئے پسند کئے جاتے تھے جیسے کہ اہب' نیباتھ کے انگور کے باغات کی ہوس رکھتا تھا اور جہانگیر کی سیرت کے متعلق ہماری جو اطلاع ہے اس کا یہ تقاضہ تھا کہ وہ اس طریقہ کی مذمت کرتا گو کہ ہمیں اس کا یقین نہیں کہ اس کے احکام کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ ایک دوسری عبارت[56] میں بادشاہ جس کا نفیس پھلوں کا ذوق شہرت رکھتا ہے'' رقمطراز ہے کہ یہ پھلوں کے درخت ہمیشہ محصولوں سے مستثنیٰ تھے اور جیوں ہی کسی مزروعہ زمین پر باغ نصب کر دیئے جاتے وہ تشخیص کے عمل سے بری ہو جاتی لیکن جیسا کہ اور ذرائع سے معلوم ہوتا ہے اس عبارت کے الفاظ مظہر ہیں کہ پھلوں کے درخت پر محصول ان متفرق آمدنیوں میں سے ایک مد تھی جو باوجود بار بار ممانعت کے قائم رہی۔

واحد اور قطعی جدت جس کے متعلق جہانگیر ذکر کرتا ہے[57] وہ مہر لگی ہوئی معافی (التمغا) کا اجرا ہے۔ اس لحاظ سے کہ یہ معافیاں ایسی ہیں جو مغلیہ عہد میں ملکیت زمین کے موجودہ مفہوم سے قریب ترین مشابہت رکھنے والی چیز ہے دلچسپی کا باعث ہے۔ ان معافیوں کے حدود میں ایسی صورت آتی تھی جب کوئی مستحق عہدہ دار اپنے'' وطن'' یعنی اپنی پیدائش کے موضع یا پرگنہ کی معافی کا خواستگار ہوا کرتا۔ ایسی صورت میں معافی پر ایک خاص شکل کی مہر لگا کر دی جاتی تھی جو تبدیل یا منسوخ نہ کی جا سکتی تھی۔ لہٰذا اس عہد میں زمین کے دیگر حق ملکیت کے مقابلہ میں' ہم اسے دوامی تصور کر سکتے ہیں' لیکن بہر حال قدرتی طور پر ایک مطلق العنان فرمانروا کو اسے منسوخ کرنے سے کوئی باز نہ رکھ سکتا تھا۔ یاد رہے کہ یہ مہر لگی ہوئی معافی کوئی ہندوستانی طریقہ کی چیز نہ تھی بلکہ مسلمہ طور پر وسط ایشیا کے رواج کی ایک نقل تھی۔ مجھے ایسی تحریریں نہیں ملی ہیں جن سے یہ پتہ چلے کہ سترھویں صدی میں ایسی معافیاں کس تعداد میں دی گئیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت شاذ تھیں۔ بادشاہ نامہ جن بیس برسوں پر محیط ہے اس پوری مدت میں' مجھے ایک کامیاب معالج کی واحد ایسی مثال ملتی ہے جسے منجملہ اور دوسرے انعامات کے اس نام پر ایک موضع ملا اور بعد کی تحریروں سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ صدی کے بقیہ حصہ میں اس نے کوئی عملی اہمیت حاصل کی۔

زرعی نظام کے متعلق جہانگیر کی ذاتی سرگرمیوں کا تحریری بیان اس قدر قلیل ہے۔ دیگر ماخذ سے اس کے عہد حکومت کے دوران اس کے طریق عمل کے متعلق کچھ ضمنی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ہمارے علم میں[58] ہے کہ کم از کم بعض صورتوں میں صوبیداروں اور دوسرے اونچے عہدیداروں

کی تقرریاں مستاجری کی شرائط پر عمل میں آئیں۔ لیکن کسی بات سے یہ اشارہ نہیں ملتا کہ یہ مستاجر محفوظ علاقوں کے محاصل کے کسی جز کے پانے کے مستحق تھے۔ یہ علاقے بادشاہ کے جانب سے دیوان کے زیرِ انتظام ہوا کرتے۔ پس ہمیں اونچے عہدوں کی ان اجارہ داریوں کو تیرھویں اور چودھویں صدیوں کے کچھ حصوں میں مروجہ انتظامات سے ممیز کرنا چاہیئے۔ اس دور میں مستاجری کی شرائط پر مقرر کیا ہوا صوبیدار جملہ محاصل سے استفادہ کیا کرتا جس کا غالباً بہت بڑا حصہ زمین سے حاصل ہوتا تھا۔ جہانگیر کے تحت مالگزاری زمین کی نگرانی ایک علحدہ شعبہ کے سپرد تھی اور صوبہ دار اس میں سے صرف اس قدر پایا کرتا جو اس کی ذاتی جاگیر سے حاصل ہوتا۔ اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ دیوانوں نے کچھ محفوظ علاقوں کو اجارہ پر دے دیا ہو لیکن اس مسئلہ پر کسی شہادت کا ہمیں علم نہیں۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض اوقات جاگیرداران[6] اپنی آمدنی کو اجارہ پر دیتے تھے۔ لہٰذا ہمیں یہ تسلیم کرلینا چاہیئے کہ اس عہد میں کسان عملی طور پر اجارہ داری سے مانوس تھے۔

گجرات کے زرعی دستور العمل کے متعلق: 163:ء سے تھوڑے ہی قبل لکھے ہوئے ایک تذکرہ[7] کے مطالعہ سے ہم کسانوں کے حالات کے کچھ زیادہ قریب پہونچ جاتے ہیں۔ اس تذکرہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی شخص جو کسی زمین کی کاشت کرنا چاہتا ہے، موضع کے چودھری جسے مقدم کہتے ہیں کے پاس جاتا ہے اور اپنے موقع کی جس قدر بھی زمین کی اسے خواہش ہوتی ہے طلب کرتا ہے۔ یہ مطالبہ شاذ ہی مسترد کیا جاتا ہے بلکہ ہمیشہ قبول ہی کرلیا جاتا ہے کیوں کہ یہاں زمین کا دسواں حصہ بھی مزروعہ نہیں ہے۔ پس ہر شخص بہ سہولیت اپنی پسند کے مطابق جس قدر رقبہ چاہتا ہے پا جاتا ہے۔ اور وہ مالک کو محصول کی ادائیگی کی شرط پر جس قدر کاشت کرسکے کرتا ہے۔ اس تذکرہ سے وہ بنیادی فرق واضح ہوتا ہے جو اس وقت سے اب پایا جاتا ہے جبکہ زرخیز زمین پوری طور پر مصرف میں آچکی ہیں، آراضیات معمولاً دوامی ہیں اور ایک کامیاب کسان کو اکثر توسیع کاشت میں دقت ہوتی ہے جب تک فاضل زمین موجود تھی کسان کو انتخاب کا موقع حاصل تھا اور جبکہ ایک طرف ہم معقول طور پر یہ تصور کرسکتے ہیں کہ عام آدمی کا بعض کھیتوں پر بطور مستقل آراضی کے قبضہ رہا کرتا، لیکن دوسری طرف وہ اپنے وسائل اور دوسرے حالات کے مطابق اپنی زراعتی سرگرمیوں کو بڑھا گھٹا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انتظامیہ کے لئے اس بات کی گنجائش تھی کہ وہ ویران زمین کو زیرِ کاشت لانے اور مزروعہ زمین کو ویران ہونے سے روکنے کی کوشش کرے جیسا کہ اکبر کے ضابطوں کے تحت محصلین مالگزاری کو پابند کیا گیا تھا۔ یہ تذکرہ اس دفعہ سے بھی موافقت رکھتا ہے جو انہیں ضابطوں کے تحت کسی

موضع کو ترقی دینے کے سلسلے میں چودھریوں کی کوششوں کا صلہ دینے کے لئے رکھا گیا تھا۔

اس مآخذ کی رو سے گجرات میں جاگیردار کسان سے پیداوار کا تین چوتھائی پاتا تھا۔ لہذا مفلسی عام تھی اور بہت ہی تھوڑے کسان وسائل کے مالک تھے۔ یہ تناسب غالباً مبالغہ آمیز ہے کیونکہ اس سے تھوڑے بعد کے ایک مصنف[۵۸] نے جس کے روبرو یہ اطلاع تقریباً یقینی طور پر تھی تحریر کیا ہے کہ نصف یا بعض اوقات تین چوتھائی ادا کیا جاتا تھا اور یہ تصور کرتے ہوئے کہ اس میں ابواب یا متفرق جبری وصولیابی شامل ہیں، پیداوار کے نصف پر تشخیص کئے جانے کے طریقہ کی جو اورنگزیب کے تحت بخوبی قائم ہو چکا تھا نشاندہی ہوتی ہے۔

اس عہد کے متعلق دوسرا واحد قابلِ تحریر واقعہ جاگیروں میں بار بار تبدیلیوں کے باعث زرعی عدم استحکام[۵۹] کا ہے۔ جہانگیر سے گفت و شنید کرنے والے پہلے انگریز، ولیم ہاکنس نے مروجہ لاقانونیت کو ان مظالم سے منسوب کیا ہے جو "دہقانیوں" یعنی کسانوں کو جاگیرداروں کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑتا تھا اور اس نے اس خرابی کے لئے اس نظام کو یہ لکھتے ہوئے موردِ الزام قرار دیا ہے کہ:

"کوئی شخص اپنی روزی پر نصف سال بھی برقرار نہیں رہ سکتا کہ یہ اس سے لے کر دوسرے کو دے دی جاتی ہے۔ یا پھر (اگر یہ زرخیز زمین ہو یا اس سے زیادہ آمدنی کا امکان ہو) اسے بادشاہ اپنے لئے لے کر اس کے بدلے میں خراب زمین دے دیتا ہے۔ اس سب سے بچنے کے لئے اسے وزیر سے دوستی کرنا ہوتا ہے۔ اس طور پر بادشاہ غریبوں سے جو کچھ لے سکتا ہے اسے حاصل کرنے کے لئے انہیں سزا پہونچاتا ہے اور پھر بھی وہ ہر گھنٹہ اپنی جگہ سے بیدخل کئے جانے کا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جو ایک جگہ زیادہ مدت تک رہتے ہیں اور اگر وہ چھ برس بھی ایک جگہ رہ جائیں تو ان کی کمائی ہوئی دولت بے انداز ہوتی ہے، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔"

ہاکنس نے محض ایک تماشائی کی حیثیت سے یہ تحریر نہیں کیا تھا بلکہ جہانگیر نے اسے ایک معمولی سا عہدہ عطا کیا تھا اور اسے وزارت سے اپنی جاگیر کے تعین کے سلسلہ میں طویل گفت و شنید کرنا پڑی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ وزیرِ وقت کو ان امیروں کی متعدد شکایت کی وجہ سے "جنھیں اچھے مقامات پر نہیں بلکہ بنجر اور شورش زدہ جگہوں پر جاگیریں ملی تھیں اور یہ کہ اچھے مقامات سے اس نے خود استفادہ کیا تھا" ہٹا دیا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی مروّجہ نظام میں کسی تبدیلی کی کوئی علامت نہیں ملتی۔ ہم یہ شبہہ کر سکتے ہیں کہ ہاکنس نے تبادلوں کی کثرت کو مبالغہ سے بیان کیا ہے لیکن یہ بات کہ یہ بار بار

پیش آتے تھے دیگر شہادتوں سے بھی ظاہر ہے۔ پاکس کے چند برسوں بعد لکھتے ہوئے ٹیری نے ذکر کیا ہے کہ اونچے عہدہ داران معمولاً ہر سال ہٹا دیئے جاتے تھے اور اس کے بعد عام طور پر ان کی جاگیریں تبدیل ہوجاتی تھیں۔ گجرات کی مذکورہ بالا رپورٹ کے ولندیزی مصنف کا قول ہے کہ جاگیرداران ہر برس یا نصف برس یا ہر دو یا تین برسوں پر تبدیل ہوجاتے تھے "اور نتیجۃً ان میں سے کوئی بھی یہ پیشگی اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ اسے کون سی جگہیں ملیں گی، کیونکہ آج وہ ایک بڑی جگہ کا مالک ہے اور کل ہی وہ وہاں سے ہٹا دیا جاتا ہے۔" پلسارٹ نے بھی ۱۶۲۶ء میں آگرہ سے لکھتے ہوئے مملکت کے امرا کی غیر مستحکم حیثیت پر زور دیا ہے اور ہم جب ان مشاہدین کے بیانات کو خود تزکِ جہانگیری اور اس عہد کی دیگر سرگذشتوں کے ساتھ پڑھتے ہیں تو ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے سے نہیں بچ سکتے کہ مملکت کے بیشتر حصہ میں زرعی ترقی کی دوراندیشانہ پالیسی پر عمل کے قسم کی کسی چیز کا امکان ہرگز نہ رہا ہوگا کیونکہ کسی بھی جاگیردار کو یہ اطمینان نہ رہا کرتا کہ وہ اتنے دنوں تک اپنے عہدہ پر بحال رہے گا کہ وہ اپنی محنت کا ثمرہ پا سکے۔ ہمیں مزید یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک بڑھتی ہوئی عیش پرستی اور اسراف کا عہد تھا اور جاگیرداروں کی ضروریات بھی مائل بہ اضافہ تھیں جسے کسانوں کو پورا کرنا ہوتا تھا۔ اس زمانہ کے جملہ حالات، ملک کے وسائل میں اضافہ کے نہیں بلکہ افلاس کے امکان کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ہم عصر سرگذشتوں سے ہمیں شاہجہاں کی سرگرمیوں کے متعلق جہانگیر سے بھی کم اطلاع ملتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک بعد کا مصنف[۴۵] کسانوں کی تعداد میں اضافہ اور ان کی بہتری، مالی نظم و نسق پر اس کی مسلسل توجہ اور اس کے ان محصلین کو جو اپنے حلقوں کو ترقی دیں انعام دینے کے طریقے کے متعلق اس کے جاری کئے ہوئے احکام کا حوالہ دیتا ہے۔ لیکن میں خود ان احکام کا تحریروں میں پتہ نہ چلا سکا۔ یہ امر کہ کامیاب محصلین صلہ پاتے تھے، بادشاہ نامہ سے واضح ہے[۴۶] اور بادشاہ کی مالیات پر توجہ کو ہم اس کے عہد میں اضافۂ مالگزاری کے متعلق جو بیان اوپر آچکا ہے اس سے اخذ کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ امر کہ اس نے اگر واقعی میں کوئی عام احکام جاری کئے تھے تو وہ کیا تھے، غیر یقینی ہے۔

آبپاشی کے لئے بعض نہروں کی تعمیر بھی اس عہد کی ایک خصوصیت تھی۔ لیکن ان کارناموں کی آمدنی کے موضوع پر، سرگذشتیں خاموش ہیں اور اس مسئلہ پر کہ محصول آب وصول کیا جاتا تھا یا نہیں محض قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ غالباً نہروں کی وجہ سے مالگزاری میں ہونے والے اضافہ ہی کو کافی معاوضہ تصور کرتے تھے، کیونکہ سالانہ یا فصلی تشخیص کے بعد نفع تقریباً فوری ظاہر ہوتا تھا۔ مجھے کسی اور تبدیلی کے متعلق کوئی تحریر نہیں ملی اور جہاں تک سرگذشتوں کا تعلق ہے ہم اس عہدِ حکومت کو زرعی امن و امان

کا ایک زمانہ تصور کرسکتے ہیں۔ لیکن اورنگزیب کے ابتدائی برسوں میں برنیر کے درج کئے ہوئے ان مشاہدات سے صرف نظر کرنا ناممکن ہے کہ اس وقت کسانوں پر بار بہت زیادہ بڑھ چکا تھا، زراعت خراب ہورہی تھی اور یہ کہ مزروعہ زمین غیر مزروعہ ہورہی تھی۔ ان واقعات کی اہمیت اس وقت واضح ہوگی جب ہم ان حالات پر بحث کریں گے جو اورنگزیب کے احکام سے سامنے آئے۔

2۔ اورنگ زیب کے فرامین (1665-1669)

ہم عہد عالمگیری کے ابتدائی برسوں کے زرعی احوال کو تھوڑی بہت صحت کے ساتھ ان دو فرمانوں یا عام احکام سے جان سکتے ہیں جنھیں وزارت مال نے بادشاہ کی سند کے ساتھ جاری کیا تھا۔ ان میں سے پہلے حکم میں جو ۸ جلوس مطابق 1665-66ء میں نافذ کیا گیا تھا "کاشت میں اضافہ کسانوں کی بھلائی" کے حصول کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس کے دیباچہ میں اس وقت محفوظ علاقوں میں مروجہ تشخیص کے طریقوں کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے چند نقائص کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک عام حکم آتا ہے جس میں مستقبل کے طریقہ کو بتایا گیا ہے۔ پھر پندرہ تفصیلی دفعات جو بمنزلہ ایک دستورالعمل کے درج ہیں جن کے بنیادی طور پر مخاطب تو صوبجاتی دیوان اور اس کے ماتحت تھے لیکن ان میں جاگیرداروں کے ملازمین کے لئے بھی رہنمائی تھی۔ دوسرا حکم 1668-69ء میں اس مخصوص مقصد کے تحت جاری کیا گیا تھا کہ پوری مملکت میں مالگزاری کی تشخیص و وصولی اسلامی قانون کے تحت ہو۔ اس میں ان امور پر خاص طور پر بحث کی گئی ہے کہ منفرد کسانوں کے ساتھ کیونکر معاملہ اور کیا رویہ اختیار کیا جائے جو بہ اعتبار نتیجہ برطانوی عہد میں مال اور حق کاشت کے متعلق قانون سازی کا پیش خیمہ تھا۔

ان دونوں احکام کی موجود نقلوں میں افراد کو مخاطب کیا گیا ہے لیکن واضح مقصد یہ ہے کہ ان کا اطلاق عمومی ہو اور ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں اس کی ایک ایک نقل ہر صوبجاتی دیوان کے نام سے بھیجی گئی تھی۔ پہلا دستاویز، مملکت کے جملہ محفوظ اور جاگیری علاقوں میں تحقیقات کرنے کے بعد مرتب کیا گیا ہے جبکہ بعد والے کا اطلاق مخصوص طور پر "مملکت ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے تک کے" عمال مال پر ہے۔

یہ دونوں احکام مستعملہ مصطلحات میں بیّن فرق کے باعث ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پہلے کی زبان معتد بہ طور پر وہی ہے جو عہد اکبری کے سرکاری دستاویزات میں مستعمل تھی اور اس کے سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی، حالانکہ اس میں بعض محاورے غیر واضح ہیں۔ بعد کا حکم اسلامی فقہ

کی اصطلاحوں میں درج ہے اور بیّن طور پر مفتیوں کے ان فتووں یا فیصلوں کے موجود ذخیرہ سے تعلق رکھتا ہے جو انہوں نے بادشاہ کے دریافت کئے ہوئے مسائل پر صادر کئے۔ یہ فرمان یا تو ان فتووں پر یا انہیں مفہوم کے بعض سابق فتووں پر مبنی ہے اور ہم اسے اورنگزیب کی ان کوششوں کا ایک جز تصوّر کر سکتے ہیں جو اس نے اپنے انتظام حکومت کو اس مذہبی نظام کے مطابق جس کا وہ ایک انتہائی مخلص پیرو تھا چلانے کے سلسلے میں اختیار کیں۔

پہلے حکم کی خصوصیت وہ متعین اور مدلّل ترتیب ہے جو اکبر کے اپنے محصّلین کے لئے بنائے ہوئے قاعدوں کے عملاً مماثل ہے اور اس میں ہم اس دو عملی انتظام کو زیر عمل پاتے ہیں جس کے شروع کئے جانے کا پچھلے باب میں ذکر آیا تھا۔ محفوظ علاقوں کی آمدنی کو نائب مملکت نہیں بلکہ بادشاہ خرچ کرتا تھا اور اسے وزارت مال صوبجاتی دیوانوں کے معرفت وصول کرتی تھی۔ چنانچہ تحریروں میں ہمیں نائبین مملکت یا صوبیداروں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ ان میں جملہ حوالے دیوان کے ماتحت عملہ کے متعلق ہیں جو تین حصّوں پر مشتمل تھا: امین جس کا بنیادی کام تشخیص کرنا تھا، کروڑی جس سے متعلق خاص طور پر وصولی کا کام تھا اور خزانچی جو وصول کی ہوئی رقم کے نگران تھے۔ یہ ماتحتین حلقوں (چکلوں) میں تعینات رہا کرتے جو عہد اکبری کے اضلاع کے مماثل نہ تھے بلکہ غالباً کام کے لحاظ سے قائم کئے گئے تھے۔

پہلے حکم کا محرک اس مقامی عملہ کو زیادہ نگرانی میں رکھنے کی ضرورت تھی۔ مرکزی حکّام کو شکایت تھی کہ انہیں زرعی حالات کے متعلق تاریکی میں رکھا جاتا ہے اور وہ موصول ہونے والی رپورٹوں کی صحت کو جانچنے کا مقدور نہ رکھتے تھے۔ حکم کے دیباچہ سے ہم اس وقت جو حالات پیش آرہے تھے ان سے واقف ہو سکتے ہیں۔

ہر سال کے شروع میں مبالغہ کے ساتھ تشخیص کر دی جاتی تھی جس کی وصولی کے متعلق ناکامی کا امکان رہا کرتا۔ وصولی کی کمی کو کاغذات میں آفات کے سبب دی گئی گنجائشوں کے طور پر دکھلا دیتے تھے جن کے متعلق شبہ تھا کہ بر خوب جدّتیں ہیں۔ انتظامیہ کی حیثیت کو زیادہ مضبوط کرنے کی غرض سے اب ہر موضع کے لئے زیادہ تفصیلی سالانہ گوشوارے بھیجے جانے کی ہدایتیں جاری کی گئیں۔ لیکن اس موقع کو شعبہ کے دستور العمل کو ضابطہ کی شکل دینے کے لئے استعمال کیا گیا اور اس دستاویز کا یہی جز ہے جو اسے ایک تاریخی قدر و قیمت عطا کرتا ہے۔

جس ترتیب میں حکم کے موضوعات درج ہیں اس کی تقلید کرتے ہوئے ہم وزارت کی ترقی کی پالیسی سے اپنے بیان کو شروع کر سکتے ہیں۔ یہ پالیسی بالکل انہیں خطوط کے مطابق ہے جن سے

ہم مانوس ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے کاشت کی توسیع پھر اعلیٰ قسم کی فصلوں کے رقبہ میں اضافہ اور نئے آبپاشی کے لئے کنوؤں کی مرمت اور تعمیر آتی ہے۔ اس پالیسی پر عمل درآمد کرنے میں تعاون کرنے والے کسانوں کے ساتھ رعایت کا سلوک کرنے کی اور ان کے جانب سے امداد کے معقول مطالبوں کو پورا کئے جانے کا قاعدہ تھا۔ لیکن یہ تخیل کہ کاشت کا کام حکومت کے جانب سے ایک عائد کیا ہوا فرض ہے اب بھی غالب تھا اور اس فرض سے کوتاہی کے لئے کوڑے کی سزا کا واضح قاعدہ تھا' (ر۔ ۲۔ ھ۔ ۱۔۳)۔ اس قسم کے قاعدوں پر عمل لازمہً بہت حد تک مقامی حکام کی شخصیت پر منحصر رہا کرتا۔ چونکہ کاشت کی توسیع اور مالگزاری میں اضافہ' وزارت کا معروف نصب العین تھا' لہٰذا اس عملہ کے متعلق فیصلے بیشتر نتائج کے اعتبار سے ہوتے رہے ہوں گے اور کسانوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے کے لئے اس وقت کے انتظام عامہ کی خصوصیت تھی' واضح ترغیبات موجود تھیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت زیادہ تشدد حصول مقصد کے لئے مضر تھا' کیونکہ ایسا ہوتا ہے' جیسا کہ آگے آئے گا کسان اپنی زمین سے بھاگ جاتے تھے۔ لیکن ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مفتوحہ علاقوں کے کسان معمولاً سخت ضابطوں کے تحت رکھے جاتے تھے۔

اب مطالبہٴ مالگزاری کا معیار بمقابلہ اکبر کے عہد کے زیادہ اونچا ہو گیا تھا۔ پیداوار کے ایک تہائی کا اس کا معیار اب کم سے کم ہو گیا تھا۔ اس سے بڑھ کر جو زیادہ سے زیادہ آدھے تک ہو سکتا تھا طلب کر سکتے تھے (ھ' ۶' ۱۶) ان حدود کے اندر مقامی حکام کو بظاہر کچھ اختیار تمیزی دیا گیا تھا۔ لیکن اس امر کے پیش نظر کہ ان کا بنیادی فرض مالگزاری میں اضافہ کرنا تھا۔ ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ واقعی مطالبہ بجائے کم از کم کے زیادہ سے زیادہ تناسب کے قریب رہتا تھا۔ بہر حال عملاً بمقابلہ عہد اکبری کے اب تشخیص کا ریاضیاتی پہلو کم اہم ہو گیا تھا کیونکہ اس کے طریقے تبدیل کر دیئے گئے تھے۔

مرّوجہ طریقوں کو پہلے فرمان کے دیباچہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بعض مواضعات میں جہاں کسان نادار تھے' بٹائی رائج تھی جس کی شرحوں کو مقامی حالات کے مطابق کر دیا گیا تھا۔ " نصف' ایک تہائی' دو بٹہ پانچ یا کم و بیش "۔ لیکن نسق عام ضابطہ تھا۔ سال کے شروع میں تشخیص کنندہ (امین) کسی موضع یا بظاہر بعض وقت ایک پورے پرگنہ کے لئے مسلّم واجب الادا رقم' موجود معلومات کی بنیاد پر بشمول حالیہ تشخیصوں اور اس سال زیر کاشت لائی جانے والی زمین کے رقبہ کے' مقرر کر دیتا تھا موضع' امین کی تشخیص کو نامنظور کر سکتا تھا اور اس صورت میں' موضع سے مالگزاری' بظاہر مقامی حکام کی مرضی کے مطابق پیمائش یا غلہ بخشی کے حساب سے وصول کی جاتی تھی۔ لیکن اس وقت کے حالات کے

پیشِ نظر، ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ موضع کے جانب سے نامنظوری، مستثنیات میں رہی ہوگی۔

اس طور پر منفرد کسانوں پر مطالبہ کا تعین عام طور پر چودھریوں کے ذمہ چھوڑ دیا جاتا تھا اور ہم معمولاً دیکھتے ہیں کہ سرکاری نقطۂ نگاہ کے مطابق "مضبوط کے بارکا" رخ کمزور کے جانب رہا کرتا۔ لہٰذا صوبجاتی دیوان کو ہدایت تھی کہ وہ ہر اس موضع میں جہاں اسے جانے کا موقع ملے، مطالبہ کی تقسیم (تفریق) کو جانچنے اور چودھریوں اور محاسبین[15] کی اگر کوئی زیادتی ہو تو اسے درست کرے۔ دیوان کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ موضع کے محاسب (پٹواری) کے تیار کئے ہوئے کاغذات آمد خرچ کو جانچنے (ر۔11) اور سرکاری حسابات سے موازنہ کرنے کے بعد ہر فرد کے تصرف بیجا کی ہوئی رقم کو خواہ وہ سرکاری ملازم ہو یا کوئی چودھری یا محاسب، متعین کرے۔ ان آخر الذکر طبقوں کو صرف اپنی مسلّمہ دستوریوں کو لینے کا حق دیا گیا تھا اور اس سے زائد وہ جو کچھ بھی وصول کرے انہیں واپس کرنا پڑتا تھا۔

اس مقام پر محض ایک طرفہ اتفاق کے طور پر ہمیں سرکاری تحریروں میں گانوں کی اندرونی زندگی کی کچھ جھلکیاں نظر آجاتی ہیں جو ابتدائی برطانوی دور کے مندرجات سے بالکل مطابقت رکھتی ہیں۔ جہاں کہیں بھی نسق رائج تھا، وہاں پٹواری اور محاسب (پٹواری) یا ایک غالب گروہ[16] دوہری حیثیت کے مالک ہوا کرتے تھے۔ اس پہلو سے کہ وہ سرکاری عملہ سے تشخیص مطالبہ کے سلسلہ میں گفت و شنید کرتے اور یہ جو کچھ بھی کرتے وہ موضع کے حمایتی تھے۔ دوسری طرف اس طور پر کہ وہ نسبتاً چھوٹے اور بے اثر کسانوں سے زائد مالگزاری اور خرچ دیہہ کی مد میں فاضل رقم جو کم و بیش ہونے کی عام خصوصیت رکھتی تھی وصول کرتے تھے وہ ان پر اگر فی الواقع نہیں تو احتمالی ظلم کرنے والے تھے۔ سرکاری تحریریں قدرتی طور پر بعد والے پہلو کو نمایاں کرتی ہیں اور یہ پتہ چلانا کہ حقیقت کا کون سا پہلو زیادہ وزن رکھتا ہے ناممکن ہے۔

لیکن ہم بلا تردد یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مثل ان دنوں کے اس وقت بھی مواضعات ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہوا کرتے تھے

اب تشخیص سے وصولی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے، خزانچی کے نام ہدایت (ر۔ 8) سے واضح ہے کہ نقد ادائیگیاں کسانوں کا معمول تھا اور جنس میں وصول ہونے والی مالگزاری کے انتظام کے سلسلے میں کسی ضابطہ کے نہ پائے جانے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ کوئی عام طریقہ نہ تھا، گو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں جہاں روپیہ پیسہ کی معمولاً بہت کمی تھی[17] ایسا ہوا کرتا تھا۔ دیباچہ کی عبارت سے بھی نقد ادائیگی کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں قیمتوں کی ارزانی کو اسی قسم کی مصیبت بتایا گیا ہے جیسا کہ خشک سالی

ا پالا۔ بس کے نظام میں پورے سال کے لئے مطالبہ مقرر کر دیتے تھے برخلاف متبادل طریقوں کے جبکہ ہر فصل کے لئے مطالبہ مقرر کیا جاتا تھا اور اسے بظاہر ہر پرگنہ کے حالات کے لحاظ سے مقرر کی گئی تین قسطوں میں وصول کرتے تھے (ر۔ ۴)۔

چنانچہ معمولی فصلوں کی صورت میں موضع کی صورت حال واضح رہا کرتی۔ سال کے شروع میں مطالبہ کو بالمقطع تشخیص کرنے کے بعد اسے چودھری کسانوں پر تقسیم کر دیتا تھا۔ کسان فصل کے پکنے پر چودھریوں کو ادا کر دیتے تھے اور چودھری محصّل کے مطالبات کو پورا کر دیتا تھا۔ لیکن خشک سالی، پالا، قیمتوں کی کمی یا کسی دیگر آفت کے پیش آجانے پر ان انتظامات میں خلل واقع ہو سکتا تھا کیونکہ نسق پر جس میں مطالبہ تقریباً پیداوار کا نصف ہوا کرتا وہی اعتراض کیا جا سکتا تھا جو پیمائش کے طریقے پر تھا یعنی یہ کہ پیداوار میں ایک اوسط درجہ کا خسارہ بھی تشخیص کی وصولی کو ناممکن بنا دیتا تھا۔ ایسی صورت میں عمّال مال کو (ر۔ ۹) محنت اور خبرداری سے کام لیتے ہوئے تشخیص پر صحیح پیداوار کے مطابق نظر ثانی کرنی چاہیے اور اس امر کی خصوصی فکر کرنی چاہیے کہ مطالبہ کی کسانوں کے درمیان تقسیم کا کام، چودھریوں، محاسبین یا غالب جماعت کے ہاتھوں میں نہ رہے۔ دوسرے فرمان میں اس تفصیل کا اضافہ ملتا ہے (ھ۔ ۹) کہ نصف پیداوار کسان کے لئے چھوڑ دینی چاہیئے اور اس میں فصل کے کاٹے جانے کے قبل اور اس کے بعد کی آفات کے درمیان امتیاز قائم کیا گیا ہے (ھ۔ ۱۱) پہلی صورت میں چھوٹ دی جانی چاہیئے اور دوسری میں نہیں۔ یہ ایک ایسا قاعدہ تھا جو انیسویں صدی کی انتظامی روایات میں برقرار رہا۔

انتظامیہ کے لئے یہ دیکھنا ضروری تھا کہ کسانوں سے وصولیاں جائز مطالبوں تک محدود رہیں اور تین طرح کی ممنوع وصولیوں کی صراحت آئی ہے (ر۔ ۱۵)۔ پہلی قسم میں وہ محصول آتے ہیں جنھیں خود بادشاہ نے منع کیا تھا اور وہ اس معاملہ میں فیروز تغلق اور اکبر کے عام طریقوں کی تقلید کرتا تھا۔ دوسری "مالگزاری سے زائد وصولیاں" ہیں جن کی تعبیر ہم سرکاری عمّال کی دستوری رقموں سے کر سکتے ہیں۔ تیسری کو لفظ 'بلیہ' سے ظاہر کیا گیا ہے جس کا عام استعمالی مفہوم "بدقسمتی" یا ظلم ہو سکتا ہے۔ یہاں غالباً یہ لفظ ظلم کی ایک مخصوص شکل کو ظاہر کرتا ہے جو اس وقت عام تھا۔ لیکن مجھے اس کی تعبیر میں معاون کوئی وضاحتی عبارتیں نہ مل سکیں۔ اس قدر واضح ہے کہ جبری وصولیوں کی مختلف شکلیں رائج تھیں اور یہ کہ انہیں قطعاً ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ لیکن یہ ممانعت کس حد تک موثر تھی، اس پر محض قیاس آرائی کیجا سکتی ہے۔

جن احکام کی اوپر تلخیص کی گئی ہے ان کا اطلاق بنیادی طور پر محض محفوظا علاقوں پر تھا جو مملکت کا ایک مختصر جز تھے۔ لیکن ان کے ضابطوں کا مقصد جاگیروں میں کم از کم دستور العمل کا ایک معیار قائم کرنا تھا' کیونکہ جاگیرداروں کے ملازمین کو ان کے مطابق عمل کرنے کی تاکید کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ یہاں پھر اس سلسلہ میں کہ یہ احکام کس حد تک موثر تھے محض قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔ اورنگ زیب کا مقامی انتظامیہ اہل نہ تھا۔ چنانچہ بمقابلہ اکبر کے زمانہ کے جاگیرداران اس کے تحت غالباً زیادہ آزاد تھے۔ لیکن ایک عجیب وغریب دفعہ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ صوبجاتی دیوان حقیقتاً جاگیرداروں کے مقامی عملہ پر اثر انداز ہونے کی مقدرت رکھتا تھا۔ اس کے لئے جاگیرداروں کے تشخیص کنندگان اور محصلین کی وفاداری اور اہلیت کے متعلق رپورٹیں بھیجنا ضروری تھا (ر - 12)۔ اور اس بات کا قرار کیا گیا تھا کہ ناموافق رپورٹ کی صورت میں سزا دی جائے گی۔ یہ سمجھنا آسان نہیں کہ وزارت مال کیونکر کسی جاگیردار کے رکھے ہوئے ماتحتوں کو سزا دلانے کا اطمینان کر سکتی تھی۔ لیکن قرار اپنی جگہ موجود ہے اور ہم ایسا سوچ سکتے ہیں کہ اسے کسی نہ کسی طور پر موثر بناتے رہے ہوں گے۔

3۔ اسلامی تخیلات کا اطلاق

پچھلی فصل میں' عہد عالمگیری کے ابتدائی دور کے عام حالات کو اس کی سند سے جاری کئے گئے دونوں موجودہ فرمانوں کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔ اب ان میں سے بعد کے حکم کے ان ضابطوں پر بحث رہ جاتی ہے جو مخصوص طور پر اسلامی قانون سے متعلق ہیں اور اس سلسلہ میں ان مفتیوں کی حیثیت کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ جن کے فتووں پر یہ حکم بظاہر مبنی ہے۔ یہ فرض کرنے کے لئے کوئی سبب نہیں کہ مفتیوں کا وزارت مال کے واقعی طریق عمل سے کوئی رابطہ قائم تھا۔ ان کے ماخذ' شیر شاہ یا اکبر کے جاری کئے ہوئے ضابطے یا احکام کے بجائے وہ فقہ کی کتابیں اور ان کی شرحیں تھیں جن میں سے بیشتر ایشیا کے دوسرے ممالک یعنی عرب' شام یا عراق میں لکھی گئی تھیں۔ موجود فتووں میں ان ماخذ کے حوالے آتے ہیں اور ان میں ابوحنیفہ' محیط یا ابویوسف کے ایسے نام پاتے ہیں۔ یہ وہ اشخاص تھے جو بہت پہلے ہی ہندوستان سے بالکل مختلف ملکوں میں اس کام کا تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ اس فرمان کا مسودہ مرتب کرنے والے حکام فتووں کی پوری پوری تقلید کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ لازماً یہ ہوا کہ ہندوستانی نظام میں ایسی اصطلاحیں'

تخیلات اور ادارے داخل ہو گئے جنھیں ہم آسانی کے ساتھ ہندوستانی زندگی کے حقائق سے ہم آہنگ نہیں کہہ سکتے ۔

بیرونی اصطلاحات کی ایک مثال کے طور پر ہمارے سامنے کسان کا 'مالک' کے نام سے پکارا جانا ہے ۔ یہ لفظ شروع میں بادشاہ کا مفہوم رکھتا تھا لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ اس کے معنی 'ملکیت والا' ہو گیا ۔ ایک گمنام شارح جس کے اقوال پروفیسر سرکار کے کئے ہوئے فرمان کے ترجمہ میں شامل ہیں بظاہر اس نامانوس اصطلاح سے حیرانی میں پڑ گیا تھا کیونکہ اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس لفظ کے معنی مالک فصل ہونا چاہیئے جس سے یہ مطلب نکلتا ہے زمین کا کوئی مالک نہ ہو سکتا تھا ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ 'مالک' بلاشک دوسرے اسلامی ممالک میں موزوں طور پر استعمال ہونے والا ایک لفظ تھا جسے وہاں سے ہندوستان میں لائے تھے ۔ مگر یہاں کے مقامی حالات سے ہم آہنگ نہ تھا ۔ اسی طور پر فرمان کے بعض اجزا کے صحیح معنی کو زمین کا کسی ایک معین فصل کے ساتھ مستقلاً مخصوص ہونے کا تصوّر مسخ کر دیتا ہے ۔ ہمیں کھجوروں اور باداموں کے پر کاشت زمین کے تفصیلی ضابطے بتائے جاتے ہیں جو ہندوستان کے لئے تقریباً بے محل ہیں، مگر ان میں ہندوستان کی مخصوص فصلیں مثلاً گنّے کے سلسلے میں پیش آنے والی دقتوں کے بارہ میں کچھ نہیں کہا جاتا ۔ اسی طور پر عشری اور خراجی زمینوں کے فرق پر فرمان میں زور دیا گیا ہے جن کے متعلق پہلے باب میں گزر چکا ہے کہ یہ اسلامی نظام میں اصل کا درجہ رکھتی تھیں ۔ لیکن میں ابھی تک ہندوستان میں عشری زمین کی موجودگی کا پتہ چلانے میں ناکام رہا ہوں اور اگر اس قسم کی کوئی زمین پائی بھی جاتی تھی تو وہ بہ اعتبار وسعت یقیناً غیر اہم تھی ۔ لہذا ہمیں یہ تصوّر کرنا چاہیئے کہ یہ حکم مسلمانوں کے مالکانہ حقوق کو تسلیم کرتے تھے یا اس سے کسی اہم کھجور پیدا کرنے والی صنعت کا پتہ چلتا ہے یا یہ کہ اس سے لازمۂ عشری زمین کے رواج کی موجودگی کا مفہوم نکلتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں ذرا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا فرمان میں مندرج ضابطوں کی ضرورت تھی یا یہ محض ایسی فاضل باتیں تھیں جو ان حالات میں جن میں اس کا مسوّدہ تیار کیا گیا تھا لکھدی گئیں ۔

ان سوالات میں سے واحد سوال جس پر بحث کی ضرورت ہے وہ اس فرق سے متعلق ہے جو پورے حکم حق آراضی کی ان دو شکلوں یعنی 'مقاسمہ' اور 'موظف' کے درمیان برقرار رکھا گیا ہے ۔ ان الفاظ کی تعریف خود حکم میں نہیں ملتی لیکن ان کے درمیانی فرق کو فتوے میں واضح کیا گیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اوّل الذکر کے تحت زمین پر مالگزاری صرف اس وقت ادا کی جاتی تھی جب اس

پر کاشت ہو جبکہ آخر الذکر کے تحت مالگزاری بہر حال ادا کی جاتی تھی اس پر خواہ کاشت ہو یا نہ ہو۔ یہی امتیاز حکم (ھ - ہ) میں ملتا ہے اور اس کے شرائط ظاہر کرتے ہیں کہ موظف اس زمین کی ایک شکل تھی جسے میں نے ٹھیکہ کی آراضی کہا ہے اور جس کے تحت زمین پر قبضہ کے لئے فصل یا پیداوار کا لحاظ کئے بغیر ایک معینہ رقم ادا کی جاتی ہے جبکہ 'مقاسمہ' کی اصطلاح اس قدر کافی وسیع ہے کہ اس کے دائرہ میں نسق اور ضبط دونوں آجاتی ہیں اور اس کا اطلاق ہمیشہ ان صورتوں پر ہوتا ہے جنمیں مطالبۂ مالگزاری کی مقدار کا انحصار فصل کی پیداوار پر ہو۔ اب اس حکم کی تاریخ تک مجھے کوئی قطعی شہادت اس امر کی نہ مل سکی کہ مسلم ہندوستان میں ٹھیکہ کی زمین بحیثیت ملکیت ملک کے ایک حق کے پائی جاتی تھی اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس کے حوالے محض بعد فاصلات ہیں یا یہ کہ یہ حقیقتاً ہندوستان کے حالات کے تحت ضروری تھے۔

اس سوال پر دو قابلِ لحاظ امور سامنے آتے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ ٹھیکہ کی آراضیات برطانوی عہد کے آغاز پر بعض خطوں میں بالکل عام تھیں۔ ایسی صورت میں یہ یا تو اورنگزیب کے زمانہ ہی میں موجود تھیں یا پھر یہ اٹھارہویں صدی کے دوران وجود میں آئیں۔ آخر الذکر صورت غیر امکانی ہے، کیونکہ یہ ایک ایسا بدنظمی کا زمانہ تھا جس میں لوگ تنگی ترشی میں بسر کرتے تھے اور اپنے کو پہلے سے پابند کرنے پر تیار نہ تھے۔ کسانوں کا پانچ برس کے ایسی قلیل مدت کے لئے بھی ادائے مالگزاری کا پابند ہونے سے منکر ہونا ابتدائی برطانوی تحریروں میں مندرج اہم ترین واقعات میں سے ہے، کیونکہ رائے عامہ مستقبل میں پوری آزادی کو محفوظ رکھتے ہوئے سالانہ تشخیص کی موافقت میں تھی اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے ماحول میں آراضیات ٹھیکہ کا نظام کیونکر وجود میں آسکتا تھا۔ لہٰذا امکان یہی ہے کہ یہ نظام زیادہ عرصہ کا رہا ہوگا۔

پہلے باب میں مندرج اودھ پور کی لگان داریوں کے بیان سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے اُس خطہ میں جو مسلم نظامِ حکومت کے تحت کبھی نہ آیا، آراضیات ٹھیکہ کی موجودگی بعض موجود دستاویزات کے ذریعہ جن میں سے بعض چار صدی تک کے پرانے ہیں ثابت ہوتی ہے اور یہ نتیجہ تقریباً یقینی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد جدید کے نہیں بلکہ ہندو عہد کے ادارے ہیں۔ یہ امر کہ مسلم ہندوستان کی ابتدائی تحریروں میں ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا، ان کی غیر موجودگی کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ ہم اس سے یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ مسلم منتظمین کو اس میں مداخلت کرنے کا کوئی موقع حاصل نہ ہوا۔ چنانچہ کسی براہِ راست شہادت کی غیر موجودگی میں، ہم یہ قیاس کرسکتے ہیں کہ آراضیات

ٹھیکہ بطور ایک عمومی ادارہ کے نہیں بلکہ مخصوص علاقوں میں یا موزوں حالات کے اندر حقیقتاً مسلم حکومت کے دہلی میں شروع ہونے کے وقت ہی سے قائم رہی ہوں۔ چنانچہ یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کے متعلق اورنگزیب کے احکام اس ضرورت کے تحت تھے کہ دیوان وقتاً فوقتاً جو دقتیں پیش آئیں انہیں حل کر سکیں۔ مثبت شہادتیں بھی اس متبادل نظریہ کو کہ زیر بحث شرائط ایک ایسی فاضل چیز ہے جسے رسمی طور پر ایک غیر ملکی نظام قانون سے درآمد کیا گیا تھا، غلط نہیں ثابت کرتیں۔ ہماری معلومات کی موجودہ حالت میں یہ ایک قیاسی مسئلہ رہ جاتا ہے۔

احکام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتظامیہ کسی آراضی پر قبضہ اور اس کی منتقلی کے بعض حقوق کو تسلیم کرتا تھا۔ ٹھیکہ دار آراضی کی زمین معمولاً اس کے وارث کو ملتی تھی (ھ۔ ۱۱) اور وہ اپنی آراضی کے حقوق کو بذریعہ پٹہ، رہن یا بیع منتقل کر سکتا تھا (ھ۔ ۱۱، ۱۲)۔ عام کسان کے لئے بھی وراثت کو کنایۃً تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ وارث کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اس کی آراضی کے منتقل کرنے کا قاعدہ ملتا ہے (ھ۔ ۱۷) اور ان کے لئے بیع و رہن کے اختیار کو بھی کنایۃً تسلیم کیا جاتا ہے (ھ۔ ۱۶)۔ یہ شرائط نظام میں کسی بنیادی تبدیلی کی مظہر نہیں ہیں کیونکہ جیسا کہ پہلے باب میں گزر چکا ہے کہ وراثت اور انتقال کے حقوق ہندوؤں کے مقدس قانون کے تحت تسلیم کئے جاتے ہیں۔

یہ ایک قابل توجہ امر ہے کہ ارتھ شاستر کے مثل، یہاں کسی نااہل یا نادہند کسان کی بے دخلی کا کوئی واضح قاعدہ نہیں ملتا۔ کسی ایسے قاعدہ کی غیر موجودگی دونوں فرمانوں میں مشترک ہے کیونکہ ان میں سے پہلے میں مکمل اور پابندیٔ وقت کے ساتھ وصولی پر تو زور دیا گیا ہے (ر۔ ۴، ۵) لیکن نادہندوں کے خلاف کارروائی کرنے کے سلسلہ میں خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ یہ کسی طور پر تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ایک انتظامیہ جو زیادہ سے زیادہ مالگزاری وصول کرنے کی فکر میں ہو اسے متردانہ نادہندی کے پیش آنے کی صورت میں بلا کسی اختیار کے چھوڑ دیا گیا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ صحیح تعبیر اس طور پر ہوگی کہ انتظامیہ کو ضروری اختیارات از خود حاصل رہے ہوں گے لیکن اس عہد میں کسانوں کی قلت کے باعث ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ ہم اس موضوع پر دوبارہ رجوع کریں گے۔

اسی طور پر اکبر کے جاری کئے ہوئے احکام کے مثل، اورنگزیب کے احکام میں بھی نادہندی کی صورت میں کسان کے کنبہ کے افراد کی فروختگی کے لئے کوئی گنجائش نہ رکھی گئی ہے۔ لیکن ہمیں متعدد ماخذ سے اطلاع ملتی ہے کہ مقامی حکام حقیقتاً اس عمل کو اختیار کر سکتے تھے۔ چنانچہ جیسا کہ پچھلے باب میں گزر چکا ہے بدایونی کی تحریر ہے کہ عہد اکبری میں کسانوں کی بیوی اور بچے بیچے اور

ادھر ادھر منتشر کر دیئے گئے تھے" پلسارٹ اگلے عہد میں لکھتے ہوئے ناد ہندوں کی بیوی بچوں کے "مالِ غنیمت" بنائے اور بیچے جانے کی خبر دیتا ہے۔ برنیر کا قول ہے کہ ناد ہند" اپنے بچوں سے محروم کر دیئے جاتے ہیں، جنھیں غلام بنا کر بھگا لیا جاتا ہے" مینریق نے مغلیہ حکومت کے تحت بنگال کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ" جب بدبختوں کے پاس اس (پیشگی مطالبہ مالگزاری) کو ادا کرنے کے وسائل نہیں رہتے، تو وہ لوگ ان کی بیویوں اور بچوں کو پکڑ کر انہیں غلام بنا لیتے اور بذریعہ نیلام فروخت کر دیتے" ۔ پس ہمیں ان احکام کو ایک ایسا مکمل دستور العمل تصور نہ کرنا چاہیئے جس میں ہر ممکنہ ناگہانی صورتِ حال کے لئے ضابطہ موجود ہو۔ معقول تصور یہ ہوگا کہ وہ صرف ان معاملات پر بحث کرتے ہیں جن کے متعلق فیصلہ ضروری تصور کیا گیا، اور یہ کہ ناد ہندوں کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا۔

فرمان میں ایک دلچسپ ضابطہ وہ ہے جو ایسے ٹھیکہ داروں کے مالبقی حق سے تعلق رکھتا ہے جو کاشت کرنے کے اہل نہ ہوں یا جو بھاگ گئے ہوں (ص۔ 3) اس کا حق آراضی برقرار رہتا اور وہ جب اس کا اہل ہو جاتا تو اسے دوبارہ حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی غیر موجودگی یا نا اہلی کے ایام میں، حکام کو اسے اجارہ پر اٹھانے کا اختیار رہا کرتا اور اس طور پر حاصل کی گئی آمدنی زر ٹھیکہ سے زائد ہوتی تو فاضل رقم اصل ٹھیکہ دار آراضی کو واجب الادا ہوتی۔ یہ مالکانہ یا غیر بندوبستی قابلِ زمین کے لئے گنجائش کا مفہوم رکھنے والا پہلا اشارہ ہے جو مجھے مل سکا۔ انیسویں صدی میں بعض اوقات مالکانہ حقوق اہم موضوعِ بحث رہا ہے۔

اگر اس عہد میں آراضیات ٹھیکہ پہلے ہی سے موجود تھیں تو احکام زیرِ بحث نے ہندوستان کے زرعی نظام میں کسی اہم بات کا اضافہ نہ کیا۔ قاعدے جو واضح طور پر فتووں سے ماخوذ ہیں تفصیلات پر بحث کرتے ہیں: انتقالناموں کی صورت میں مالگزاری کی ذمہ داری کی تقسیم (ص۔ 12۔ 13)، انگور کی بیلوں اور بادام کے پیڑوں پر عاید کی جانے والی مالگزاری (ص۔ 14) مسلمانوں پر عشر کے بجائے مالگزاری ادا کرنے کی ذمہ داری (ص۔ 14) مقبروں پر وقف زمین کا تشخیص مالگزاری سے استثنا (ص۔ 15)۔ اس نوعیت کے قاعدوں کو اس ہندوستانی نظام میں جس نے سابقہ مسلم فرمانرواؤں کے تحت نشو ونما پایا تھا بلغیر زیادہ تبدیل کئے ہوئے نافذ کیا جا سکتا تھا اور یہ بلاشک ایک ایسے انتظامیہ کے لئے جسے ایسے معاملات سے اپنے معمول کے فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں نپٹنا پڑتا تھا مفید تھے۔ بہر حال زرعی نظام کے عمومی خاکہ میں کوئی تبدیلی واقعہ نہ ہوئی۔ یہ مفروضہ اس وقت صحیح ہوگا جب ہم اس نظریہ کو قبول کر لیں کہ اس عہد میں اب بار اول آراضیات ٹھیکہ کو تسلیم

کیا گیا تھا۔ لیکن یہ نظریہ مجھے غیر امکانی معلوم ہوتا ہے۔

4۔ کسانوں کی قلت

احکام عالمگیری کے ایک پہلو پر ابھی بحث باقی رہ جاتی ہے۔ وہ ان کاکسانوں کے رکھنے اور انہیں حاصل کرنے کی ضرورت کی اہمیت کو واضح کرنا ہے۔ پچھلے ابواب میں آچکا ہے کہ تیرہویں صدی اور اس کے بعد سے توسیع کاشت، زرعی ترقی کی سرکاری پالیسی کا اہم ترین جز ہوگئی تھی۔ لیکن پہلے کے اعلانات سے کسانوں کی تعداد کے بجائے آراضیات کی جسامت میں اضافہ کی نشاندہی ہوتی ہے، مثلاً غیاث الدین تغلق اس بات کا خواہشمند تھا کہ کسان اپنی آراضیات کی ہر سال توسیع کرتے رہیں اور محصلین کے لئے اکبر کے قاعدوں سے بھی اسی عمل کا مفہوم نکلتا ہے، جبکہ مفرور کسانوں کے موضوع سے یہ خالی ہیں۔ لیکن اورنگزیب کے زمانہ تک فراری' انتظامیہ کے لئے ایک سنگین مسئلہ بن چکا تھا۔ ہر سالانہ تشخیص کے موقع پر اس کی جانچ اور مفروروں کی واپسی اور ہر سمت سے کسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے پر پوری کوشش صرف کرنے کو ضروری قرار دیا گیا (ر۔ ۲)۔ دوسری طرف مفروروں کی آراضیات کے متعلق تفصیلی قاعدوں (ھ۔ ۶) سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان کے متعلق فیصلہ طلب معاملات بہت زیادہ تھے۔ تنہا ان احکام کی بنیاد پر ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ اس عہد میں کاشتکاری کے پھیلاؤ میں امر مانع مادی وسائل کی نہیں بلکہ آدمیوں کی کمی تھی اور ہمارے لئے کسانوں کی تعداد میں کمی واقع ہونے کے اسباب کو تلاش کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

یہ سوچنے کے لئے ہمارے پاس کوئی بنیاد نہیں کہ اس وقت شمالی ہندوستان کی آبادی زیادہ کم ہو رہی تھی۔ جو واقعات تحریروں میں درج ہیں ان کا ایک عمومی جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگ، قحط اور بیماریوں کے باعث بار بار پیش آنے والی رکاوٹوں کے علاوہ پورے ملک میں اس عہد کے دوران تیزی سے اضافہ کا رجحان ملتا ہے۔ سترھویں صدی کے نصف اوّل کے دوران شمالی ہندوستان میں نسبتاً امن و امان رہا۔ بلاشک کبھی کبھی بغاوتیں اور خانہ جنگیاں پیش آتی رہیں لیکن ان سانحات میں جانوں کا اتلاف غیر معمولی طور پر زیادہ نہ رہا۔ غالباً اس عہد کی ابتدائی مدت میں دکن کی فتح کے باعث آدمیوں کی ایک معقول تعداد کم ہوئی۔ لیکن تقریباً ۱۶۳۰ء کے بعد کوئی بڑی جنگ پیش نہ آئی، جبکہ مرہٹوں کی شورش نے اورنگزیب کے مالی احکام اجرا کے وقت تک کوئی اہمیت اختیار نہ کی تھی۔ پس فی الجملہ اس عہد کی سیاسی اور فوجی تاریخ سے آبادی کے قدرتی اضافہ میں کسی سنگین

رکاوٹ کے پیش آنے کی نشاندہی نہیں ہوتی۔

قحط کے متعلق تحریریں بلاشک نامکمل ہیں۔ لیکن جو ہیں، ان سے صدی کے نصف اوّل کے دوران شمالی ہندوستان میں کسی شدید قحط سالی کا پتہ نہیں چلتا۔ 1596ء میں بلاشک جانوں کا بہت زیادہ اتلاف ہوا تھا لیکن اس کے اثرات 1600ء تک زائل ہو چکے رہے ہوں گے۔ پنجاب میں 15-1614ء میں اور پھر 1642ء میں اور اودھ میں 1650ء میں قحط کے آثار ظاہر ہوئے تھے لیکن جانوں کے شدید نقصان کے متعلق مجھے کوئی تحریر نہیں ملتی، جبکہ 1630ء میں جو شدید مصیبت گجرات اور دکن میں پیش آئی اس کے اثرات شمال تک نہ پہونچ سکے۔ راجپوتانہ میں 1648ء میں شدید اور سندھ میں 1658ء میں معمولی نقصانات ہوئے لیکن دونوں صورتوں میں نقصانات مقامی تھے۔ 1660ء کا قحط جنوب میں شدید اور دور تک پھیلا ہوا تھا لیکن شمال میں اس کے اثرات کا واحد اندراج اگلی صدی کی ایک سرگذشت کا یہ بیان ہے کہ "ہر حصہ سے لوگوں کی بھیڑ دارالسلطنت پہونچی"۔ اگر اس عبارت میں مندرجہ لفظ "دارالسلطنت" کا مفہوم دہلی سے ہے جیسا کہ ممکن ہے گو اس کا یقین نہیں تو ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس کا اثر شمال تک تھا یا یہ کہ لوگ متاثرہ علاقوں سے غذا کی تلاش میں شمال تک پہونچے۔ 1660ء اور 1670ء کی درمیانی مدت میں ہمیں شمال کے متعلق تو نہیں مگر جنوب میں اور گجرات میں دوبارہ قحط کی اطلاع ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بالکل یقینی امر ہے کہ 1630ء کے بعد آخر الذکر خطہ میں آبادی ضرور کم ہوئی ہوگی۔ لیکن تحریری شہادتوں سے ایسا سوچنے کے لئے کوئی جواز نہیں ملتا کہ پنجاب سے لے کر بنگال تک کے علاقے کی آبادی میں کوئی بہت زیادہ عمومی کمی واقع ہوئی۔

وبائی امراض کے متعلق قحط سے بھی کم شہادتیں ملتی ہیں اور اس سلسلہ میں یہ واحد اطلاع ملتی ہے کہ صدی کے نصف اوّل کے دوران شمالی ہندوستان میں گلٹی دار طاعون موجود تھا جہانگیر بادشاہ کی اطلاع کے مطابق پنجاب سے دہلی تک ایک ہولناک وبا پھیلی تھی جس سے بہت سے لوگ موت کا شکار ہوئے لیکن یہ 1616ء تک بالکل فرو ہو گئی۔ اس کے علامات بیان نہیں کئے گئے ہیں، لیکن مستعمل الفاظ طاعون کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یا تو بیماری کے فرد ہونے کے متعلق بیان قبل از وقت تھا یا پھر اس بیماری کے از سر نو جراثیم پیدا ہوئے تھے کیونکہ 1618ء، 1622ء اور 1644ء میں شہر آگرہ میں اور 1656ء میں دہلی میں طاعون موجود تھا، جبکہ 1689ء سے کئی برس قبل اس کی دکن اور گجرات میں شدت تھی۔ ان حالات میں یہ امکان پایا جاتا ہے کہ شمالی ہندوستان کی آبادی احکامِ عالمگیری کے اجرا کے وقت طاعون کی طویل المیعاد وبا سے متاثر ہو چکی رہی ہو۔ لیکن اس نظریہ کی تائید میں مجھے کسی براہِ راست شہادت کا علم نہیں۔ دوسری طرف، اس امر کی قطعی اور ناقابل

وثوق سند ملتی ہے کہ کسانوں کی قلت کا سبب موت نہیں بلکہ ان کی فراری تھی۔

یہ شہادت، فرانکوئیس برنیر کے ممتاز فرانسیسی مدبر کولبرٹ کے نام تقریباً ۱۹۷۰ء لکھے ہوئے مملکتِ مغلیہ کے جائزہ میں[۴۲] ملتی ہے۔ برنیر اس کام کے لئے بخوبی اہل تھا۔ وہ خود کسان خاندان کا ایک فرد تھا لہذا وہ ہندوستان کے زرعی حالات کو جیسا اس نے پایا سمجھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے مونٹ پیلیر یونیورسٹی سے طب کی ڈگری حاصل کی تھی اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا اور اورنگزیب کی تخت نشینی کے قریبی ایام میں ہندوستان پہونچنے کے قبل ایشیا اور نیز یورپ میں دور دور تک سیاحی کر چکا تھا۔ وہ بحیثیت ایک پیشہ ور معالج کے شاہی دربار سے آٹھ برسوں تک وابستہ رہا تھا۔ علاوہ بریں اس کے بعض اعلیٰ عہدہ داروں سے اچھے تعلقات تھے اور اسے اس طور پر ایک عام سیاح کے مقابلہ میں معلومات حاصل کرنے کے بہت زیادہ مواقع حاصل تھے۔ یہ امر کہ اس نے ان مواقع کا مناسب استعمال کیا متعدد موضوعات پر اس کے اقوال سے واضح ہوتا ہے، مثلاً سونے و چاندی کی رسد جس کی تصدیق ہم اس عہد کی ولندیزی اور انگریزی تجارتی تحریروں سے کر سکتے ہیں۔ چنانچہ موضوع متعلقہ یعنی کسانوں کی قلت اور بھاگنے پر ان کی آمادگی کے متعلق اس کی شہادت کو مسترد کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی بنیاد نہیں۔

کسانوں کی قلت نے واضح طور پر اس کے ذہن کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا اور یہ ایک قابلِ توجہ امر ہے کہ وہ اس کے کسی جز کو موت کی غیر معمولی تعداد سے منسوب نہیں کرتا۔ اگر پورے ملک میں طاعون کی شدت رہی ہوتی تو بحیثیت ایک پیشہ ور معالج کے وہ اس حقیقت کو مشکل ہی سے نظر انداز کر سکتا تھا۔ لیکن وہ قطعی طور پر اس خرابی کو کسی ایسے سبب سے نہیں بلکہ انتظامیہ کی سختی سے منسوب کرتا ہے جس نے کسانوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے قول کے مطابق مملکت کے بیشتر حصہ کی

"کاشتکاری خراب اور آبادی کم تھی۔ اچھی زمین تک کا ایک معتد بہ حصہ محنتیوں[۴۳] کی کمی کے باعث جن میں سے بہت سے صوبیدار کے خراب سلوک کے باعث مر جاتے ہیں، غیر مزروعہ رہ جاتا ہے۔ یہ بیچارے جب اپنے لٹیرے مالکوں کے مطالبات کو پورا کرنے سے معذور رہتے تو انہیں صرف ذریعہ معاش ہی سے نہیں بلکہ ان کے بچوں سے بھی محروم کر دیتے اور ان کے بچوں کو غلام بنا کر بھگا لیجاتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے کسان ایسے قابلِ نفرت ظلم سے عاجز آکر اس علاقہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور شہروں یا چھاونیوں میں حمالوں، سقوں، سائیسوں کی حیثیت سے

ایک زیادہ قابلِ برداشت ذریعہ معاش تلاش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کسی راجہ کے علاقوں میں بھاگ کر چلے جاتے' کیونکہ انہیں وہاں ظلم کم اور آرام نسبتاً زیادہ ملتا ہے"۔

چنانچہ برنیر کے قول کے مطابق کسان انتظامیہ کی سختی سے دوسرے پیشے اختیار کرنے یا دوسرے ایسے علاقوں میں بھاگ کر چلے جانے پر جو مغلوں کے تسلط سے باہر تھے مجبور ہو رہے تھے اور اس کا بیان جو بجائے خود قابلِ یقین ہے، احکام عالمگیری میں بیان کی ہوئی صورتِ حال سے بالکل مطابقت رکھتا ہے یعنی یہ کہ کسانوں پر تشخیص کا بار زیادہ تھا اور یہ سخت ضابطوں کے تحت رکھے جاتے تھے اور ان کی تعداد اس حد تک گھٹ رہی تھی جو انتظامیہ کے لئے شدید پریشان کن ہو گئی تھی۔ صدی کے نصف اول میں پیش آنے والے انتظامی دباؤ میں اضافہ کو جہانگیر یا شاہجہاں یا ان دونوں بادشاہوں سے منسوب کیا جانا چاہیے۔ کسی پچھلی فصل میں ملخص کئے گئے روایتی بیان کی رو سے ہمیں اگر جملہ اضافہ کے لئے نہیں تو اس کے بیشتر حصہ کے لئے شاہجہاں کے عہدِ حکومت کو ذمہ دار قرار دینا چاہیے کیونکہ اس عہد میں محفوظ علاقوں کی آمدنی ۱۵۰ سے بڑھ کر تقریباً 400 لاکھ پر پہونچ گئی تھی۔

لیکن کسی مختتم فیصلہ کے لئے ہمیں اس سے زیادہ قطعی شہادت کی ضرورت ہوگی۔ صرف اس قدر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عہدِ عالمگیری کے ابتدائی برسوں تک کسانوں پر انتظامی دباؤ اس حد تک بڑھ چکا تھا جو محفوظ علاقوں تک میں اصل مقصد کو فوت کرنے والا تھا اور ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ جاگیروں میں اس کے مضر اثرات اس سے بھی زیادہ رہے ہونگے کیونکہ ان پر قبضہ کی میعاد مختصر اور غیر یقینی ہوا کرتی تھی۔ احکام عالمگیری میں مندرج ہدایات کی بنیاد پر ضرورت کے مطابق اہلیت، موقع شناسی اور ایمانداری کے اوصاف سے متصف کسی موبجاتی دیوان کے لئے اپنے زیرِ انتظام علاقہ کی مالگزاری میں بتدریج اضافہ کرنا ممکن ہو سکتا تھا۔ کسی عام جاگیردار کے لئے اس قسم کی کوشش کرنا' اس امر کے پیشِ نظر کہ قبل اس کے کہ اس کی مساعی کے نتائج ظاہر ہوں' وہ اپنی جاگیر سے بیدخل کیا جا سکتا تھا کھلی ہوئی حماقت ہوتی۔

یہ بات کہ اس عہد میں کوئی بھی صوبیدار حقیقتاً ایک کامیاب مالی منتظم رہا ہوگا مشتبہ ہے، کیونکہ برنیر سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ محفوظ علاقے اجارہ پر دیئے جاتے تھے اور وہ اپنے مروجہ مظالم کے بیان کے ضمن میں، سرکاری عمال' مستاجروں اور جاگیرداروں کے درمیان کوئی امتیاز قائم نہیں کرتا۔ پس صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ایک صورت میں کامیاب انتظام

کے لیے تھوڑی گنجائش تھی، مگر دوسری صورت میں ایسا مشکل ہی سے تھا۔

میں جن واقعات کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہ یہاں پہونچ کر جہاں تک شمالی ہندوستان میں کسانوں پر تشخیص کا تعلق ہے ختم ہوجاتے ہیں۔ اورنگزیب کی جانشینی اور شمالی ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کی درمیانی ڈیڑھ سو برس کی مدت کے دوران میں کسی اہم تبدیلی کے حوالہ کا پتہ چلانے سے قاصر رہا اور شروع کے برطانوی منتظمین نے جن طریقوں کو رائج پایا وہ ٹھیک وہی ہیں جو 1665ء کے احکام عالمگیری میں بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ ہولٹ میکنزی، اپنی 1819ء کی تحریر میں علاقہ دہلی کے اس وقت کے طریق کار کے متعلق جبکہ ملکی ادارے تبدیل نہ کئے گئے تھے، ایک بیان کا حوالہ پیش کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم خواہ کوئی بھی ہو وہ "گاؤں کے زمیندار کے ساتھ اس مقررہ سالانہ مالگزاری پر جسے وہ ادا کرنا قبول کرے بندوبست کرتا تھا یا وہ فصل میں حکومت کے حصہ کو جنس کی شکل میں لیتا تھا یا پھر وہ مزروعہ زمین کی مقدار اور نوعیت پیداوار کے اعتبار سے معمول کی مالی تشخیص کو عائد کرتا تھا۔" یہاں بالکل عہد عالمگیری کے مثل ہمیں پیش منظر میں اجتماعی تشخیص اور پس منظر میں نسق اور ضبط دکھائی دیتی ہے اور مالگذاری مکمل طور پر کاشت کی ہوئی زمین کی پیداوار کا نصف ہی رہی "اور اس کا معیار بھی تبدیل نہ ہوا، جبکہ عملاً "کاشتکار جس قدر بھی دے سکتا تھا اس قدر وصول کیا جاتا تھا"۔ اسی طور پر لارڈ لویئرائے نے اپنی 1815ء کی یادداشت میں ابتدائی برطانوی طریقے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "کلکٹر موضع کی سابقہ تشخیص پر غور کرکے اس کا ان جملہ اطلاعات سے جو اسے موصول ہوتی ہوں موازنہ کرتا ہے اور موضع کی صلاحیت کا تخمینہ لگانے کے بعد وہ جس شرح تشخیص کو موضع کی ادا کرنے کی صلاحیت کے مطابق سمجھتا ہے اسے زمیندار کے سامنے پیش کرتا ہے۔ زمیندار کے موضع کی صلاحیت کو قبول نہ کرنے کی صورت میں کلکٹر پیمائش کی دھمکی دیتا ہے۔ صحیح صورتحال کے انکشاف سے خائف ہوکر وہ عام طور پر کلکٹر کی پیش کش کو منظور کرلیتا ہے"۔ یہاں پھر قریب قریب بالکل فرمان عالمگیری کے مندرجات کے مطابق، پیمائش کی دھمکی کو محفوظ رکھتے ہوئے، عام حالات کی بنیاد پر نسق کو بطور ایک عام قاعدہ کے اختیار کیا گیا۔

پس ہم یہ تصور کرسکتے ہیں کہ نسق کا طریقہ جسے کسی نامعلوم وقت پر شیر شاہ اور اکبر کے پسندیدہ طریقوں کو بے دخل کر دیا تھا بطور ایک عمومی قاعدہ کے شمالی ہندوستان میں مسلم عہد کے اختتام تک قائم رہا۔ اس درمیانی مدت میں ہمارے لئے دلچسپی کا پہلو رکھنے والی چیز وہ تبدیلیاں ہیں جو درمیانی اشخاص پر اثر انداز ہوئیں اور جن کے نتیجہ میں جاگیرداران اور معافیداران، سرداران،

چودھری اور مستاجر سب کے سب زمینداروں کی ایک جماعت میں جسے آگے چل کر برطانوی قانون کے بطور ایک ہم جنس جماعت کے تسلیم کیا، ضم ہو گئے - ان تبدیلیوں کے ابتدائی مرحلے اگلی فصل کا موضوع ہے -

5 - اورنگ زیب اور اس کے جانشینوں کے تحت درمیانی اشخاص

کسی پچھلی فصل میں گزر چکا ہے کہ سترھویں صدی کے وسط میں مالگزاری کا بیشتر حصہ یہاں تک کہ ۲۲ کروڑ میں سے ۱۹ کروڑ جاگیروں میں دیا ہوا تھا اور اس کے نتیجہ میں اس زمانہ میں بادشاہ اور کسانوں کے مابین جاگیرداران اہم ترین درمیانی طبقہ تھا - اگلی نصف صدی کے دوران ایک تدریجی تبدیلی واقع ہوئی اور عہدِ عالمگیر کے تموڑے ہی دنوں بعد، جاگیریں فی الجملہ غیر سود مند اور قدرتی طور پر غیر مقبول ہو گئی تھیں - پھر بھی ان کا دیا جانا قائم رہا - لیکن طاقت ور لوگ ایک کاغذی حق کے مقابلہ میں ایسے حق کو جو طاقت پر مبنی ہو ترجیح دیتے تھے اور اٹھارھویں صدی کے دوران تعلق یا "ماتحت علاقہ" نے بحیثیت ایک اہم ترین مدنی ادارہ کے جاگیر کی جگہ لے لی -

اورنگزیب کی وفات کے جلد ہی بعد خوانی خاں کی لکھی ہوئی سرگذشت میں جاگیروں کی عدم مقبولیت کا بار بار ذکر آتا ہے - اس کی سب سے زیادہ قابلِ توجہ عبارت ایک تحریر[27] کی شکل میں ہے جس میں اپنے حکام کے مستعدی کے ساتھ خدمت انجام دینے کے خاطر انھیں ساز و سامان سے لیس کرنے کے سلسلہ میں شاہجہاں کی فیاضی کو بیان کرنے کے بعد اس کا مصنف ماضی اور حال کے موازنہ پر زور دیتا ہے - اس کی تحریر کا یہ مفہوم ہے کہ ان فوراً ایک سو بدبخت جاگیرداروں میں سے غالباً ایک دو ایسے ہوں گے جو اپنی جاگیروں سے روٹی کا ایک ٹکڑا پا سکتے ہیں - بقیہ فاقہ کش گداگر ہیں اور جن کے نام نقدی فہرست پر ہیں ان کا زیادہ سے زیادہ سال دو سال تک تنخواہ پانا ممکن ہوگا - یہ عبارت مبالغہ آمیز ہے اور مصنف واضح طور پر مایوسی کا شکار تھا - لہذا ہمیں اس کے الفاظ کو کافی حد تک نظر انداز کرنا چاہیے - لیکن یہ تصور کرنے کا کوئی سبب نہیں کہ اٹھارھویں صدی کی پہلی چوتھائی میں جیسا خیال کیا جاتا تھا، یہ عبارت اس کے لب لباب کی مظہر نہیں ہے - غالباً اس عبارت کا اہم ترین پہلو اس بات کا تسلیم کیا جانا ہے کہ بمقابلہ جاگیر پانے کے نقدی فہرست پر ہونا بہتر رہا ہوگا - اس کے ماقبل عہد کی تحریروں میں اس قسم کا کوئی ترجیحی پہلو نہیں نکلتا - اس وقت جملے اونچے اور مقبول نظر عہدداران خود بخود جاگیریں پاتے تھے - درمیانی مدت میں جو تبدیلیاں بھی سرگذشتوں میں درج ہیں وہ فی الجملہ جاگیرداروں کے

موافقت میں تھیں۔ ان تبدیلیوں میں سے ایک اس طریقہ سے تعلق رکھتی تھی جس کے تحت جاگیرداروں سے شاہی اصطبل کے جانوروں کے اخراجات طلب کیے جاتے تھے۔ عہدِ عالمگیری میں جبکہ جاگیروں کی آمدنیاں گھٹ رہی تھیں اس قاعدہ نے ایک سنگین بار کی شکل اختیار کرلی یہاں تک کہ ہوسکتا تھا کہ کسی جاگیردار پر اصطبل کا مطالبہ اس کی مجموعی وصولیوں سے بھی زائد ہو۔ لیکن شاہ عالم کے زمانہ میں ان مطالبات کا کچھ اس طور پر انتظام کیا گیا کہ کوئی شکایت باقی نہ رہی۔ دوسری اس سے زیادہ اہم قاعدہ کی تبدیلی حسابات کی جانچ کا ختم کیا جانا تھا۔ سترھویں صدی کے دوران میں کسی دیوان کے لئے ضروری تھا کہ وہ جاگیرداروں کو ان کی واجب رقم سے زائد نہ لینے دے اور اگر زائد ہو تو اسے شاہی خزانہ کے لیے وصول کرے۔ دوسری طرف جاگیرداروں کو یہ حق پہنچتا تھا کہ بعض مخصوص اسباب کی بنا پر اگر اس کی واقعی آمدنی کم ہو تو وہ کمی کو خزانہ سے وصول کرے، حالانکہ محاسبین کی طے شدہ مخالفت کے باعث ایسے استحقاق کو ثابت کرنا دشوار ہوتا تھا۔ چنانچہ جاگیر کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً عقلوں کا مقابلہ ہوا کرتا تھا جس میں جاگیردار کو اپنی جملہ وصولیوں پر متصرف ہونے کے لیے باصلاحیت وکیلوں کو رکھنے کی ضرورت ہوا کرتی اور غالباً رشوت پر بھی آزادی کے ساتھ خرچ کرنا ہوتا تھا۔ لیکن عہدِ عالمگیری کے دوران یہ طریقہ بتدریج زوال پذیر اور خوافی خاں کی تحریر کے وقت تک متروک ہوگیا تھا۔

بس ہمیں جاگیروں کی عدمِ مقبولیت کے اسباب کو انتظامی تبدیلیوں میں نہیں بلکہ اس وقت کے حالات، زرعی پیداوار میں کمی اور مرکزی اقتدار کے انحطاط میں تلاش کرنا چاہیے۔ کسانوں کی زیادہ پرکشش پیشوں کے جانب منتقلی، جس پر پچھلی فصل میں بحث آچکی ہے۔ بلاشک قائم رہی اور عہدِ عالمگیری کے دوران اس نے غالباً شدت پکڑی۔ کسانوں کے کم ہوجانے کے ساتھ جاگیرداروں کی آمدنی کا گھٹ جانا لازمی تھا۔ ہم بالکل بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ یہ عمل ایک بار شروع ہوجانے کے بعد مائل بہ اضافہ رہا کرتا کیونکہ کسی جاگیر پر مختصر اور غیر یقینی میعاد کے لئے قابض شخص عموماً باقیماندہ کسانوں پر دباؤ کو بڑھا کر اپنے نقصان کی جزوی تلافی کی کوشش کیا کرتا اور یہ بڑھا ہوا بار اپنی جگہ پر فراری کے محرکات کو مزید تقویت پہونچاتا۔ جاگیروں کی آمدنی میں اضافہ پذیر کمی خود ہی ان کی غیر مقبولیت کی توجیہہ کے لئے کافی ہے۔ پھر اس پر مستزاد یہ خطرہ برقرار رہا کرتا کہ جاگیردار باقیماندہ آمدنی پر بھی قبضہ نہ حاصل کرسکے گا۔

جہاں تک دکن کا تعلق ہے، اس خطرہ کا سبب اصلاً مرہٹوں کی سرگرمیاں تھیں۔ جنوب میں اورنگزیب کی اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کی کوششوں کے حالات کا دوسری کتابوں میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں صرف اس بات کا اعادہ کافی ہوگا کہ مرہٹے اپنی جمی ہوئی مملکت اور اس

سے بہت زائد علاقہ کی آمدنی میں اپنے استحقاق دونوں ہی کو مسلسل بڑھا رہے تھے۔ خوافی خاں کی ایک عبارت [(2) 784 وما بعد] مظہر ہے کہ اورنگزیب کی وفات کے دس برسوں کے اندر یہ استحقاق جو مالگزاری کے ایک چوتھائی (چوتھ) کی شکل میں تھا بڑھ کر تقریباً نصف ہو گیا تھا۔ دوسری طرف ان مواضعات میں جو ویران کئے جانے کے بعد دوبارہ بسائے گئے تھے مجموعی پیداوار مرہٹوں، جاگیرداروں اور کسانوں میں برابر برابر تقسیم ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک جاگیردار پیداوار کا تقریباً نصف حصّہ جو پہلے اس کی آمدنی شمار ہوتا تھا وصول کرنے کی امید نہ کر سکتا تھا اور یہ بات تو ہمیشہ ہی مشتبہ رہی ہو گی کہ ایسے علاقوں میں جہاں مرہٹوں نے اپنے محصّلین مالگزاری علٰحدہ سے مقرر کر رکھے تھے وہاں جاگیردار کچھ بھی وصول کر سکتا تھا۔ اس صورت میں یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک خالی خزانہ کے نام بھی نقد ادائگی کے حکم کو ایسے علاقہ کی جاگیر پر ترجیح دی جاتی ہو گی جس میں مرہٹوں کا غلبہ ہو۔

شمالی ہندوستان کے متعلق ہماری معلومات بہت نامکمّل ہیں کیونکہ سرگزشتوں میں 1682ء کے بعد سے جب اورنگزیب نے اپنے دربار کو دکن منتقل کیا، شمال میں پیش آنے والے واقعات بہت کم ملتے ہیں۔ صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ملک پر انتظامیہ کی گرفت بتدریج ڈھیلی ہو رہی تھی، حکّام بے قابو ہو رہے تھے اور طاقتور اشخاص نے خود مختاری کا رویّہ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ خوافی خاں ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے [(2) 861] جو غالباً پیش آنے والے واقعات کا نمونہ ہے۔ 1719ء سے چند سال قبل حسین خاں نام کا ایک افغان باغی ہو کر لاہور کے چند نواحی پرگنوں پر قابض ہو گیا تھا۔ حکومت اور جاگیردار کے مقرر کئے ہوئے ملازمین اپنے اپنے علاقوں سے بھگا دیئے گئے، صوبہ دار کی فوج کو بار بار شکست دی گئی اور حسین خاں تھوڑے عرصے تک عملاً خود مختار رہا۔ لیکن وہ بالآخر صوبہ دار کے ساتھ ایک مختصر سی لڑائی میں کام آیا۔ مزید جنوب میں ہمیں آگرہ کے قریب جاٹوں کی بغاوت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جس کے نتیجے میں آخر کار ریاست بھرتپور وجود میں آئی۔ اودھ کی مقامی روایات مظہر ہیں کہ سترہویں صدی کے ختم ہوتے ہوئے، سرداران اور سرکاری عمّال دونوں ہی حصول علاقہ کی جد و جہد میں معروف تھے اور ہم ان سانحات کو استثنائی تصوّر نہیں کر سکتے۔ ایک جاگیردار اب بادشاہ کے اقتدار پر بھروسہ نہ کر سکتا تھا۔ اسے مالگزاری کے دوسرے دعویداروں کے ظاہر ہونے کا خطرہ محسوس ہونے لگا تھا جنھیں وہ یا تو بزور طاقت پسپا کرے یا پھر اپنی متوقع آمدنی کے خسارہ کو برداشت کرے۔ اس طور پر اٹھارہویں صدی ایک ایسا

دور تھا جس میں بالفعل قبضہ نے حق پر فوقیت حاصل کر لی تھی اور درمیانی اشخاص کے مختلف طبقوں کا بظاہر باہمی انجذاب جیسا کہ فیروز کی وفات پر سلطنت دہلی کے انتشار کے نتیجہ میں پیش آیا تھا اور جس کا پہلے ذکر آ چکا ہے اس عہد کی ایک خصوصیت تھی۔ لفظ تعلق جس کا ترجمہ ماتحت علاقہ کیا جاسکتا ہے' کی تاریخ میں اس انجذاب کا عکس نظر آتا ہے اس سے پہلے کی سرگزشتوں میں یہ اور اس کے ہم مشتق الفاظ ایک شخص اور اس کی حیثیت کے مابین رشتہ کے مفہوم میں خواہ یہ سرکاری ہو یا علاقائی کبھی کبھی استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن وسط سترھویں صدی تک جبکہ بادشاہ نامہ تحریر ہوا اس لفظ کے کسی مخصوص یا اصلاحی معنی کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی۔ مآثر عالمگیری میں جو 1710ء میں مکمل ہوئی تخصیص کے آثار ملتے ہیں اور اس کے چند برسوں بعد خوافی خاں نے اپنی تحریر میں اس لفظ کو اس مخصوص مفہوم میں جو برطانوی عہد کے آغاز پر شمالی ہندوستان میں رائج تھا یعنی ملک کے ایک زیر قبضہ خطہ کے طور پر نوعیت استحقاق خواہ کچھ ہی ہو' استعمال کیا ہے۔ ایک عہدہ دار یا سردار' ایک جاگیردار یا ایک غیر ملکی طاقت تک کا اس مخصوص مفہوم میں 'ایک ماتحت علاقہ' پر قبضہ ہو سکتا تھا' کیونکہ اب قبضہ ہی کی اہمیت رہ گئی تھی۔ اگلے باب میں ان نتائج کو عرض میں لانا ہوگا جو اس وقت ظہور میں آئے جب برطانوی افسران نے شمالی ہندوستان کے انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ ان کا رجحان قدرتی طور پر ہر قسم کے ماتحت علاقوں کو ایک ہی طرح کا ملکیت زمین پر قبضہ تصور کرنے کا تھا۔ اس مقام پر صرف اس قدر ذہن نشین کر لینا کافی ہوگا کہ یہ اصطلاح اپنے مخصوص مفہوم میں انتشار کے عہد میں جبکہ حقوق اور دعووں کی قدر و قیمت کا انحصار عام طور پر قوت نافذہ پر ہو چکا تھا نمایاں ہوئی۔

پہلے گزر چکا ہے کہ منجملہ مختلف ماتحت علاقہ داروں کے جاگیرداران اپنی وسط سترھویں صدی کی نمایاں حیثیت سے محروم ہو چکے تھے۔ اس اثنا میں درمیانی اشخاص کے دوسرے طبقوں کی اہمیت میں اضافہ ہوا تھا۔ مرکزی انتظامیہ کے انحطاط نے سرداروں کو لازماً طاقت پہونچائی تھی اور ہمیں اس لفظ کے دائرہ میں اب مسلمانوں کو بھی شامل کر لینا چاہیے کیونکہ اس مذہب کے لوگوں نے اپنی حیثیت کو کچھ ایسا مستحکم کر لیا تھا جو راجاؤں اور رایوں سے مختلف نہ تھی۔ طاقتور تابعین مملکت واقعی بادشاہ بن سکتے تھے جیسا کہ اودھ' روہیلکھنڈ اور فرخ آباد میں پیش آیا اور اسی طرح ان سے نیچے درجہ کے عہدہ داران' ایک نسبتاً چھوٹے علاقہ میں عملاً خود مختار ہو سکتے تھے بستاجروں کو بھی اجاروں کی مدتوں کو بڑھانے اور پیشگی نذرانے قبول کرنے کے طریقے نے ان مواقع میں اضافہ کیا اور ہمیں مجموعی طور پر اورنگزیب کی وفات کے بعد جو عہد آیا اسے ایک ایسا زمانہ تصور کرنا

چاہیے جس میں ان مختلف طبقوں کے لوگ علاقوں اور ان سے ہونے والی آمدنی کے جدوجہد میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے۔ حصول آمدنی کے حقوق اب بھی بادشاہ عطا کر سکتا تھا لیکن سلطنت کی طاقت اس کے احکام کو نافذ نہ کر سکتی تھی اور اکثر اوقات یہ حق کسی شخص کو بھی جس نے بزورِ طاقت قبضہ حاصل کر لیا ہو دیا جا سکتا تھا۔ ان حالات کے نتائج اس وقت ظاہر ہوئے جب شمالی صوبے برطانوی تسلط میں آئے جنھیں ہم اگلے باب میں بیان کریں گے۔

نظام جاگیرداری کے بیان کو ختم کرنے کے قبل، سترھویں صدی کے دوران مالیت کے طریقہ کا ایک مختصر ذکر مناسب ہوگا۔ کسی باضابطہ نظرِ ثانی کا واحد حوالہ جو مجھے سرگزشتوں میں مل سکا ہے وہ بنگال کی مالیت پر نظرِ ثانی کرنے کی غرض سے ایک دیوان کی تقرری کے متعلق جہانگیر کا حکم (تزک' 9) ہے۔ اس کے نتیجہ کی کوئی اطلاع تحریروں میں درج نہیں، لیکن جیسا کہ باب 7 میں واضح کیا جائے گا' ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس صوبہ میں نظرِ ثانی عمل میں آئی تھی۔ صدی کے نصف اوّل میں عام مالیت کا قائم کیا جانا مختلف عبارتوں سے جن میں سے چند کا ضمیمہ الف میں حوالہ ہے' ثابت ہے اور کسی مخصوص علاقہ کی آمدنی کا اس کی مالیت سے موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ اگلی صدی کی بعض شماریاتی تحریریں مبہم طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ عہدِ عالمگیری کے دوران قاعدہ میں تبدیلی ہوئی کیونکہ اس کی مملکت کے اعداد دو کے بجائے تین خانوں میں درج ہیں۔ پہلے خانہ کو جسکی سرخی جمع دامی ہے ہم بلا تردد باضابطہ مالیت اور تیسرے (حاصل سنوات) کو موجودہ یا حالیہ آمدنی تصور کر سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے خانہ کی تعبیر (حاصل کامل) جس کی وضاحت ان دستاویزات میں جن کا مجھے علم ہے نہیں ملتی' زیادہ دشوار ہے۔ اس کے عنوان کا مفہوم "پوری" یا "تکمیل" آمدنی ہے اور یہ ایک طرح کی معیاری عدد کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت اور اس کے نکالنے کے طریقے کے متعلق محض قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔

میرا اپنا قیاس ہے کہ "تکمل آمدنی" "تکمل سال کی آمدنی" کے لئے ایک دفتری مختصر اصطلاح ہے یعنی یہ کہ اس صدی میں کسی وقت جب آمدنی کو مالیت سے ہٹا ہوا پایا گیا تو اکبر کے طریقوں کے مطابق محنت کر کے نئی مالیت نکالنے کے بجائے وزارت نے اس مقصد کے لئے بطور معیار کے کسی مخصوص سال کے اعداد کو منتخب کر لیا۔ لیکن کسی نہ کسی بنا پر متروک اعداد کو بھی نئے معیار کے ساتھ ساتھ قائم رکھا گیا۔ اس طور پر ان تینوں خانوں میں ترتیب وار پرانی اور نئی مالیتیں اور موجودہ آمدنی درج کی جاتی تھی۔ ایک مثالی یا معیاری سال (سال کامل) کا تخیل کم از کم اس قدر

قبل یعنی اکبر کے عہد[20] میں موجود تھا اور مالیت کے لئے کسی ایسے معیار کا اختیار کیا جانا کوئی بالکل ہی غیر معقول تدبیر نہ تھی۔ لیکن اس موضوع پر مجھے کوئی مثبت شہادت نہیں ملتی اور صرف اسقدر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں نظام جاگیرداری کے انحطاط کے وقت تک وزارت میں کسی نہ کسی طرح کی مالیت زیرِ استعمال تھی۔

باب 5

حوالہ جات

1۔ بادشاہ نامہ (2)، 713۔ یہ سرگذشت بادشاہ کے احکام کی تعمیل میں مرتب کی گئی تھی اور اس میں مندرج اعداد کو سرکاری تصور کرنا بجا ہوگا۔

2۔ مآثر الامرا (2)، 813 و صفحات مابعد۔ ایلیٹ [(8)، 187] میں کتابیاتی یادداشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس لغت کے مصنف خلو ط ہیں۔ لیکن اس کا کوئی جز اٹھارہویں صدی سے قبل کا نہیں ہے۔ اور اس کی تالیف شمالی ہندوستان میں نہیں بلکہ دکن میں عمل میں آئی تھی۔

3۔ تزک، 252۔ پھل پیدا کرنے والے پیڑوں کے محصول کو سردرختی کہا گیا ہے۔ اکبر نے اس محصول کو معاف کر دیا تھا۔ [آئین (1)، 301]۔

4۔ تزک 10۔ بادشاہ نامہ (2)، 409۔ برطانوی عہد کے آغاز پر التمغا معافیوں کے دعوے عام تھے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کی بد نظمی کے دوران اس نام کا استعمال غلط طور پر ہونے لگا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام بنگال کی دیوانی کے عطیہ کو التمغا کہا گیا تھا [AITCHISON'S TREATIES (1892) I. 56] لیکن اس عطیہ کو اس اصطلاح کی ابتدائی تعریف کے مدد کے اندر لانا ممکن نہیں۔

5۔ طامس رو، 210۔ ٹریپسٹرا، ضمیمہ 6۔ طامس رو کے درج کئے ہوئے بہار کے صوبہ دار کے بیان کے مطابق وہ اپنے عہدہ کے لئے 11 لاکھ سالانہ ادا کرتا تھا۔ وہ 3.6 لاکھ بطور "پنشن" (قیاساً انعام) پاتا تھا اور اپنے منصب کی تنخواہ سے 7 لاکھ کماتا تھا۔ اس کا آخری تجزیہ یہ تھا کہ نیا اجارہ اس کے منظور شدہ حالات سے زائد تھا، لہٰذا اس کی واقعی آمدنی کا انحصار اس امر پر تھا کہ وہ متفرق وصولیوں کے ذریعہ صوبہ سے کس قدر پیدا کر لیتا ہے۔ بہرحال، اس طور پر کیے ہوئے اعداد میں غلطیوں کی بڑی گنجائش ہے۔ اور جزئیات پر کسی دلیل کو مبنی کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔

6۔ پلسارٹ (ص 99) نے تحریر کیا ہے کہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہنے والا جاگیردار یا تو اپنی جاگیر کے انتظام کے لئے اپنے ملازمین کو بھیجتا تھا یا پھر اسے بطور اجارہ کسی محصل کے سپرد کر دیتا تھا۔

7۔ گجرات، رپورٹ ورق 21۔ "دسواں حصہ بھی نہیں" کے فقرہ کو بالکل ریاضی کے اعتبار سے نہ تصور کرنا چاہئے۔ رپورٹ لکھنے والے نے اکثر اعداد کو مبالغہ کے ساتھ درج کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کا اس کے علاوہ اور کچھ مفہوم نہیں کہ

ہر شخص کے لئے افراط زر میں موجود تھی۔ وہ لفظ "ملک" (زمین) کو دوسرے متعدد عبارتوں میں جاگیردار کے مفہوم میں استعمال کرتا ہے۔

8۔ J. Van Twist, Beschrijvinge van Indien, c. XII ۔ یہ کتاب بار اول 1638 میں شائع ہوئی تھی۔

9۔ ہاکنس کے لئے ملاحظہ ہو Early Travels 83، 91، 93، 114 اور ٹیری کے لئے ایضاً 366۔ گجرات کی رپورٹ کی عبارت، بروچ کے متعلق باب کا ورق 9 ب ہے۔ پلسارٹ کے مشاہدات کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ 31 و مابعد۔

10۔ ملاحظہ ہو ایلیٹ (7)، 171۔ جس لفظ کا ترجمہ "کلکٹر" کیا گیا ہے وہ چکلہ دار ہے۔ مجھے اس لفظ کا اس کے قبل کوئی استعمال نہیں ملا ہے۔ لیکن صدی کے وسط تک چکلہ کلکٹر کے ایک حلقہ کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا (بادشاہ نامہ (1) 409) اور یہاں بلا کسی تردد کے چکلہ دار کا مفہوم کلکٹر لیا جا سکتا ہے۔

11۔ ملاحظہ ہو بادشاہ نامہ (2)، 247، 318۔

12۔ پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے ان فرمانوں کے متن کو مع ترجمہ کے جے۔ اے۔ ایس۔ بی موٴرخہ جون 1906ء صفحہ 223 و مابعد پر شائع کیا تھا۔ ان کا ترجمہ اسی مصنف کی کتاب Studies in Mughal India صفحہ 168 و مابعد پر بھی ملے گا جہاں اس کے معدوم مخطوطات کا بھی شمار کیا گیا ہے۔ ذیل کے حوالوں میں، میں نے راسکداس کے نام فرمان کے لئے 'ر' اور محمد ہاشم کے نام فرمان کے لئے 'م' کے حروف استعمال کئے ہیں۔ میں نے جنوری 1922ء کے جے۔ آر۔ اے۔ ایس میں ان دستاویزات پر بحث کی ہے لیکن میں اس وقت موخر الذکر کے فتاوائے عالمگیری سے تعلق کا پتہ نہ چلا سکا تھا۔

13۔ پہلے حکم کا مخاطب راسکداس کروڑی ہے۔ لیکن اس کے شرائط سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک صوبائی دیوان کے لئے تھا کیونکہ اس میں اسے دیوان کے عملہ یعنی امین، عامل یا کروڑی اور خزانچی پر نگرانی کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ لہذا ہمیں کروڑی کے لفظ کو عہدہ کا نام نہیں بلکہ ایک صفت تصور کرنا چاہئے۔ ایسی صفت اس وقت عام طور پر استعمال کی جاتی جب ایک ہی نام کے دو یا زائد عہدہ داران ہوا کرتے اور ہمارا قیاس ہے کہ دیوان کے عہدہ پر ترقی کے قبل راسکداس ایک کروڑی رہ چکا تھا۔ مجھے سرگذشتوں میں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ لیکن ہمیں اس وقت کے صوبائی دیوانوں کی مکمل فہرست کے قسم کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ دوسرے حکم کا مخاطب محمد ہاشم، پروفیسر سرکار کے قول کے مطابق گجرات کا صوبائی دیوان تھا۔

14۔ فتاوائے عالمگیری عنوان "عشر و خراج"۔ اس کا متن عربی زبان میں ہے اور میرے علم میں اس کا کوئی مطبوعہ ترجمہ نہیں ہے۔ میں نے جس ترجمہ کو استعمال کیا ہے۔ اسے مسٹر اے۔ ایم۔ حافظ پوٹا نے میرے لئے کیا تھا۔

15۔ اس دفعہ (د۔ ۶) کے دوسرے تحتی فقرہ میں لفظ "گنجائش" کا ایک مبہم حوالہ آتا ہے۔ پروفیسر سرکار اس کا ترجمہ "ناجائز قبضہ کی زمین" کرتے ہیں۔ میرے علم میں اس وقت اس کا اس مفہوم میں استعمال نہیں آیا تھا اور نہ مجھے اس کے مماثل کوئی عبارتیں ملی ہیں لیکن علم صرف اور سیاق کے اعتبار سے مجھے شبہ ہے کہ اس کا مفہوم وہ "زائد حصہ" ہے جس سے چودھری قطعہ

ہی باہم بچت کرتے تھے۔ انھوں نے ایک معقول رقم ادا کرنے کا قرار کیا تھا اور اگر وہ کسانوں سے صرف اسی قدر طلب کرتے تو ان میں سے بعض کے ادا نہ کرنے کی صورت میں چودھریوں کو ہی خسارہ بھگتنا پڑتا۔ لہٰذا یہ قدرتی امر تھا کہ کسانوں کے ذمہ واجب رقم سے کچھ زائد لے کر وصولی شروع کی جائے تاکہ نادہندوں کی کمی خوش دہندوں سے پوری ہو سکے اور اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ یہ طریقہ ایک بار شروع ہو جانے کے بعد ایک سنگین خرابی کی شکل اختیار کر لے۔ میرا خیال ہے کہ اس تحتی فقرہ کا یہ مفہوم ہے کہ دیوان کو اس مسئلہ پر نگاہ رکھنی چاہیئے اور اس کا اطمینان کرنا چاہیئے کہ زیادہ مقدار میں "گنجائش" کی رقم چودھریوں کے جیب میں نہ رہ جائے۔ باب چہارم میں مندرج ایک اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کے نواحی علاقوں میں چودھری کبھی کبھی اپنے ذمہ واجب الادا رقم سے زائد وصول کر کے 'درمیانی فرق' سے خود مستفید ہوتے تھے۔

16۔ میں ر۔ 6۔ 9 میں مندرج لفظ 'متقبّلان' کے معنی "غالب جماعت" سمجھتا ہوں۔ کسی موضع میں ایسی جماعتوں کی موجودگی، برطانوی عہد کے ابتدائی دور کی ایک نمایاں خصوصیت تھی اور اٹھارھویں صدی میں یہ یقینی طور پر کافی عرصہ سے چلی آرہی تھی۔

17۔ پروفیسر سرکار نے واضح کیا ہے (STUDIES IN MUGHAL INDIA, P. 217) کہ اڑیسہ کے کچھ حصوں میں عہد عالمگیری میں مالگذاری بمقدار جنس ادا کی جاتی تھی۔ لیکن یہ ان علاقوں میں سے تھا جہاں روپیہ پیسہ کی معمولاً کمیابی تھی اور ہم اسے شمالی ہندوستان کے لئے مخصوص نہیں کر سکتے۔

18۔ ر۔ 9 میں مندرج فقرہ "سربستہ آفت" کی تعبیر کرنے میں کچھ دقّت محسوس ہوتی ہے۔ سیاق عبارت سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس مصیبت کے مترادف ہے جس میں تقسیم مطالبہ (تفریق) کا انحصار چودھریوں اور محاسبوں پر ہوتا تھا اور یہ کہ طریقہ کی اجازت نہ دینی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں واحد وضاحتی عبارتیں خوافی خاں (1) 733 اور ماثر الامرا (3) 498 میں مجھے ملی ہیں جو دو نہیں بلکہ ایک ہی ماخذ ہیں۔ ان میں ہر کسان پر تشخیص مطالبہ کے طریقہ کے لئے تشخیص سربستہ کا لفظ آیا ہے۔ یہاں اس لفظ کے معنی واضح طور پر "فی کس" یا قریب قریب اس کے صرفی معنی کے ہیں اور یہی مفہوم زیر بحث عبارت میں بھی موزوں معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ "سربستہ مصیبت" وہ مصیبت ہوئی جس میں حکّام موضع ایک ایسی فہرست بھیجتے تھے جس میں ہر کسان کا نقصان علیحدہ علیحدہ دکھاتے تھے اور اس قسم کی کارروائی میں دھوکہ کا امکان اس قدر بیّن تھا جس سے اس کا منع کیا جانا سمجھ میں آتا ہے۔

19۔ وظیفہ یعنی موظّف حق کی ادائیگی کا ذکر آئین اکبری [(1) 294] میں آتا ہے لیکن یہ عام اسلامی نظام مال کی تحقیقات کے سلسلہ میں ہے اور اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ ہندوستان میں وظیفہ ادا کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی وقائعوں میں لفظ وظیفہ کبھی کبھی آتا ہے۔ لیکن میری نظر سے جو عبارتیں گزری ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی اس کا مفہوم کسان کی اراضیداری

کا نہیں ہے یہ معمولاً بادشاہ کے کسی حاکم یا اس کی فیاضی کے کسی دوسرے حقدار کو عطا کئے ہوئے گذارہ کے مصداق ہے۔ جو عموماً نقدی ہوتا ہے۔

20۔ بدایونی (2)' 189۔ پلسارٹ 47'۔ برنیر 205۔ مینرق (1)' 53' ہکلیوٹ سوسائٹی کے ترجمہ میں (TRAVELS OF SEBASTIAN MANRIQUE 1927)۔

21۔ میں نے اس موضوع پر 'FROM AKBAR TO AURANGZEB' کے باب 7 میں قدرے تفصیل سے بحث کی ہے جہاں متن بالا میں مندرج خلاصہ کے تفصیلی حوالے موجود ہیں۔ 1645ء کا پنجاب کا قحط جو اس میں درج نہیں ہے بادشاہ نامہ (2) 489 میں ملتا ہے۔

22۔ طاعون کے لئے ملاحظہ ہو تزک 162' 225 بادشاہ نامہ (1)' (1)' 489' (2) 353 خوافی خان (1)' 755 اور (2) 382 ۔ اس بیماری کی علامت کو معمولاً گلٹی کی موجودگی یا اس کے چوہوں اور جوہوں پر اثرات سے ظاہر کیا ہے۔

23۔ اس وبا کا سر ولیم فوسٹر کے مرتب کئے ہوئے 'SUPPLEMENTARY CALENDERS OF DOCUMENTS IN THE INDIA OFFICE' میں مطبوعہ بعض تجارتی کوٹھیوں کی تحریروں میں ذکر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو نمبران 377' 379' 384' 393۔ یہ اطلاع بہرحال براہ راست نہیں ہے۔ ایک رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ "طاعون نہ تھا" لیکن یہ اطلاع کسی طور پر بھی فیصلہ کن نہیں۔

24۔ برنیر۔ کولبرٹ کے نام خط ص 200 پر شروع ہوتا ہے۔ مذکورہ اقتباس ص 205 پر ہے۔ فراری کا موضوع ص ص 226' 252 پر دوبارہ ملتا ہے۔

25۔ یہ اقتباس مطبوعہ ترجمہ سے لیا گیا ہے۔ لفظ 'LABOURERS' کا محنتیوں کے مقابلہ میں کسانوں' ترجمہ کرنا زیادہ درست ہوگا۔

26۔ FROM AKBAR TO AURANGZEB باب 8' فصل 5 میں میں نے یہ ثابت کیا تھا کہ عہد شاہجہانی میں بڑھے ہوئے اضافہ کی عکاسی بعض اب تک موجود مالی شماریات میں ملتی ہے۔ اس کے بعد میں نے یہ محسوس کیا میرا یہ دعویٰ قاعدہ کی رو سے ناقص ہے کیونکہ عہد حکومت کے آغاز کی شماریات کو حاصل کیا گیا ہے لیکن بعد کے اعداد کو جمع۔ سابقہ ترجموں کی تقلید کرتے ہوئے میں نے ان اصطلاحوں کو ایک دوسرے کا مترادف تصور کیا تھا۔ لیکن جیسا کہ ضمیمہ الف میں وضاحت کی گئی' انھیں ایک دوسرے سے مختلف خیال کرنا چاہیئے اور ان کے اعداد براہ راست قابل موازنہ نہیں ہیں۔ اپنے دعوے کو دوبارہ ثابت کرنے کے لئے' شاہجہاں کی تخت نشینی پر جمع کے اعداد کا پتہ لگانا ہوگا یا اس عہد کے دوران حاصل اور جمع کے درمیانی رشتہ کو صحیح طور پر متعین کرنا ہوگا اور ان معلومات کے سلسلہ میں میری کوششیں ابھی تک ناکام رہی ہیں۔

27۔ برنیر' 224' 225۔ وہ جاگیرداروں کا 'AIMARIOTS' کے نام ذکر کرتا ہے۔ قیاس ہے کہ اس نے اس اصطلاح

کو تنکی کے اپنے سفر میں سیکھا تھا۔ یہ اصطلاح ایک ایسے اماضیدار کو ظاہر کرتی ہے جس کے ساتھ فوجی خدمت کی ذمہ داری وابستہ رہا کرتی اور اس میں اور اور مملکتِ مغلیہ کے جاگیروں میں بظاہر کوئی فرق نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس عبارت کا یہ مفہوم سمجھنا ضروری نہیں کہ محفوظ علاقوں میں اجارہ داری کوئی مستقل چیز تھی گو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ ایک عام طریقہ تھا۔

28۔ ریونیو سلکشنز (1) '89' 90 (ہولٹ میکنزی) '323 (لارڈ موئیرا)۔ پہلے اقتباس میں الفاظ "زمیندار موضع" سے مراد اپنے چودھریوں کی وساطت سے عمل کرنے والے کسان ہیں۔

29۔ خوافی خاں (1) 622۔ اس سرگزشت کی قریبی تحریر تاریخ '(2) '378 کے اس عبارتوں میں معین کی گئی ہے۔ ان میں سن تحریر 1135ھ یا 1722۔ 3 درج ہے۔

30۔ خوافی خاں (2) 602 .

31۔ اس پیچیدہ موضوع کے لئے ملاحظہ ہو تزک، 22' 89' 190' 399۔ صالح ' 319۔ ساقی 234۔ خوافی خاں (1) 75 (2) 87' 397۔ یہ امر کہ زائد وصولی کی ایک معقول مقدار واپس لی جاسکتی تھی ساقی '170 کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ شائستہ خاں سے بحیثیت بنگال کے صوبیدار کے اپنی منظور شدہ آمدنی سے زائد وصولی کی مد میں 132 لاکھ فاضل طلب کئے گئے۔

32۔ خوافی خاں (2)۔ 1683ء میں خان جہاں کو دکن سے جاٹوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا (316)۔ وہ ناکام رہا لیکن 1690ء میں ان کی سرکشی میں اضافہ ہوا (394)۔ مؤرخ اس موضوع پر مزید نہیں لکھتا۔ لیکن اس ریاست کے وجود میں آنے کے حالات کو امپیریل گیزیٹیر (8) 74 میں دیکھا جاسکتا ہے۔

33۔ ملاحظہ ہو مثلاً ڈبلو۔ سی۔ بینٹ کی تصنیف THE CHIEF CLANS OF ROY BAREILLY DISTRICT (تصحیح شدہ طباعت 1895ء) صفحہ 36 ومابعد۔

34۔ زیادہ صحیح طور پر تعلق۔ گو ہم اس سے ماخوذ لفظ تعلقہ دار "کسی تعلق پر قابض" سے مانوس ہیں لیکن کسی عمومی بحث میں اس سے پرہیز بہتر ہے کیونکہ اب اس کے مختلف صوبوں میں مختلف معنی لئے جاتے ہیں۔

35۔ خوافی خاں اپنی پہلی جلد میں اس لفظ کو بلا کسی امتیاز کے کسی جاگیردار کے [(1) 266' 324] سرداران (جودھپور) [(1) 288] کے (جاجمو و بندیلہ) [(1) 516] کے اور ایک غیر ملکی طاقت "پرتگیزیوں کا تعلق" [(1) 469] کے زیر قبضہ علاقہ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال دوسری جلد میں جہاں اس نے خود اپنے زمانہ کے حالات درج کئے ہیں زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً زمینداران اپنے ذاتی تعلقوں میں" [(2) 89] "جاگیرداران کے تعلقے (114) اور "ملہر کے فوجدار کا تعلق (277)۔

36۔ فرخ سیر کے عہد حکومت میں "محفوظ پرگنوں کے اجاروں کو فروخت کر کے لاکھوں وصول کیا گیا" [خوافی خاں (2) 773] (تقریباً)

دنوں بعد اجارہ کے طریقہ کو مملکت کے لئے تباہ کن ہونے کے باعث رد کر دیا گیا تھا [(2) 948] لیکن یہ زیادہ عرصہ تک بند نہ رہا۔

37۔ "سرکاری ضوابط نامے" (دستور العمل) اورنٹل 1779 اور 1842 ، اڈیشنل 6588 ۔

38۔ اکبر نامہ (3) 457 ۔ بادشاہ نامہ (1) (2) ' 287 ۔

یہ کام مرشد علی خاںؒ نامی ایک عہدہ دار کے سپرد کیا گیا، جسے پہلے تو دو جنوبی صوبوں کا پھر پورے خطہ کا دیوان مقرر کیا گیا، وہ ایک غیر ملکی یعنی خراسان کا باشندہ تھا جو

باب ⑤

شمالی ہندوستان میں دور آخر

۱۔ تمہید

شمالی ہندوستان میں مسلم زرعی نظام کے آخری دور کا مطالعہ خاص طور پر حکومت کے اس نظم ونسق کی ابتدائی کارروائیوں میں کرنا چاہیے جو مسلم اقتدار کے ختم ہونے پر وجود میں آئیں۔ اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ موزوں علاقہ ملک کا وہ حصہ ہے جو انیسویں صدی کے آغاز پر حوالہ کیے ہوئے (CEDED) اور 'فتح کیے ہوئے' صوبوں کے نام سے موسوم تھا بشمول "صوبہ یا زمینداری بنارس" یعنی موجودہ اصطلاح کی رو سے صوبۂ متحدہ بہ استثنائے اودھ، کمایوں اور اجزائے بندیلکھنڈ۔ اس علاقہ کے متعلق موجود تحریریں اس مقصد کے لیے کافی تصور کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ نامکمل اور ناقابل اعتبار بھی ہیں۔ لہذا صحیح صورت حال کی قدرے تفصیلی وضاحت مناسب ہوگی۔

اس خطہ کے سب سے شروع کے انگریز انتظامی عہدہ داران لازماً مقامی حالات سے ناواقف تھے اور ان کی کارروائیاں بنگال اور بہار میں حاصل کیے گئے تجربہ پر مبنی احکام کے تابع تھیں اور یہ تجربہ بعض پہلوؤں سے بہت زیادہ گمراہ کن تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انتظامیہ کا بنیادی کام زمین کی پیداوار میں حکومت کے حصہ کی وصولی کا انتظام کرنا تھا اور کلکتہ سے جاری کیے گئے احکام کے تحت ان کے سپرد پہلا کام یہ کیا گیا تھا کہ وہ زمین کے مالکوں کو تلاش کرکے بنگال میں اختیار کیے گئے طریقہ کے مطابق ان کے ساتھ وصولی کا بندوبست کریں۔ لیکن اس سوال کا کہ زمین کا مالک کون ہے، کوئی متعین جواب نہ دیا جاسکتا تھا۔ اول تو وہ حقوق جو

مجموعی طور پر ملکیت کے، جیسا کہ انگریزی زبان میں اس کا مفہوم ہے، مصداق ہوتے ہیں، معمولاً ایک شخص کو حاصل نہ تھے بلکہ یہ زمین سے تعلق رکھنے والے مختلف فریقین کے درمیان بے قاعدہ طور پر تقسیم تھے۔ دوسرے مغلیہ انتظامیہ کے انتشار سے ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا جس میں حق سے زیادہ طاقت کی اہمیت تھی۔ جیسے جیسے منتظمین کا حقائق سے زیادہ قریبی رابطہ قائم ہوا، انھیں بتدریج معلوم ہوا کہ اہم کام معدوم مالکان زمین کا تلاش کرنا نہیں، بلکہ پیداوار زمین سے استفادہ کرنے والے مختلف فریقین کے حقوق اور مفادات کو متعین کر کے ان کا احترام کرنا ہے۔ لیکن اس مرحلہ تک پہنچنے کے قبل بہت سے مشتبہ حقوق تسلیم اور بہت سے موجود حقوق مسترد کیے جا چکے تھے۔ لہٰذا حقوق کا پہلا باضابطہ رکارڈ، مسلم عہد کے اختتام پر پائی جانے والی صورت حال کا صحیح عکاس نہ تھا۔

ملک کے باشندوں عموماً درمیانی اشخاص کے اہم طبقوں کا رویہ اس نتیجہ کے ظاہر ہونے میں معنوی حیثیت سے معاون ثابت ہوا اور جیسا کہ پچھلے باب میں گذر چکا ہے، مغلیہ اقتدار کے زوال سے ان طبقوں کے درمیان بظاہر ایک گمراہ کن یکسانیت پیدا ہو گئی تھی۔ جاگیروں کی اہمیت گھٹ گئی تھی اور مالگذاری کے اجارے نسبتاً زیادہ مدتوں کے لیے دیئے جانے لگے تھے جو عملی طور پر موروثی بن جانے کی طرف مائل تھے۔ ایک موروثی اجارہ دار کی حیثیت اصلاً ایک سردار کی حیثیت کے بہت زیادہ مماثل معلوم ہوتی ہے اور سرداران اور اجارہ داران دونوں ہی اپنے حلقۂ اثر کو بڑھانے میں بہت زیادہ مصروف تھے۔ وہ اپنے ماتحت علاقوں میں جائز اور نیز ناجائز طریقوں سے ان مواضعات کے کسانوں کو شامل کر رہے تھے جو محض یہ چاہتے تھے کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور وہ شاہی حق وحصہ کو کسی بھی ایسے شخص کو جو انھیں باہری مداخلت سے محفوظ رکھنے کے بادشاہ کے فرض کی انجام دہی کا ذمہ دار ہو جائے ادا کرنے پر تیار تھے۔

انگریز انتظامی عہدہ داران کے تلاش کرنے پر، معمولاً یہی درمیانی اشخاص تھے جنھوں نے اپنے کو مالکان زمین کے طور پر پیش کیا ان میں سے کم از کم بعض نے شروع ہی سے سمجھ لیا تھا کہ انگریز ایک نیا اور غالباً مستحکم نوعیت کا حق ملکیت دے رہے تھے اور بادشاہت تک پہنچانے والے راستہ پر چلنے والوں نے جب بادشاہت کو اپنی دسترس سے باہر پایا تو قدرتی طور پر وہ حقوق ملکیت کے حصول میں کوشاں ہوئے۔

دوسری طرف کسان آگے بڑھنے میں کچھ تو اپنی جہالت کے باعث اور کچھ اس وجہ سے کہ انھیں کچھ برسوں کی مدت کے لیے موجود معیار پر مبنی نقد مالگذاری جس میں ناموافق موسموں کے لیے کوئی گنجائش نہ رکھی گئی تھی ادا کرنے کی پابندی قبول کرنے کے لیے کہا جا رہا تھا سُستی دکھا رہے تھے۔ شروع میں بہت سے مشتبہ حقوق تسلیم کیے گئے۔ لیکن نئے "مالکان" اکثر اپنی قرار کی ہوئی مالگذاری کو ادا نہ کرتے اور فی الفور بے دخل کر دیے جاتے اور تھوڑے عرصہ تک پوری صورتِ حال غیر یقینی رہی۔ اس عہد اور نیز استحکام کی طرف تدریجی سفر کی تفصیلات اس مقالہ کی حدود کے باہر ہیں۔ میرے ان موضوعات کے ذکر کرنے کا واحد سبب یہ ہے کہ اس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ میرے لیے مسلم عہد کے اختتام پر صورتِ حال کی مقداری کیفیت کے قسم کی کسی چیز کو پیش کرنا اور یہ صحیح صحیح بیان کرنا کہ کن کن ضلعوں یا پرگنوں میں کن کن حقوق کے تحت قبضہ تھا اور یہ کہ زرعی زمین کے کون کون سے حصّوں پر کون کون سی ادائیگیاں اور خدمتیں عائد ہوتی تھیں کیوں ناممکن ہے۔

مقدار سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، برطانوی حکومت کے ابتدائی عہد کی صورتِ حال کو بیان کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن اس مقصد کے لیے قابلِ حصول تحریریں، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے ناقابلِ اعتبار ہیں اور یہ کسی طالب علم کے سنگین غلطیوں میں مبتلا ہو جانے کو بہت آسان بناتی ہیں۔ حسبِ معمول خاص دقت اصطلاحیات کی ہے۔ سب سے شروع کے انتظامی عہدہ داران اپنے ہمراہ بنگال کے اصطلاحی الفاظ جہاں تک وہ فراہم کر سکے تھے، لائے تھے اور وہ ان کا ان چیزوں پر اطلاق کرتے تھے جو انھیں اصل کے مطابق معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن ظاہری شکلیں بعض اوقات گمراہ کن تھیں۔ ایسی چیزیں سامنے آئیں جن کے لیے بنگال میں کوئی نام نہ تھے۔ الفاظ کے مختلف مقامات پر اور وقت گذرنے کے ساتھ مختلف عہدہ داروں کی زبانوں پر مختلف معنی ہو گئے تھے اور اس سلسلہ میں الجھن اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری ہولٹ میکنزی نے ۱۸۱۹ء میں تجویز کیا کہ ضابطوں کے اجراء کے سلسلہ میں مناسب ہوگا کہ "بنائے ہوئے الفاظ استعمال کیے جائیں خواہ وہ بے ڈھنگے ہی کیوں نہ معلوم ہوں اور پہلے سے مستعمل اصطلاحوں کے استعمال سے جب تک کہ پورے ملک میں ان کی عام قبولیت کے متعلق پورا اطمینان نہ ہو جائے مکمل پرہیز کیا جائے۔" اس بلند بانگ مشورہ پر عمل نہ کیا گیا اور نہ ہی کسی صورت میں یہ پہلے سے موجود ریکارڈوں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ مگر اس مشورہ کا دیا جانا خطرہ کی نشاندہی کے لیے

کافی ہے۔ کوئی طالب علم جو کسی خاص واقعہ کی تلاش کے سلسلے میں اس عہد کی تحریروں کا غائرانہ مطالعہ کرتا ہے غالباً گمراہی کا شکار ہو جائے گا۔ یہ ضروری ہے کہ ایک آنکھ کو مستقبل پر اور دوسری کو ماضی پر رکھتے ہوئے فنی اصطلاحوں کی تعبیر کر کے ہر تحریر پر فی الجملہ عبور حاصل کیا جائے۔ مصنف کی انفرادیت اور اس کے معلومات اخذ کرنے کے علاقہ دونوں کا لحاظ رکھا جائے اور معنی کے متعلق پہلے سے قائم کیے ہوئے خیالات کو ترک کر دیا جائے اور کبھی کبھی فیصلہ کو فی الوقت ملتوی رکھا جائے۔ مثل پچھلے ابواب کے آنے والے بیان میں، میں نے جہاں تک ممکن ہو سکا گمراہ کن مفہوم نہ رکھنے والی اصطلاحوں کو منتخب کر کے اور میں نے جس مفہوم میں انھیں استعمال کیا ہے اس کی وضاحت کر کے غلط فہمی کے خطرہ کو گھٹا کر کم سے کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

موضع کی تنظیم

یہ توقع کی جاتی ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز پر حوالہ کیے ہوئے اور فتح کیے ہوئے صوبوں میں علاوہ کاشت کرنے والے کسانوں کے، باشندوں کے تین طبقے یعنی بغیر زمین کے مزدور، ملازمین موضع اور خیرات پانے والے آباد رہے ہوں گے۔ بغیر زمین کے مزدوروں کا طبقہ، مثل ان دنوں کے اس وقت بھی پھیلا ہوا اور معاشی اعتبار سے بہت زیادہ اہم تھا۔ لیکن یہ طبقہ بغیر زمین کا ہونے کے باعث ہماری موجودہ بحث کے دائرہ کے باہر ہے۔ ان کے سلسلے میں، محض اس قدر لکھنا کافی ہونا چاہیے کہ جہاں تک اندازہ کرنا ممکن ہے وہ شاذ و نادر آزاد اور مشکل ہی سے کبھی غلام ہوا کرتے۔ ہم انھیں غالباً ایک طرح کی معتدل قسم کی زرعی غلامی کا تابع تصور کر سکتے ہیں جس کے واقعات وسیع حدود کے اندر تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ موضع کے ملازمین کو ان طریقوں سے معاوضہ ادا کیا جاتا تھا جن پر قدامت کی چھاپ پڑی ہوئی تھی۔ وہ معمولاً کسان کی پیداوار میں حقدار ہوتے تھے جس کی تشخیص بعض اوقات رقبۂ زیر کاشت پر، بعض اوقات جمع کی ہوئی پیداوار پر اور بعض اوقات ہل پر جو اس پیشہ کی قدیم ترین مسلمہ اکائی ہے ہوتی تھی۔ ان کے حقوق کو بعض اوقات نقد مگر زیادہ تر پیداوار کی شکل میں پورا کرتے تھے اور ان کے فصلی یا سالانہ مطالبات کے علاوہ انھیں موضع کی تھوڑی بہت زمینوں کو کاشت کرنے کی اجازت تھی جس کی پوری پیداوار کے وہ مالک ہوا کرتے۔ ان ملازمتی آراضیداری کے مثل داد دہش میں دی گئی زمینیں ہوا کرتیں۔ ان پر قابض اشخاص بھی پوری پیداوار سے مستفید ہوتے

اور بادشاہ کے حصّہ کے طور پر کچھ ادا نہ کرتے۔

ملازمتی اور داد و دہش کی آراضی داریاں اس عہد میں عام تھیں۔ لیکن عام مواضعات میں وہ کل زمین زیرِ کاشت کا ایک بہت ہی مختصر جزو ہوتیں۔ ان کا بہت بڑا حصّہ کسانوں کے قبضہ میں رہا کرتا جو تین طبقوں کے تحت آتے ہیں۔ منظم جماعتیں جنھیں میں برادریوں کے نام سے موسوم کروں گا گاؤں میں آباد مگر برادری کے باہر کے کسان اور وہ کسان جو کسی دوسرے موضع کے رہنے والے، مگر یہاں کام کرنے کے لیے آتے ہوں۔ غیر سکنی کسان کی حیثیت خالصتاً ٹھیکے داروں کی ہوا کرتی۔ منتظمین موضع جن کے پاس فاضل زمین ہوتی باہری کسانوں سے ان پر کاشت کرانے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ کسی قریبی گاؤں کے کسانوں کو مخصوص شرائط پر کاشت کرنے کے لیے آمادہ کیا جا سکتا تھا اور فریقین کی نظریات کے مطابق آپس میں معاملہ طے ہو جایا کرتا تھا۔

گاؤں میں آباد لیکن برادری کے باہر کے کسانوں کی حیثیت کم واضح تھی۔ اس زمانہ کی بعض اطلاعوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں لگان کی مقررہ شرطوں پر اپنے قبضہ کو قائم رکھنے کا حق حاصل رہا کرتا۔ دوسری اطلاعوں کے مطابق وہ اپنے قبضہ کو حسب الطلب لگانی شرحوں کی ادائیگی پر برقرار رکھ سکتے تھے۔ لیکن بیشتر اطلاعوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ہر آنے والے سال کے خاتمہ پر لائق بے دخلی ہوا کرتے۔ زیادہ ممکن ہے کہ یہ متناقض اطلاعیں اصلاً مقامی تفاوت کی مظہر ہوں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر جو بھی خیالات ظاہر کیے گئے تھے وہ اس عہد میں بیشتر نظری تھے۔ زمینیں کسانوں کے انتظار میں پڑی رہا کرتیں اور جب تک یہ صورتحال قائم رہتی، عملاً کسی بڑے پیمانہ پر کسانوں کے حقوق کا سوال نہ پیدا ہوتا۔ قطع نظر اس امر کے کہ کوئی منتظم کسان کو بے دخل کر سکتا تھا یا نہیں، ایسی صورت میں کہ کوئی شخص اس کی جگہ لینے کے لیے موجود نہ ہو، ایسا کرنا ایک احمقانہ فعل ہوتا۔ متعدد اطلاعوں کا یہی خلاصہ ہے اور دیگر ماخذ سے بھی زمین کے لیے کسی مقابلہ کی غیر موجودگی بدرجۂ اتم ثابت ہوتی ہے۔ اس عہد میں عمل طریقہ یہ تھا کہ یہ کسان منتظمین کے ساتھ معمولاً سال میں یا فصل میں ایک بار معاملہ کر لیتے تھے اور اکثر تحریری اقرار ناموں کا باہمی تبادلہ ہوتا تھا۔ موجودہ آراضیات ٹھیکہ کے علاوہ دیگر زمینوں کے لیے کسان معمولاً زیادہ مدت کے لیے اپنے کو پابند کرنے پر رضامند نہ ہوتے۔ ان کا یہ رویہ ایسے ایام میں جب زراعت کے قدرتی خطرات کے ساتھ ساتھ ملک میں بدامنی کے

خطرات بھی موجود تھے بلاشک قرینِ مصلحت تھا۔ پس بہ اعتبار نتیجہ ان کسانوں کی حیثیت ٹھیکہ دارانہ تھی، گو کہ پچھلے زمانہ کی روایات غالباً شرائط ٹھیکہ پر اثر انداز ہوا کرتیں۔ یہ روایات ایسی تھیں جو دیگر حالات میں واضح حقوق اور ذمہ داریوں کی شکل اختیار کر سکتی تھیں۔

موجود تحریروں سے اس بیان کا جواز نکلتا ہے کہ ان دنوں برادری جملہ مواضعات میں تو قطعاً نہیں، مگر بیشتر میں پائی جاتی تھی۔ یہ ادارہ ایسے متعدد کسانوں پر مشتمل ہوتا جو ایک مشترک خاندانی رشتہ میں منسلک رہتے۔ اس کا ہر فرد اپنی زیر کاشت زمین پر جداگانہ قابض رہا کرتا۔ لیکن پوری برادری اجتماعی طور پر اپنے نمائندوں کے ذریعہ گانوں کے معاملات کا انتظام کرتی اور اس شخص کو مالگذاری ادا کرتی جو اس کے پانے کا حق دار ہوتا۔ برادری کے افراد عام طور پر تقسیموں اور ذیلی تقسیموں کے زمروں میں ایک ایسے ڈھانچہ پر بٹے ہوئے تھے جو ہندو قانون وراثت کا واقعی یا کم از کم خیالی طور پر مظہر رہا کرتا۔ ایسی زمین جو برادری کے کسی فرد کی ملکیت میں نہ ہو وہ کسی تقسیم یا ذیلی تقسیم کے افراد یا پوری برادری کی مشترکہ ملکیت ہو سکتی تھی۔

اس زمانہ میں اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ مختلف ذیلی تقسیموں یا افراد کے ساتھ مخصوص کیے گئے رقبے، ان رقبوں کے بالکل مماثل نہ تھے جو انھیں قانون وراثت کے تحت ملتے۔ چنانچہ ایک ذیلی تقسیم کے لیے جو مثلاً موضع کے ایک چوتھائی کے طور پر درج ہو ضروری نہ تھا کہ اس کا رقبہ ایک چوتھائی ہو۔ اس فرق کی دو توجیہات درج تحریر تھیں جن میں سے دونوں غالباً کسی نہ کسی موضع پر صادق آتی تھیں۔ پہلی توجیہہ یہ تھی کہ تقسیم میں زمین کی قسم اور نیز رقبہ کا لحاظ رکھا جاتا تھا چنانچہ رقبہ میں زیادتی، قسم کی خرابی کے معاوضہ کے طور ہوا کرتی۔ دوسری توجیہہ کو کمشنر[1] آگرہ کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے: "طاقتوروں اور عیاروں نے پچھلے اور موجودہ دنوں میں بیشتر اوقات کمزوروں اور سیدھے سادے لوگوں پر قابو حاصل کر لیا ہے۔ حصہ کے حق داروں کی غیر موجودگی یا بعض سکنی مالکوں کی (کم عمری یا کسی دیگر سبب سے) عدم صلاحیت کی بنا پر دوسروں نے مالگذاری داخل کرنے یا انتظام کرنے کے بہانہ سے اپنے موروثی حق سے بہت زائد حصوں کو حاصل کر کے قبضہ کر لیا ہے۔ اس مقام پر ہم ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں جو اس وقت بھی گانوں کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ یعنی برادری کے چند افراد ایک غالب گروہ کی حیثیت اختیار کر کے اپنے کمزور بھائیوں کے مفاد کے خلاف عمل کرتے

ہیں۔ بعض وقت تصور پسندوں نے ماضی کے ہندوستانی مواضعات کو ایسی چھوٹی چھوٹی متحدہ جمہوریتوں کی شکل میں پیش کیا ہے جن میں ہر فرد کے حقوق محفوظ تھے۔ لیکن ان میں مثلِ ان دنوں کے بہت زیادہ انسانی کمزوریاں پائی جاتی تھیں اور ہمیں ان کی نوعیت میں پائے جانے والے تنوع کا لحاظ رکھنا ہوگا جو کسی بھی ایسے کلیہ کو غلط ثابت کرتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مثل ان دنوں کے ماضی میں ہر طرح کے مواضعات پائے جاتے تھے۔

برادری کے کاموں کو منتظمین یا چودھری انجام دیتے تھے۔ معمولاً ایک چودھری ہی ہر بڑی تقسیم کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس عہدہ کو مختلف طریقوں سے بھرتے تھے مگر معمولاً اس کے موروثی ہونے کا رجحان پایا جاتا تھا اور شریک داران انھیں نااہلی کی بنا پر تبدیل کر سکتے تھے چودھری ایسے کسانوں کے معاملات کو دیکھتا تھا جو برادری کے باہر تھے وہ مشترکہ اخراجات کو پورا کرتا تھا اور مطلوبہ رقم کو ایسے طریقوں سے جو ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہوتے وصول کرکے مالگذاری ادا کرتا۔ ایک باضابطہ برادری کے اندر سالانہ حساب طے کیے جاتے، جس میں اس کے ارکان شرکت کرتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں چودھری کا عہدہ ایسا نہ تھا جو ہمیشہ پسند کیا جاتا ہو، جیسا کہ آگے آئے گا مالگذاری کا نرخ بہت اونچا تھا یعنی پیداوار کا تقریباً نصف۔ اس کی ادائیگی کے لیے درمیانی حکام کی نگاہ سب سے اول چودھری کی طرف جاتی تھی اور عدم ادائیگی کی علت میں انھیں جسمانی سزا دی جا سکتی تھی۔ ایک عام انسان جس کے قبضہ میں زیادہ زمین ہوتی وہ اس عہدہ کے مروجہ معاوضہ اور بالائی حقوق کے خاطر، اس کے خطرات میں اپنے کو مبتلا کرنے پر اکثر رضامند نہ ہوتا تھا اور مسلم عہد کے آخری ایام میں، چودھری اکثر یا تو نادار یا پھر غیر معمولی قوت کے مالک اشخاص ہوا کرتے۔ کسی ایسے شخص کو جس کا موضع سے بہت ہی تھوڑا مفاد وابستہ ہوتا برائے نام چودھری مقرر کر دیتے۔ اگر اس کے عہدہ کے لیے کوئی واقعی خطرہ پیدا ہو جاتا تو وہ بھاگنے کے لیے تیار رہا کرتا۔ یا پھر بصورت دیگر اس عہدہ کو کوئی ایسا شخص قبول کرتا جو اس قدر طاقت کا مالک ہو کہ وہ اسے اپنے ذاتی مفاد میں تبدیل کر سکے۔ چنانچہ غاصب چودھری اس زمانہ کی ایک امتیازی ہستی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے متعلق یہ قیاس کرنا کہ وہ پہلی بار اس عہد میں نمودار ہوا ایک عاجلانہ فیصلہ ہوگا۔ ۱۷۹۴ء جوناتھن ڈنکن کے حکومت کو بھیجے گئے مراسلہ کے حسب ذیل اقتباس میں اس کا مکمل تو بن بیان ملتا ہے۔

SOMBANSI RAJ اس مختصر سی دلچسپ تحریر میں پرتاب گڈھ کے سرداروں کی روائتی تاریخ کو تیرہویں صدی سے شروع کر کے جبکہ لکھن سین نے اپنے لیے ایک تعلقہ قائم کیا تھا اس میں مسلسل بیس پیڑھیوں کے سرداروں کی جانشینی کا تذکرہ درج کیا گیا ہے بنٹ کی تصنیف CHIEF CLANS OF THE ROY BAREILLY DISTRICT (نظر ثانی کی ہوئی طباعت لکھنؤ ۱۸۹۵ء) اور ایلیٹ کی تصنیف CHRONICLES OF OONAO (الہ آباد ۱۸۶۲ء) بھی ملاحظہ ہوں۔

شلہ بالائی دوآب کے متعلق شروع کی انگریزی تحریروں میں 'بلاہر' یا موضع کے خدمتگار کا بھی حوالہ ملتا ہے۔ یاد ہوگا کہ علاءالدین خلجی کے ضابطوں میں دیہی آبادی کے سب سے نچلے طبقہ کے نمائندہ کے طور پر 'بلاہر' کا ذکر ملتا ہے۔

۹لہ آئین (۱)، ۲۸۶۔ جیرٹ کا عبارت [(۲) ۴۵] کا ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ آئین کے اس حصّہ کے مولف نے موضع کے سر برآوردہ لوگوں کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں: مقدم، کلاں تران دیہہ، رئیس دیہہ، وغیرہ۔ مختلف عبارتوں کی جانچ سے ان اصطلاحوں میں کسی فرق کا پتہ نہیں چلتا اور میں انھیں آئین کے اس حصّہ کی ایک عام خصوصیت کی ایک مثال تصوّر کرتا ہوں یعنی یہ کہ مرادفات کے آزادانہ استعمال سے اسلوب تحریر میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش۔

باب ⑦

دُور دراز خطے

۱ - دکن

میں امید کرتا تھا کہ میں اس مقالہ کو ان مختلف صوبوں کے زرعی نظاموں کے بیان پر ختم کروں گا جو دہلی کی پہلی مسلم بادشاہت کے انتشار پر وجود میں آئے۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لیے جس مواد تک میری رسائی ہو سکی وہ بہت قلیل ثابت ہوا۔ مالوہ کے متعلق مجھے ایک عبارت کے علاوہ کچھ اور نہ مل سکا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سولہویں صدی کے ابتدائی حصہ میں وہاں جاگیریں عام تھیں اور گجرات کے متعلق قابل حصول سرگذشتوں سے ہمیں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ خود مختاری کے دنوں میں اس علاقہ کا بہت بڑا حصہ جاگیرداروں اور باجگذار سرداروں کے ہاتھوں میں تھا۔ ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی مجھے کوئی ایسا ہمعصر تذکرہ نہ مل سکا جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کے مقامی سلطانوں کے تحت کسانوں کی کیا حیثیت تھی اور ساتھ ساتھ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آئین میں ان دونوں صوبوں کے مندرج حالات غیر واضح ہیں۔ لہذا مغلوں کی فتح کے وقت وہاں جو حالات تھے ان کے متعلق ان پر اعتماد کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ لہذا ہمیں ان دونوں بادشاہتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے، اس باب کو دکن اور بنگال کے دو خطوں تک محدود رکھنا چاہیے

دکن کی اصطلاح ، نظم ونسق کی ایک واضح اکائی کو نہیں بلکہ ایک جغرافیائی خطہ کو ظاہر کرتی ہے اور ہمیں اس کی تعبیر کسی مخصوص عہد کے واقعات کے اعتبار سے کرنی ہو گی لیکن مسلم وقائع نگاروں کے الفاظ میں یہ معمولاً اس تمام علاقہ کا مصداق تھا جو دریائے نربدا کے

دوسرے مواضعات کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

۱۲ دہلی رکارڈس، ص ۱۴۲۔

۱۳ روہیل کھنڈ میں ان شرحوں کو ضبطی کہتے تھے۔ یہ اصطلاح اب تک موجود ہے۔ ہم اسے بلا تردد اکبر کے ترقی یافتہ نظامِ مال کے سرکاری نام 'ضبط' سے پکار سکتے ہیں جس کی امتیازی خصوصیت پیداوار کے ساتھ تبدیل ہوتی ہوئی نقدی شرحیں تھیں۔ جو فصلیں نقدی شرحیں ادا کرتیں، معمولاً (۱) گنا اور نیل جنھیں کاٹنے کے ساتھ ساتھ مکمل کرنا ہوتا تھا (۲) پوستہ اور ترکاریاں اور باغ میں اگائی جانے والی فصلیں جنھیں روزانہ کاٹنا ہوتا تھا، تھیں۔

۱۴ مہندی علی خاں کی رپورٹ بنام جوناتھن ڈنکن ریوینو سلیکشنز (۱)، ۱۷۰۔ اس بیان کی کہ رقبہ کی ایک خاص اکائی کے استعمال کا مقصد صحیح حالات پر پردہ ڈالنا تھا، تردید قیاسی بنیادوں پر بیڈن پاول نے کی ہے THE LAND SYSTEMS OF BRITISH INDIA, ii, 138) اس کی دلیل یہ تھی کہ سرکاری عملہ رقبوں کی بالکل فکر نہ کرتا تھا۔ ان کے یہاں غالباً پیمائش نہ تھی بلکہ موضع کی ایک روایتی تشخیص تھی ... انھیں اس بات کی ذرا پرواہ نہ ہوتی کہ ہر شریک دار کے پاس کس قدر زمین تھی۔ وہ صرف پورے مطالبہ کی ادائیگی کی فکر رکھتے تھے" لیکن اورنگ زیب کے فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سالانہ تشخیص کے سلسلہ میں رقبہ کے اعداد کا برابر لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اس طور پر اس کی قیاسی دلیل بے اثر ہو جاتی ہے۔ فرمانوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری عملہ کو حسابات موضع کا لحاظ رکھنے کا حکم تھا۔ لہذا یہ نتیجہ نکالنا واجب ہوگا کہ مہندی علی خاں یہ لکھتے وقت صحیح صورت حال سے واقف تھا کہ اس خاص اکائی کے استعمال کا "مقصد یہ تھا کہ اگر حکومت یا عامل کبھی ان کے پٹواری کے حسابات کو طلب کرتے تو ان کے مواضعات کے منافع کی صحیح مقدار کا پتہ نہ چل سکے"

۱۵ یہ عمل جسے مرصّع عبارت میں آراضی پر قبضہ دلانا بیان کرنے کا رواج تھا ٹھیک عام نہ تھا اور مجھے یہ جمنا کے مغرب میں نہیں ملتا۔ علاقہ دہلی میں 'فورٹس کیو' کے قول کے مطابق کسان اپنی حفاظت کی خود تنظیم کرتے تھے۔ (دہلی رکارڈس، ۱۱۱)

۱۶ ریوینو سلیکشنز (۲)، ۳۲۸ و صفحات مابعد۔

۱۷ ملاحظہ ہو، مثلاً لشمبھ ناتھ کھوسلہ (کانپور ۱۹۰۰ء) کی تصنیف HISTORY OF

۷ے ریونیو سلکشنز (۲)، ۳۴۲۔

۷ے چودھری کا معمول کا نام مقدم تھا لیکن مقدم ان مواضعات میں پائے جاتے تھے جن میں برادریاں نہ ہوتی تھیں۔ یہ اصطلاح برطانوی عہد کے شروع ہی میں غیر مقبول ہو گئی کیونکہ لوگوں کے خیال کے مطابق ان کے حکمراں اس سے غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کی جگہ مخلوط اصطلاح "نمبردار" نے لے لی جواب "لمبردار" کے طور پر زبان میں داخل ہو گیا ہے۔

۸ے ریونیو سیلکشنز (۱)، ۱۶۹۔ ظاہر ہے کہ اس بیان کے مصنف کا "زمیندار" سے برادری کے اندر کے اور "رعیت" سے برادری کے باہر کے کسان کا مفہوم تھا۔ "پوٹہ" (پٹہ) ان اشخاص کو دیئے گئے دستاویزات ہوتے تھے جو مالگذاری ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتے۔

۹ے دہلی رکارڈس، ۶۹ صفحات وما بعد۔ مذکورہ بالا متن کا اقتباس پیرا ۱۹۰ سے شروع ہوتا ہے۔

۱۰ے ایسے سربراہ کاران کاغذات میں مقدم کے نام سے ملتے ہیں۔ کسی برادری کے ارکان کے منتخب کیے ہوئے چودھریوں کو بھی مقدم کہتے تھے۔ اگر کسی موضع پر اس کے باہر سے نگاہ ڈالی جائے تو سربراہوں کے ان دونوں اقسام کی مشابہت واضح ہوتی ہے، کیونکہ ان کے فرائض منصبی عملاً ایک دوسرے کے مماثل معلوم ہوتے ہیں۔ موضع کے اندر بحیثیت برادری کے نمائندہ کے چودھری اور، اوپر سے عاید کیے ہوئے سربراہ کار میں ایک بین امتیاز ہے۔

۱۱ے متن میں، میں نے دیہی تنظیم کے اہم خطوط پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی ہے اور مختلف مستثنیات اور بے ضابطگیوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ان میں سے دو کا بہر حال ان کی تاریخی دلچسپی کے باعث ذکر کیا جا سکتا ہے (الف) بعض صورتوں میں ایک موضع میں مختلف ذاتوں کی دو برادریاں پائی جاتی تھیں۔ یہ انتظام غیر مستقل معلوم ہوتا ہے ؛ یا تو ایک برادری بالآخر دوسری کو بے دخل کر دیتی تھی یا پھر موضع موجودہ پیشہ کی بنیاد پر دو میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ ایسی تقسیمیں ان مواضعات کی جنھیں اب کھیٹ بٹ موضع کہتے ہیں توجیہہ فراہم کرتی ہیں جن میں ایک واحد نقشہ دو موضعوں کی زمینوں کو جن میں کھیت ایک دوسرے میں ملے جلے ہوئے ہوں، ظاہر کرتا ہے۔ (ب) بعض صورتوں میں ایک برادری ایک موضع سے زائد بہت بڑے رقبہ پر پھیلی ہوئی ہوتی تھی، غالباً اس وجہ سے کہ اس کے تصرف کو ایک متوسط علاقہ پر قائم رہنے دیا گیا تھا یا بصورت دیگر اس نے بتدریج ابتدائی موضع سے ملحقہ

جنوب مغرب میں نچلے دوآب پر مشتمل تھے۔ ایک سال بعد فرخ آباد کا اضافہ ہوا۔ "فتح کیے ہوئے صوبوں" میں بقیہ دوآب اور دریائے جمنا کے مغرب کے چھوٹے علاقے شامل تھے اور بندیل کھنڈ کے کچھ حصے تقریباً انھیں دنوں حاصل کیے گئے تھے۔

؎۲ ریونیو سلکشنز۔ (۱)، ۱۳۱۔ ان کاغذات کے اندر چھپے ہوئے خطرات کی مثالوں کے طور پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خود کاشت کی معروف اصطلاح کو اکثر زمینداروں کی مزروعہ زمین کے موجودہ مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن زیادہ تر اس کے معنی ایسے سکنی کسان کے زیرِ قبضہ زمین کے ہوتے ہیں جو زمیندار نہ ہو۔ بقول میکنزی، اسامی کا اطلاق کسانوں کے دو مختلف طبقوں پر ہوتا ہے۔ جس بات کا وہ ذکر نہیں کرتا یہ ہے کہ وہ خود لفظ زمیندار کو کم از کم تین مفہوموں میں استعمال کرتا ہے، یعنی (الف) میں جنھیں سردار کہتا ہوں (ب) کسانوں کے ایک مخصوص طبقہ (ج) ایسے اشخاص خواہ وہ کسی طبقہ کے ہوں جو کسی موضع کی مالگذاری کے ٹھیکے کے مجاز تھے۔

؎۳ سوائے ان صورتوں کے جہاں دیگر حوالے آئے ہیں، موجودہ اور آنے والی فصلوں میں جن واقعات کا خلاصہ درج ہے وہ ان تین جلدوں میں ملیں گی یعنی ڈنکن رکارڈس اور ریونیو سلکشنز جلد ۱ و ۲۔

؎۴ جن کسانوں پر برادری مشتمل ہوا کرتی انھیں تحریروں میں موضع کے زمیندار، پٹی داران، شریک داران یا شرکا ر وراثت بیان کیا گیا ہے۔ بعض اوقات ان کا فی الجملہ "دیہی برادری" کے طور پر حوالہ آیا ہے۔ لیکن اکثر اس اصطلاح میں آبادی کے دیگر عناصر بھی شامل رہتے ہیں اور اس ابہام کے علاوہ اس کے اتنے اور مبہم مفہوم ہو گئے ہیں کہ میں اس کے استعمال سے پرہیز کرتا ہوں۔ لفظ "برادری" کبھی کبھی تحریروں میں کسی اور مفہوم میں نہیں بلکہ میرے مقصود کے مطابق استعمال ہوا ہے۔ غیر سکنی کسان مثل ان دنوں کے پاہی کاشت کہے جاتے تھے لیکن مختلف املا کے ساتھ (مثلاً پائی کوست)۔ سکنی کسان یا تو مثل ان دنوں کے چھپر بند، یا پھر خود کاشت کہے جاتے تھے۔

؎۵ بطور ایک مثال کے ۱۷۹۴-۹۵ء میں ٹوائنگ کے اپنے دہلی سے فتح گڑھ کے سفر کے بیان کا حوالہ دیا جاسکتا ہے TRAVELS IN INDIA A HUNDRED YEARS AGO (LONDON, 1893) حصہ ۲۔

تھے مجھے کوئی سند نہیں ملی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی وقت برادری ایک عمومی ادارہ رہا ہو اور ایسی جملہ صورتوں کی توجیہہ جن میں یہ نہیں پائی جاتی انتشار کی علامت سے کی جاسکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں نئے مواضعات ایسے حالات میں قائم کیے گئے جن میں کوئی برادری وجود میں نہ آسکی۔ لیکن کسی سند کی غیر موجودگی میں ان متبادل صورتوں پر قیاس آرائی بے سود ہوگی۔

اب یہ باقی رہ جانے والا سوال بھی یعنی مسلم عہد کے دوران برادری کے باہر کے سکنی کسانوں کی موجودگی ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر مجھے کوئی براہ راست شہادت نہ مل سکی۔ میرے خیال میں اس سلسلہ میں اہم ترین واقعہ پورے شمالی ہندوستان میں ایسی ذاتوں کا وسیع پھیلاؤ ہے جنھوں نے پیداوار افزا کاشت کاری میں مہارت حاصل کی ہے: ارئیں، مالی، کچھی، کوئری۔ یہ قابلِ قیاس ہے کہ یہ پھیلاؤ نسبتاً قریبی زمانہ میں واقع ہوا ہو، لیکن یہ اس سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان ذاتوں کی روایات، جن کا میرے علم میں اس نقطۂ نگاہ سے کبھی مطالعہ نہیں کیا گیا، اس مسئلہ کی کچھ وضاحت کرسکیں۔ لیکن فی الحال میں اسے ایک فیصلہ طلب مسئلہ کے طور پر چھوڑتا ہوں۔ فی الجملہ اس مروجہ نظریہ کا قبول کرلینا کہ برادری کا وجود پورے مسلم عہد کے دوران مواضعات کی ایک عام خصوصیت تھی، معقول معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ موجودہ معلومات کے پیشِ نظر یہ تصور صحیح نہ ہوگا کہ اس مفہوم میں کہ ہر موضع میں ایک برادری تھی، یہ ایک عمومی ادارہ تھا، یا اس مفہوم میں کہ اس کے حلقہ کے باہر سکنی کسان نہ پائے جاتے تھے یہ کوئی خودکفیل ادارہ تھا۔

حوالہ جات باب ■

لہ بنارس کی مالگذاری کی تاریخ ۱۷۸۰ء میں جوناتھن ڈنکن کے ریزیڈنٹ مقرر ہونے کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ اسے مالگذاری کا بندوبست کرنے پر مامور کیا گیا تھا اور اس کی کارروائیوں کو ۱۷۹۵ء کے بنگال ریگولیشن ۲ کے ذریعہ قانونی حیثیت دی گئی۔ "حوالہ کیے ہوئے صوبے" جن پر ۱۸۰۱ء میں قبضہ ہوا تھا اودھ کو تین سمتوں سے گھیرے ہوئے تھے اور یہ مشرق میں موجودہ گورکھپور کمشنری، مغرب میں روہیل کھنڈ اور جنوب و

جاسکتا کہ جملہ سرکاری اصطلاحیں بیک وقت معین کی گئی ہوں گی۔ پہلے گذر چکا ہے کہ ضیا برنی کے زمانہ میں زمیندار کے لفظ کو قطعی طور پر ایک سردار کے مترادف کے طور پر منتخب نہ کیا گیا تھا حالانکہ اس مفہوم میں اس کا استعمال شروع ہو چکا تھا اور مجھے شبہ ہے کہ اسی عہد میں مقدم کی اصطلاح ایک طرح سے موضع کے چودھری کے مترادف کی شکل اختیار کر رہی تھی پھر بھی اس کا ایک سربراہ یا کسی نمایاں شخص کا ایک غیر مخصوص مفہوم ہو سکتا تھا لیکن اسے جب کسی موضع کے سلسلہ میں استعمال کرتے تو اس کا عملاً ایک مخصوص مفہوم ہوا کرتا تھا۔ پس اس کا امکان پایا جاتا ہے اگرچہ اس کا کوئی باضابطہ ثبوت نہیں کہ موضع کے چودھری کا ادارہ پورے مسلم عہد کے درمیان قائم رہا اور اس کی ابتدا ہندو عہد سے ہوئی۔

اسی طور پر موضع کے محاسب (پٹواری) کے چند اتفاقی حوالے بھی بظاہر تسلسل کی قطعی شہادت فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً اورنگ زیب اور علاء الدین کے تحت ہم اس عہدہ دار کو گاؤں کے حسابات کو اس شکل میں مرتب کرتا ہوا دیکھ چکے ہیں جو انتظامی عہدہ داروں کے لیے بڑی قدر و قیمت کا حامل ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف اکبر کے اپنے محصلین کے لیے قائم کیے ہوئے ضابطے اسے ضمنی طور پر ایسے کاغذات کو مسلسل مرتب کرتا ہوا ظاہر کرتے ہیں جو تشخیص اور وصولی پر مامور عملہ کی روک تھام کا مقصد پورا کرتے تھے۔

ہم چودھری کے متعلق دلائل کو پورے وثوق کے ساتھ برادری پر منطبق نہیں کر سکتے کیونکہ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، مقدم کا لفظ مواضعات کے ہر قسم کے منتظمین پر حاوی تھا اور ایک طالب علم جو خلاء میں دلائل قائم کر رہا ہو یہ حجت لا سکتا ہے کہ مسلم عہد کے جملہ مقدم بلا برادری کے مواضعات کے منتظمین تھے یا بالفاظ دیگر اس وقت برادریوں کا وجود نہ تھا۔ ہم بہرحال اس وقت کا انتظار کر سکتے جب یہ قیاسی طالب علم ظاہر ہو۔ فی الوقت میں اس تصور کو ترجیح دیتا ہوں کہ برادری ایک بہت قدیمی ہندو ادارہ ہے اور اس کی ظاہری شکل و صورت پر اس کی قدامت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ ہم ایک قوی امکانی صورت کے طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مسلم سرگذشتوں میں مذکور لازماً تمام مقدم تو نہیں لیکن ان میں کے بہت سے ایسی برادری کے نمائندے تھے جو مسلم حکومت کے بعد تک قائم رہی اور جس کے متعلق خیال ہے کہ یہ ہندوستان کے بعض حصوں میں ابتدائی مسلم فتوحات کے قبل بھی موجود تھی۔ اس امر کے متعلق کے ان میں سے بعض بغیر برادری کے مواضعات کی نمائندگی کرتے

ایسے بادشاہ نہ تھے اور ہمیں یہ تصور کرنا چاہیے کہ ان ایام میں نظامِ مال ایسے پرسکون طریقوں پر چل رہا تھا جو کسی وقائع نگار کے لیے جاذب توجہ نہ تھا۔ یہ قرینِ قیاس نہیں کہ ایسی سرگرمیوں کے افسانوں کے دوران جب کہ انتظامیہ موضع کی تنظیم کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کے افراد تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا ہمیں اس تنظیم کے بارے میں کچھ معلومات فراہم ہوسکیں گی۔ اور اس عہد کی بقیہ مدت میں وقائع نگار کے پاس لکھنے کی کوئی اطلاع نہ تھی۔

کسی باضابطہ تنظیم کی موجودگی کے بارے میں جو تھوڑے بہت اشارے ملتے ہیں وہ مقدم یعنی چودھری اور محاسب (پٹواری) کے گرد مرکوز ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلم عہد کے اختتام پر مواضعات حکام سے محض مقدّموں کی وساطت سے معاملات کرتے تھے اور ابتدائی انگریزی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی نمایاں حیثیت دوسرے کسانوں کی حیثیت پر پردہ ڈالنے کا رجحان رکھتی تھی۔ چنانچہ شروع میں بعض مقدم ایسے زمیندار معلوم ہوتے جنھیں انگریز انتظامی عہدہ داران تلاش کیا کرتے تھے۔ ان سربرآوردہ اشخاص کو ان مقدّموں کا مرادف تصور کرنا درست ہوگا جن کا راسکد اس کے نام سے اورنگ زیب کے فرمان میں کسانوں پر احتمالی ظلم کرنے والوں کی حیثیت سے ذکر آیا ہے۔ پھر ہم عہد عالمگیری کے مقدّموں کو ان مقدّموں کے مرادف تصور کر سکتے ہیں جو اکبر کی تفصیلی ہدایات میں فصلی تشخیصوں میں حصہ لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور یہ کلاں ترانِ دیہہ کا بھی جنھیں اکبر کسانوں پر احتمالی ظلم کرنے والا تصور کرتا تھا۔ پس مذکورہ بالا مندرجات کے پیشِ نظر مغلیہ عہد کے مقدم، ان عبارتوں میں بیان کیے ہوئے مقدّموں کے بہت زیادہ مماثل تھے جن کا حوالہ پہلے آچکا ہے۔ وہ اس قدر زیادہ اختیارات کے مالک تھے کہ موضع کے دوسرے کسانوں کے لیے خطرہ کا موجب بن سکتے تھے۔

جب ہم ماضی میں چودھویں صدی کی طرف رخ کرتے ہیں تو معلومات میں کم قطعیت ملتی ہے، کیوں کہ ضیا برنی کی سرگذشت میں چند ایسی مثالیں ہیں جن میں مقدم کے لفظ کا حوالہ بظاہر ایک بڑے رقبہ کے سردار کے طور پر آیا ہے، لیکن بیشتر صورتوں میں ان کی فطری تعبیر بعد کے دنوں کی تعبیر کے مماثل ہے۔ یاد رہے کہ ہندوستانی اداروں کے عربی نام کسی طور پر بھی بارہویں صدی سے قبل کے نہیں ہوسکتے اور یہ بھی تصور نہیں کیا

میں تقسیم اور انیسویں صدی کے تشخیصی حلقوں کے درمیان جو بیشتر واقعتاً مروجہ زمینی شرحوں پر مبنی تھے، ایک تاریخی رشتہ پایا جائے گا: لیکن شرح نامے خود زمین کے اختلافات پر نہیں بلکہ پیداوار کے اختلافات پر مبنی تھے۔

موضع کے باہر بھی تسلسل میں بظاہر کوئی رخنہ نہیں پایا جاتا ہے۔ جاگیریں اب بھی موجود تھیں گو ان کی اہمیت بہت کم ہو گئی تھی۔ مواضعات معمولاً کسی سردار یا اجارہ دار کو مالگذاری ادا کرتے تھے اور اجاروں کی مدت میں اضافہ کے رجحان کا فوری سبب وہ تبدیلیاں تھیں جو مغل انتظامیہ کے انحطاط کے نتیجہ میں ظاہر ہوئیں۔ جن اداروں کی تاریخ کا پتہ چلایا جا سکتا ہے ان کے استحکام کی بنا پر ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم یہ سوال کریں کہ کیا ہم ان اداروں کو جن پر مسلم وقائع اس قدر کم روشنی ڈالتے ہیں، ماضی میں مسلم عہد کے دوران موجود تصور کر سکتے ہیں، مثلاً برادری، برادری کے باہر کے کسان اور چھوٹی چھوٹی آراضی داریاں جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔

چھوٹی آراضی داریوں کے متعلق پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وقائعوں میں ان کی غیر موجودگی کی بنا پر کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا، کیونکہ ان کا ذکر ہوتا بھی تو محض اتفاقیہ ہوتا۔ موضع کے ملازمین کی موجودگی واضح طور پر ایک قدیمی رسم ہے ان کے معاوضہ کے طریقوں پر قدامت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے اور کسی متناقص شہادت کے قسم کی کسی چیز کی غیر موجودگی میں بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ زمین کے چھوٹے چھوٹے رقبوں پر ان ملازمین کے حقوق بہت قدیمی ایام سے چلے آ رہے تھے۔ اسی قسم کے کچھ خیالات کا اطلاق چھوٹی چھوٹی خیراتی آراضی داریوں پر بھی کیا جا سکتا ہے جن کے متعلق میرا قیاس ہے کہ یہ بھی قدیمی ادارہ تھا لیکن اس مد کی زمینوں کا رقبہ نسبتاً اس قدر قلیل ہے کہ ان پر تفصیلی بحث کے بجائے ان کا محض ذکر کر دینا ہی مناسب ہوگا۔ اصل مسئلہ موضع کے اندر کسانوں کی تنظیم کے متعلق وقائعوں کا سکوت اختیار کرنا ہے۔

اس مسئلہ کے سلسلہ میں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ موجود شہادت مسلم عہد کے دوران بہت ہی غیر مساوی طور پر منقسم ہے۔ چند ممتاز انتظامی عہدہ داروں کی منفرد کسانوں کے ساتھ براہ راست معاملہ کرنے کی کوششوں کے متعلق ہمیں نسبتاً زیادہ تفصیلات ملتی ہیں، لیکن اگر انھیں برسوں کے پیمانہ سے ناپا جائے تو یہ محض وقفے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان نسبتاً بہت زیادہ طویل وقفوں کے لیے ہمارے ماخذ بہت نامکمل ہیں جن کے دوران علاء الدین یا شیر شاہ

بہ اعتبار وسعت تبدیل نہیں ہوئے ہیں۔

اختتامی مشاہدات

اٹھارہویں صدی کے اختتام پر شمالی ہندوستان میں مروجہ زرعی نظام کے اس بیان کی تکمیل کے لیے غالباً یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ مختلف تفصیلات ان واقعات پر کیوں کر منطبق ہوتی ہیں جو پچھلے ابواب میں زیر بحث آئے ہیں۔ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ موضع بحیثیت ایک اکائی کے ٹھیک ویسے ہی قائم رہا جیسا کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں تھا۔ گانوں کے ذمہ واجب مالگذاری معمولاً پورے سال کے لیے یکمشت رقم کے طور پر تشخیص کی جاتی جو اس کے پیداواری صلاحیت کے مطابق ہوا کرتی اور معمولاً کوشش یہ ہوتی کہ یہ پیداوار کا نصف ہو۔ لیکن تشخیص کرنے والے اسے منفرد کسانوں پر تقسیم نہ کرتے تھے۔ موضع کے اندر ہم منفرد کسانوں کو اس مالگذاری میں اپنے اپنے حصہ کو ان معروف طریقوں میں سے کسی نہ کسی کے مطابق ادا کرتا ہوا پاتے ہیں، یا تو جمع کی ہوئی فصل کے تخمینہ (یا بعض اوقات تعین) پر یا زیر تخم رقبہ پر شرحوں یا آراضی پر کسی یکمشت رقم کے مطابق۔ بظاہر واحد جدت شرحوں کے قائم کرنے کے طریقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ بہت سی صورتوں میں ہم پیداوار کی شرحوں کو ٹھیک شیر شاہ یا اکبر کی شرحوں کے مطابق پاتے ہیں لیکن مختصر کیے ہوئے شرح ناموں کے ساتھ۔ لیکن بعض صورتوں میں ہم شرحوں کو زمین کی قسم کے ساتھ تبدیل ہوتا ہوا اور پیدا کی ہوئی فصلوں سے غیر متعلق پاتے ہیں۔

ہمیں اس امر کی کوئی قطعی شہادت نہیں ملتی کہ جن مسلم انتظامی عہدہ داروں نے اس خطہ میں منفرد کسانوں سے معاملہ کرنے کی کوشش کی، انھوں نے ان زمینی شرحوں کو استعمال کیا۔ لیکن ایک مثال ایسی ہے جس میں ہو سکتا ہے کہ مسلم عہد میں یہ شرحیں استعمال کی گئی ہوں، حالانکہ یہ واقعہ درج تحریر نہیں ہے۔ چوتھے باب میں گذر چکا ہے کہ اکبر کے انتظامی عہدہ داروں نے مملکت کے مختلف حصوں کے مقامی حالات کے لحاظ سے تشخیص کے تفریقی شرح ناموں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور میرا قیاس ہے کہ کسی منفرد شرح نامہ کو کسی مخصوص رقبۂ زمین پر نافذ کرتے وقت انھوں نے منجملہ دیگر امور کے ان زمینی شرحوں سے جو مواضعات میں تسلیم اور موضع کے اندر کی جانے والی ادائیگیوں میں استعمال کی جاتی تھیں ان سے رہنمائی حاصل کی ہوگی۔ اس نظریہ کے تحت، اکبر کی مملکت کی علیحدہ علیحدہ شرح نامہ کے حلقوں

خود اپنی کوششوں پر بھروسہ کرنا ہوتا تھا۔

غیر منقسمہ حقوق پر ایک فرد کی جانشینی ہمیں اودھ کے بعض سرداروں کی تاریخی روایات میں بھی ملتی ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کا ہمیں لحاظ رکھنا چاہیے۔ یہ بات "جائداد" جو ترقی یافتہ مقدس قانون کے تحت مرنے پر معمولاً قابل تقسیم ہوتی ہے اور "سرداروں کے حقوق" کے درمیان جو تقسیم کے قابل نہیں ہوتا بلکہ جسے ہمیں فرماں روائی کی ایک یادگار تصور کرنا چاہیے۔ ایک مسلّمہ امتیاز کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ امر کہ کسی سردار نے دہلی یا کسی اور جگہ کے فرماں روا کی اطاعت قبول کرلی ہے اس کے علاقہ اختیار کے حدود میں اس کی حیثیت کو متاثر نہ کرتا تھا بشرطیکہ اسے اپنا قبضہ برقرار رکھنے کی اجازت مل گئی ہو۔ اس کے حقوق جب ختم کیے جاتے تو ایسا ایک برتر طاقت کے استعمال ہی سے عمل میں آتا تھا۔ حقائق کی یہ تعبیر اب بھی سرداروں کے علاقوں میں عوامی رویّہ سے مطابقت رکھتی ہے۔ سرداروں کا علاقہ اب بھی راج یا بادشاہت کا درجہ رکھتا ہے اور اس کے حدود میں اس کی خواہش تقریباً بمنزلہ قانون کے ہوتی ہے اور باوجودیکہ یہ طریقہ کمزور پڑ گیا ہے اور اس میں ابھی مزید کمزوری کا واقع ہونا لازمی ہے، تاہم میرا خیال ہے کہ مورخین کے لیے اس کا وجود فرماں روائی کے استحقاق کی ایک قطعی سند کے طور پر قابلِ قبول ہونا چاہیے۔ یہ استحقاق غالباً کم و بیش ایک بعید عہد کے واقعات پر مبنی ہے، گو ان واقعات کے متعلق پرانے کاغذات اب محفوظ نہ ہوں۔

لیکن ہمیں اس کلیہ کے دائرہ میں ان تمام خطوں کو جو سرداروں کے زیرِ قبضہ ماتحت علاقوں میں واقع تھے شامل نہ کرنا چاہیے، کیونکہ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے ان میں سے بعض برطانوی نظم و نسق کے قیام سے متصلاً قبل کے برسوں میں اپنے ماتحت علاقوں کے بڑھانے میں کوشاں تھے۔ یہ بات کہ موجودہ قانون کی تسلیم کی ہوئی املاک کا کس قدر حصہ قدیم فرماں روائی سے متعلق ہے اور اس کا کس قدر حصہ جدید اضافہ ہے ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تعین ہر معاملہ کے متعلق علیحدہ علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے علم میں اودھ کے بعض ایسے زمینداران ہیں جن کی زمینداریوں کی مدت محض انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے، بعض ایسے ہیں جن کی زمینداریاں مسلم عہد میں قائم ہوئی تھیں اور بعض تو ایسے ہیں جن کی تاریخ اس سے بھی قبل کی ہے۔ برادری کی طرح سرداروں کا ادارہ بھی بہت قدیم ہے۔ لیکن ہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ تمام سرداروں کی مدت ایک ہی زمانہ سے شروع ہوتی ہے یا یہ کہ ان کے مقبوضات

نے سردار یا غالباً بادشاہ بھی بننے کی راہ پر چلنا شروع کر دیا تھا۔

دوسری طرف سرداران، گو ان کی پشت پر صدیوں پرانی تاریخ تھی اور خالص مالی نقطۂ نگاہ سے ان کی حیثیت مسلسل اجارہ داروں کی سی چلی آ رہی تھی مگر وہ بھی اپنے ماتحت علاقوں کو بڑھانے کے اسی قدر متمنی تھے جس قدر کہ نئے لوگ اور ہم ایسے محض نام کے رلیاؤں کی مثالیں پاتے ہیں جنھوں نے اپنے روائتی علاقوں کے علاوہ بڑے بڑے اجارے حاصل کیے تھے۔ اس طور پر ابتدائی انگریز حکمرانوں کو ایسے سرداروں سے جو اجارہ دار بھی تھے اور ایسے اجارہ داروں سے جو سردار بننے کے کوشاں تھے معاملہ کرنا پڑا، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تھوڑے دنوں تک ان دونوں کو ایک ہی طبقہ تصور کیا گیا۔ واقعاتی اعتبار سے اس عہد کی ابتدائی تحریروں سے سرداروں کی حیثیت کی امتیازی خصوصیات کے بارے میں بہت تھوڑی معلومات فراہم ہوتی ہیں اور اس ضمن میں جس قطعی بیان تک ہماری رسائی ہوسکی ہے وہ آگرہ کے ٹھیک شمال میں اس دوآب کے علاقہ سے متعلق ہے جو اس ضلع کا ایک حصّہ تھا اور جسے اس وقت سیدآباد کہتے تھے۔ اس ضلع میں جمنا کے کنارے کنارے کے علاقہ میں خاص طور پر برادری کے مواضعات تھے۔ لیکن اس کے مزید مشرق میں برادریاں بہت زیادہ شاذ تھیں اور ٹھاکروں یا سرداروں کی ملکیت کے حقوق کو ان کے مواضعات کے کسانوں کے حقوق سے "بہت زیادہ قدیم" بیان کیا گیا تھا۔ سرداروں اور کسانوں کے درمیان رشتہ "تقریباً وہی تھا جو یورپی ممالک میں زمین کے مالک اور اسامی کے درمیان پایا جاتا ہے۔" کسان عموماً برادریاں نہ قائم کرتے بلکہ مختلف ذاتوں اور قبیلوں پر مشتمل ایک بیچ میں جماعت کی شکل میں تھے اور سردار ان میں سے ایک یا ایک سے زاید افراد کے یا ورنہ موضع کے باہر کے کسی سربراہ کار کے ساتھ مالگذاری کا ٹھیکہ کر لیتا تھا۔ بیان کے لکھنے والے کا یہ قیاس تھا کہ سردار نے ابتدائی برادری کو ماضی بعید کی کسی مدت میں خارج کر دیا تھا لیکن یہ محض قیاس ہی کے درجہ میں ہے جس کی کوئی سند نہیں اور جہاں تک ہمارا علم ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ مفروضہ مدت مسلمانوں کی فتح کے بہت پہلے کی رہی ہو۔ سردار کے حق ملکیت کی سب سے زیادہ امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ معمولاً اس کے حقوق اس کے مرنے پر ہندو قانون وراثت کے مطابق تقسیم نہ ہوتے تھے۔ ایک سردار اس کے خاندان کا جو بھی دستور ہوتا اس کے مطابق منتخب ہو کر جانشین ہوتا اور وہ معمولاً اپنے جدّی عزیزوں کی ضروریات کا کفیل ہوتا، لیکن خاندان کے چھوٹے بھائیوں کو اپنی گذر اوقات کے لیے

کے وقت جو درمیانی اشخاص پائے جاتے تھے وہ یکسانی کی ایک ظاہری صورت پیش کرتے تھے۔ یہ صورت اٹھارہویں صدی کے دوران ملک میں جو حالات چل رہے تھے اس کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی۔ ایسی صورتیں جن میں کسی "تعلق" یا ماتحت علاقہ پر استحقاق اس کے محاصل کی جاگیر پر مبنی تھا نسبتاً شاذ تھیں۔ برطانوی حکام کے سامنے جن لوگوں کے استحقاق پیش ہوئے وہ عام طور پر مستاجر یا سردار تھے۔

اس زمانہ میں جب مرکزی اقتدار کی اہمیت تقریباً ختم ہو چکی تھی اجارہ دار کسی بھی شخص سے جو کسی خطہ کا واقعی حکمراں ہوتا اپنا عہدہ حاصل کر لیتا تھا اور یہ حکمراں قدرتی طور پر ایسے اشخاص کو ترجیح دیتے جو تھوڑے بہت مقامی اثر کے مالک ہوتے کیونکہ ایسی صورت میں کسی درجہ میں یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے معاہدوں کو پورا کر سکیں گے پس جائز یا ناجائز طریقوں سے مقامی اثر کا حصول ہی حب جاہ کی راہ کا پہلا قدم تھا اور تحریر کی سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اصولوں کے حصول کے قبل اگر ان میں تمام تر نہیں تو بیشتر ضلعوں میں مقامی اثر کے حصول کے لیے کشمکش چل رہی تھی۔ ملک ڈاکوؤں کے جتھوں سے بھرا ہوا تھا جن کے خلاف سلطنت کوئی حفاظت نہ فراہم کرتی تھی اور کوئی موضع جو صرف حفاظت کا طالب ہوتا، پیداوار میں بادشاہ کے حصہ کو کسی بھی ایسے شخص کو جو بادشاہ کے اس اہم ترین فریضہ کو انجام دینے کی ذمہ داری لے لیتا ادا کرنے میں حق بجانب تھا۔ بہ اعتبار نتیجہ، یہ قدیم ہندوستانی نظام حکومت کے بنیادی تخیل کی جانب مراجعت تھی۔ زمانہ کے حالات کے پیش نظر یہ ایک مناسب انتظام تھا۔ لیکن جب کوئی شخص اس سے تجاوز کرتے ہوئے یہ کہتا ہے "مجھے بادشاہ کا حصہ دو ورنہ میں، موضع کو ویران کرتا ہوں" یا اسی قسم کا کوئی دوسرا اقدام کرتا تو ان مواضعات کے لیے جو اس طور پر بڑھتے ہوئے ماتحت علاقہ میں جبراً شامل کر لیے جاتے دوسری طرح کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ماتحت علاقہ کی بنیاد قائم ہو جانے کے بعد اس کے محاصل کا ٹھیکہ حاصل کیا جا سکتا تھا اور اس کے بعد اجارہ دار اپنی حیثیت کے استحکام اور توسیع میں مشغول ہو سکتا تھا۔ قلیل میعاد کے اجاروں اور ان میں بار بار تبدیلیوں کی روایت اب ختم ہو چکی تھی۔ اجارہ داروں پر پوری زندگی قبضہ رکھا جاتا اور حالات کے موافق ہونے کی صورت میں ان کے ورثہ کے نام ان کی تجدید ہو سکتی تھی۔ لہذا انگریز اسے موروثی حقوق ملکیت تصور کرتے تھے۔ اس حقیقت کو مد نظر رکھ کر طوائف الملوکی کا دور قائم رہا ہم یہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں ان اجارہ داروں

تو موضع کا مطالبہ فوراً بڑھا دیا جاتا اور برادری کے زیر کاشت زمین کے لیے رقبہ کی ایک مخصوص اکائی کے استعمال سے خفیہ رکھنے کا عمل انجام پاتا تھا یا اس عمل میں سہولت فراہم ہوتی۔ ایک اطلاع کے مطابق اس علاقہ کے ایک حصہ میں جسے اب غازی پور کہتے ہیں برادری کے ارکان کے ذمہ خالص واجب الادا مطالبہ ۱۵۰ روپیہ تھا اور ان کے زیر کاشت آراضی کا رقبہ ۲۰۰ عام بیگھہ تھا۔ اس طور پر انہیں صرف آٹھ آنہ فی بیگھہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ لیکن اگر یہ بات علم میں آجاتی تو فی الفور اضافہ عمل میں آجاتا۔ لہذا وہ اپنی کاشت کے لیے ناپنے کی ایک مخصوص رسی (طناب) رکھتے تھے جس کا ایک بیگھہ عام بیگھے کے چار گنے کے برابر ہوتا تھا۔ اس طور پر موضع کے کاغذات میں ۲۰۰ بیگھوں کے بجائے صرف ۵۰ بیگھے درج ہوتے تھے اور اس رقبہ پر ادائیگی کا حساب ۲ روپیہ فی بیگھہ آتا تھا۔ یہ عدد اس قدر زیادہ تھی جس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو سکتی تھی

چنانچہ ایسے مقامات پر جہاں برادری کی تنظیم اپنے فرائض کو موثر طور پر انجام دیتی تھی، وہاں موضع کا منافع اس کے ارکان کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم ہوتا تھا اور باصلاحیت چودھری ایک معتدل رقم کا منافع دکھا سکتے تھے۔ لیکن جہاں پر چودھری غاصب ہوتا وہاں وہ منافع کا زیادہ حصہ پچھلی فصل میں مندرج اقتباس میں دیئے ہوئے طریقہ پر اپنے تصرف میں لایا کرتا۔ وہ عام کسانوں کے مقابلہ میں ارکان برادری سے قدرے کم شرحوں پر وصولی کرتا اور "نفع ونقصان کا بذات خود ذمہ دار" ہوتا تھا۔ دوسری طرف تحریروں میں ایسی صورتیں درج ہیں جن میں ارکان برادری دوسرے کسانوں کی شرحوں کے مطابق ادا کرتے تھے، کیونکہ تشخیص سے کچھ منافع نہ بچتا تھا اور ہو سکتا ہے کہ ایسی صورتیں بھی ہوتی ہوں، حالانکہ مجھے ان کا علم نہیں، جن میں برادری کو فی الواقعی نسبتاً زیادہ ادا کرنا پڑتا ہو۔ پس اس نظام کا معاشی اثر یہ تھا کہ پیدا کرنے والے کی بچت کا مسلم یا بہت بڑا حصہ موضع سے باہر نکال لیا جاتا اور اگر کچھ باقی بچتا تو جیسی بھی صورت ہوتی یا تو اسے برادری میں تقسیم کر دیا جاتا یا اس پر چودھری خود تصرف کر لیتے۔ بغیر برادری کے مواضعات میں منافع کی تقسیم کا سوال نہ پیدا ہوتا۔ سربرا[illegible] جیتیز کو نہ لیتا وہ اسی منفرد کسان کے پاس رہتی جس نے اسے پیدا کیا تھا۔

4۔ درمیانی اشخاص

جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا ہے سپرد کیے ہوئے اور فتح کیے ہوئے صوبوں میں ان کے حصول

فروخت کرنا پڑے۔

دوآب میں، معاہدوں کے ذریعہ معمولاً، یا تو پیداواری شرحوں، زمینی شرحوں، یا بالمقطع لگان کی شکل میں نقد ادائیگیاں مقرر کی جاتیں۔ پیداواری شرحیں ٹھیک اکبر کے نظام کے طریقوں کے مطابق تھیں یعنی پیداوار کی نوعیت کے اعتبار سے تبدیل ہوتی ہوئی فی بیگھہ کے لیے کوئی مقررہ رقم۔ لیکن شرح نامے نسبتاً کم مفصل تھے۔ تقریباً ہم حیثیت پیداواروں کو ایک زمرہ میں رکھا گیا تھا چنانچہ ایک مخصوص موضع کے شرح نامے میں محض چاول، دوسری جنسیں، گنا، کپاس اور باغ کی فصلیں درج ہو سکتی تھیں۔ زمینی شرحیں، پیداواری شرحوں سے بالکل جداگانہ ہوتی تھیں اور غالباً کسان کی اپنی زیر کاشت زمین کی صلاحیت کے متعلق قریبی واقفیت پر مبنی ہوتی تھی۔ المقطع لگانیں ایک معینہ رقبہ پر ایک معینہ رقم ہوتی۔ یہ پورے رقبہ پر کاشت ہو یا نہ ہو واجب الادا ہوا کرتی یعنی جن آراضیات پر یہ ادا کی جاتیں وہی ہوتیں جنھیں میں نے آراضیات ٹھیکہ کہا ہے۔ ان تینوں صورتوں میں فصل کے نقصان کے لیے حسب معمول گنجائشیں رکھی جاتیں جو مطالبات کے اس قدر زیادہ ہونے کی صورت میں بہت ضروری تھا۔

پس پورے صوبہ میں نقد ادائیگی کا عام قاعدہ تھا اور چودھری اپنی برادری کے ارکان کے سامنے ایک طرح کا سالانہ یا فصلی نقد حساب پیش کر سکتا تھا جس میں مالگذاری اور دوسرے اخراجات پر صرف ہونے والی رقم، برادری کے باہر کے کسانوں اور دوسرے ذرائع سے وصول ہونے والی رقم اور وہ باقی ماندہ رقم جو ارکان برادری سے وصول کرنا ہوتا درج رہا کرتیں۔ اس کے بعد یہ باقی ماندہ رقم منفرد ارکان پر، موضع کے مروجہ طریقہ کے مطابق کبھی تو فصل کی پیداوار پر کبھی بہ اعتبار فی ہل لیکن معمولاً زیر تخم رقبہ پر تشخیص کی جاتی تھی اور چودھری کو اس تشخیص کو ضروری ادائیگیوں کو مکمل کرنے اور اپنے حساب کو پورا کرنے کی غرض سے وصول کرنا ہوتا تھا۔

اس عہد کے کاغذات سے واضح ہوتا ہے کہ مالگذاری کے دعوے دار یا اختیار افراد زیادہ سے زیادہ رقمیں وصول کرنے کی کوشش کرتے جو بمنزلہ موضع کی معاشی لگان کے ہوتیں لیکن ان کی کوشش ہمیشہ کامیاب نہ ہوتی اور جب چودھری کے پاس معاشی لگان کا ایک جز بچ جاتا تھا، تو اسے مذکورہ بالا طریقہ پر برادری کے درمیان ان کی کاشت پر عاید کیے ہوئے مطالبہ کی تخفیف کی شکل میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ایسا واقعہ ہونے کی صورت میں اس کا خفیہ رکھنا عملاً بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا کیونکہ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ برادری کو نفع ہو رہا ہے

پر جس قدر وہ اس سے وصول کر سکے اس سے زائد کی ذمہ داری عاید ہو یہ واضح طور پر بہتر تھا کہ زمین غیر مزروعہ پڑی رہے۔ برادری کے باہر کے کسانوں کے لیے معمول یہ تھا کہ ان سے مالگذاری کے علاوہ برادری کی آمدنی کے لیے تھوڑی سی مزید رقم وصول کی جاتی۔ کاغذات میں اس فاضل مطالبہ کو ہمیشہ تو نہیں مگر بعض اوقات واجب الادا مقامی محصول کے طور پر شامل کیا گیا ہے اور بس یہ بعض اوقات پیداوار کے نصفی معیار سے بڑھ جاتے ہیں۔ دوسری طرف بعض علاقوں میں مختلف گنجائشیں اور چھوٹیں تھیں جو امداد کو اور بھی پیچیدہ بناتی ہیں۔ لیکن مسلسل زیر کاشت زمین جو مخصوص آفات سے محفوظ تھیں' ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ چودھری اور کسانوں کے درمیان سالانہ معاہدوں میں پیداوار کے ایک من (۴۰ سیر) میں ۲۰ سیر سے کمی کا نہیں بلکہ زیادتی کا رجحان ملتا ہے اور ۲۲½ سیر ایک عام عدد تھی جس میں ۲۰ سیر درمیانی شخص کے لیے اور ۲½ سیر برادری کے لیے ہوا کرتا۔ ادائیگی کے اس عام معیار کا اطلاق عام مزروعہ زمینوں پر ہوتا تھا۔ مخصوص طور پر ناقابل اطمینان زمینوں کے لیے مطالبہ ایک تہائی و ایک چہارم سے کم ہوتے ہوئے ایک بٹہ آٹھ تک رہا کرتا، جب کہ ایسی زمینوں کے لیے جو کچھ عرصہ کے لیے غیر مزروعہ رہی ہوں ادائیگی کی ایک تسلیم شدہ شرح تھی۔

تشخیص مطالبہ کے طریقوں کے سلسلہ میں دوآب جہاں پر معاہدوں کا مدار زیرِ تخم رقبہ پر ہوا کرتا اور گنگا کے اس پار کے علاقہ کے درمیان جہاں ان کا انحصار اکٹھا کی ہوئی فصل پر ہوا کرتا۔ ایک امتیاز قائم کرنا ضروری ہے۔ گورکھپور اور روہیل کھنڈ میں جن فصلوں کا سودا کھلیان پر ہوا کرتا ان کی پیداوار کا تخمینہ لگایا جاتا اور تخمینہ کی ہوئی مقدار کی قرار پائے ہوئے حصّہ کے مطابق قریب ترین بازار کی مروجہ نرخوں پر قیمت لگائی جاتی۔ اس طور پر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو منتقل ہونے والی شے غلّہ نہیں بلکہ نقد رقم ہوا کرتی۔ پیداوار کی واقعی تقسیم شاذ و نادر عمل میں آتی، لیکن تخمینہ پر نزاع کی صورت میں جیسا کہ بہت ہی کم واقع ہوتا، اسی طریقہ پر ہمیشہ عمل کرتے تھے۔ ایسی فصلوں کے لیے جن کا سودا کھلیان پر نہ ہوتا، معاہدوں میں فی بیگھہ شرح پر نقد ادائیگی کی شرط ہوتی۔ یہ شرطیں بظاہر مخصوص علاقوں میں پہلے سے طے رہا کرتیں لیکن زمین کی پیداواری صلاحیت کے مطابق ایک موضع کے اندر بھی مختلف ہوتی تھیں۔ چنانچہ عام صورتوں میں چودھری کو کسانوں سے نقد رقم وصول ہوتی تھی، مگر مخصوص حالت میں، مالگذاری کی ادائیگی کے لیے نقد رقم فراہم کرنے کی غرض سے ہو سکتا تھا کہ اسے جنس کے ایک جز کو بازار میں

کسان پائے جاتے تھے جو اپنے ذمّہ کے مطالبات سردار کے مقرر کیے ہوئے سربراہ کار کو جو انھیں میں کا ایک یا کوئی اجنبی شخص ہوتا ادا کرتے۔

مذکورہ بالا تجزیہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد کا زرعی نظام کسی طور پر بھی یکساں نہ تھا۔ جیسا کہ میں نے پچھلی فصل میں لکھا ہے کہ ان میں سے ہر زمرہ کے زیرِ قبضہ زمین کے رقبہ کی مقدار کو بتانا ناممکن ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فی الوقت زیرِ غور خطہ میں بیشتر مواضعات میں کسانوں کی مخلوط جماعتیں کاشت کرتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کا انتظام ایک برادری کرتی تھی، لیکن اس میں اس کے حلقہ کے باہر کے کسان بھی شامل رہتے تھے۔ اگلی فصل میں، میں ان طریقوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جن کے تحت پیداوار میں بادشاہ کا حصہ ادا کیا جاتا تھا۔

کسانوں کی ادائیگیاں

اس عہد میں تنخواہ دار ملازمین سرکار اور منفرد کسانوں کے درمیان دراصل کسی براہِ راست تعلق کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی۔ بادشاہ کے حصہ کو وصول کرنے کا مجاز شخص خواہ وہ مستاجر ہو، یا جاگیردار ہو، یا سردار، موضع کے چودھری کے ساتھ ایک مقررہ نقد رقم کی ادائیگی کے لیے معاملہ کر لیتا تھا۔ یہ رقم انفرادی کھیتوں یا آراضیات پر علیحدہ علیحدہ تشخیص نہ کی جاتی بلکہ اس کا تعین موضع کی پیداواری صلاحیت کے مطابق ہوا کرتا۔ اورنگ زیب کے زمانہ کی طرح اب یہ چودھری کا کام ہوا کرتا کہ وہ منفرد کسانوں سے حکومت کو ادا کی جانے والی رقم وصول کرے۔ بادشاہ کے حصہ کی مقدار بھی تبدیل نہ ہوئی جو معمولاً پیداوار کا نصف اور مخصوص صورتوں میں گھٹ کر ایک تہائی ہو جایا کرتی۔ وصول کرنے والے کا مقصد اس رقم کا حاصل کرنا ہوتا جو تقریباً اس جز کے مساوی ہوتی اور اگر ممکن ہوتا تو اس سے قدرے زائد۔ دوسری طرف چودھری کی یہ کوشش ہوتی کہ موضع کی واقعی پیداوار کے ایک جز پر مختلف طریقوں سے پردہ ڈال کر تشخیص میں کمی کر دے۔ پھر بھی ادائیگی کی رقم عموماً پورے سال کے لیے معین کی جاتی تھی، لیکن بعض مقامات پر یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ تشخیص کی ہوئی رقم کو جب تک کہ دونوں فریقین اس کے عادی نہ ہو جائیں دہراتے رہیں۔

مطالبۂ مالگذاری کی سطح لازماً منفرد کسانوں کے جانب سے ادا کی جانے والی رقوم کے معیار کو متعین کرتی تھی، کیونکہ برادری کے لیے بمقابلہ اس کے کہ زمین کی کاشت سے چودھری

جہاں تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اہم تھیں اور مواضعات کی بڑی تعداد کو برادری والے اور نہ برادری والے مواضعات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ برادری والے مواضعات کو "خالص" یا "مخلوط" میں تقسیم لیا جاسکتا ہے۔ ان میں امتیاز کا انحصار برادری کے باہر کے سکنی کسانوں کی موجودگی پر ہوتا تھا۔ اس کی خالص قسم بندیل کھنڈ کے اس حصے کی امتیازی خصوصیت ہے جو برطانوی حکومت کے تحت آگیا تھا۔ اس کے تمام سکنی کسان برادری کے ارکان تھے اور جب کہ اس کے منفرد ارکان دوسرے اور نیز اپنے مواضعات کی زمینوں کی کاشت کر سکتے تھے، برادری کے باہر کے سکنی کسانوں کا عملاً وجود نہ تھا۔ ابتدائی انگریز انتظامی عہدہ داروں کے لیے یہی بات بندیل کھنڈ اور دریائے جمنا کے شمالی علاقہ کے درمیان وجہ امتیاز بنی جہاں کے اگر تمام گانوں نہیں تو ان کی غالب اکثریت مخلوط قسم کی تھی۔ درحقیقت پرانے کاغذات کے مطالعہ کے سلسلہ میں مجھے دوآب یا روہیل کھنڈ میں مشکل ہی سے کوئی ایسا موضع مل سکا جہاں پر صرف برادری اور ملازمین موضع کاشت کا کام کرتے ہوں، حالانکہ میرے سامنے ایسی مثالیں آئی ہیں جن میں دوسرے کسانوں کے زیر قبضہ رقبہ نسبتاً بہت تھوڑا تھا۔ عموماً برادری کے باہر کے کسان زرعی پیداوار میں ایک اہم، گو بعض اوقات ماتحت عنصر کی حیثیت رکھا کرتے۔

بغیر برادری کے مواضعات دو زمروں میں آتے ہیں۔ پہلے میں وہ قدرے زیادہ تعداد کے مواضعات ہیں جو اس وقت کی حالیہ نو آبادیاں تھیں جہاں مالگذاری کے مجاز محصلین نے ایک ویران موضع میں کسانوں کو بہ ترغیب آباد کیا تھا۔ جو ترغیبات اکثر دی جاتی تھیں ان میں یہ وعدہ کہ انھیں وہاں رہنے دیا جائے گا شامل تھا۔ چنانچہ ابتدائی ترین کاغذات میں ان کسانوں کو حق دخیل کاری کے مالک کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ ایسی صورت میں جہاں آباد ہونے والے ایک ذات کے ہوتے وہاں وہ لوگ ایک نئی برادری قائم کرنے کی راہ پر لگ جاتے لیکن انگریز انتظامی عہدہ داروں کے لائے ہوئے تخیلات اس راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے۔ لیکن مجھے کسی برادری کے واقعتاً اس طور پر وجود میں آنے کی کوئی قطعی مثال نہ مل سکی اور بہر حال انتظامی عہدہ داران ان صورتوں میں کسی برادری کے وجود کو معلوم کرنے میں ناکام رہے۔ دوسرا زمرہ ان مواضعات پر مشتمل ہے جو موروثی سرداروں کو یا ان لوگوں کو جو اس وقت کے انتشاری دور میں اپنے لیے نئی سرداریاں قائم کر رہے تھے، مالگذاری ادا کرتا تھا۔ سرداروں کے بعض مواضعات میں برادریاں تھیں۔ لیکن دوسرے مواضعات میں، صرف غیر منظم

اس زائد رقم سے خود مستفید ہوتے تھے یا وہ ہر شریک دار سے اس کی پیداوار کے صرف ایک مقررہ حصہ کو بذریعہ بٹیّ (بٹائی، شریک داری) پانے کا قرار کرکے حکومت کو اس کا مطالبہ ادا کرتے اور اسے مطمئن کرنے کی تمام زحمتوں اور ذمہ داریوں کو اپنے سر لے لیتے تھے۔ ان طریقوں سے وہ کثیر نفع حاصل کرتے تھے۔" پس نتیجۃً انھوں نے امرا طبقہ کی ایک چھوٹی سی حکومت کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ لیکن عام طور پر وہ برادری کے محافظ اور دلی بہی خواہ ہوا کرتے۔"

چنانچہ بہت سے چودھری تو وفادار کارکن تھے، مگر بعض صورتوں میں برادری کے اندر ہی اسے منتشر کرنے والی ایک طاقت مصروفِ عمل ہوسکتی تھی جو ابتدائی تنظیم کے بطن سے گانوں کے ایک سردار اور کسانوں کی ایک ایسی جماعت کو جنم دے سکتی تھی جو اس سے ارزاں شرحوں پر اپنے لیے زمین حاصل کیا کرتے۔ انتشار، خارجی اسباب کی بنا پر بھی واقع ہوسکتا تھا، کیوں کہ خشک سالی یا ناقابلِ برداشت مظالم کے نتیجہ میں کسی موضع کے باشندے مجموعی طور پر فراری اختیار کرسکتے تھے۔ ایک عام خیال یہ پایا جاتا تھا جس کا مفہوم تھا کہ پسماندگان یا ان کے ورثا کسی وقت بھی موضع میں دوبارہ آباد ہونے کے دعویدار ہوسکتے تھے۔ لیکن کم از کم قحط کی صورت میں ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص بھی اپنے اس دعوے کو عمل میں لانے کے لیے بچا ہی نہ ہو۔ ایسا ہونے پر گانوں اس وقت تک کے لیے ویران ہوجایا کرتا جب تک کہ کوئی ایسا شخص جو اس کے محاصل سے استفادہ کرنے کا خواہش مند ہو یہاں نئے کسانوں کو آباد نہ کرے۔ دوسری طرف اس بات کی علامات پائی جاتی ہیں کہ کسی ویران موضع کی دوبارہ آبادی، منتشر شدہ برادری کی جگہ ایک نئی برادری کو وجود میں لاسکتی ہو۔ لہٰذا یہ تصور کرنا کہ تمام برادریاں ایک ہی زمانہ میں وجود میں آئیں غالباً غلط ہوگا۔ یہ ادارہ بلاشک بہت پرانا ہے لیکن اس کے طویل وجود کی تاریخ میں ہوسکتا ہے کہ بہت سی مخصوص برادریاں ناپید ہوئی ہوں اور بہت سی دوسری وجود میں آئی ہوں۔

ابھی تک جو کچھ لکھا جاچکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کے مواضعات کے حالات میں بے حد تنوع پایا جاتا تھا۔ ان کی خاص خاص قسموں کو اس طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے ویران موضع تھا یعنی زمین کا ایک ایسا رقبہ جسے ایک موضع کے طور پر تسلیم کرتے تھے۔ لیکن یہ غیر آباد اور غیر مزروعہ ہوتا تھا، غالباً اس سبب سے کہ وہاں سے کسان بھگا دیئے گئے تھے یا انھیں سکونت ترک کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ موضع تھا جہاں سکنی آبادی نہ تھی اور دوسرے مواضعات کے باشندے یہاں کاشت کرتے تھے۔ یہ دونوں قسمیں

"ایسی بہت سی صورتیں پائی جاتی ہیں جن میں ایک زمیندار ہوتا ہے جن کے نام ہمیشہ سے پوٹے چلے آتے ہیں، جو بہت طاقتور ہوتا ہے اور جس سے اس کی تمام برادری کے لوگ خائف رہتے ہیں۔ وہ اپنے بھائیوں اور رعیت سے مالگذاری جمع کرتا ہے۔ چونکہ وہ بذات خود نفع و نقصان کا مالک ہوتا ہے لہذا وہ سرکار ("خزانہ" یا "حکومت") میں جو کچھ بھی جمع کرتا ہے اس کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے اور اگر تمام برادری کے لوگ اپنے اپنے حصہ کے مطابق اس کے ساتھ قبضہ میں شرکت کے خواہش مند ہوں تو وہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انھیں ان کی کاشت سے باز نہیں رکھتا بلکہ محض عام منافع سے انھیں کوئی حصہ نہیں لینے دیتا۔ وہ اپنے حق میں یہ فاضل رقم لیتا ہے۔ اور یہ کہ ۵ یا ۶ یا ۸ یا ۱۰ نسلوں سے برادری کے ان لوگوں کے مورث اسی طور پر مخصوص اس (زمیندار) کے مورثوں کے افراد کو اپنی اپنی مالگذاری ادا کرتے آئے ہیں۔ لیکن وہ اپنی برادری کے ان لوگوں سے عام رعیت کی شرح پر مالگذاری وصول نہیں کرتا۔ اس قدر فرق ہوتا ہے کہ، اگر مثلاً عام رعیت کے لوگ ۳ روپیہ فی بیگھہ کے تناسب پر ادا کرتے ہیں تو وہ اپنے ان بھائیوں سے محض ۲ روپیہ فی بیگھہ کی شرح پر لیتا ہے اور رعیت اور تمام لوگ اسے ایک قدیم دستور کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔"

یہ امر کہ چودھری کے عہدہ کا یہ پہلو علاقہ بنارس کے لیے مخصوص نہ تھا، دریائے جمنا کے مغربی علاقہ کے نظام مال کے متعلق دہلی کے چیف کمشنر مسٹر ٹی۔ فارٹس کیو کی ۱۸۲۰ء میں لکھی ہوئی رپورٹ[۵۹] سے ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ "مقدموں کی پریشانیاں اکثر بہت صبر آزما ہوتی ہیں اور انھیں بہت جسمانی تکالیف برداشت کرنی ہوتی ہیں۔ اگر کسی ایسی رقم کی ادائیگی کو جسے مالکان ناپسند کرتے، مقدم تسلیم کر لیتا تو مالکان کا انھیں گالیاں دینا اور سخت ملامت کرنا یقینی ہوتا۔ جب تک کہ موضع کی مخلصانہ حمایت کے سلسلہ میں وہ قید، کوڑوں، فاقہ وغیرہ کی سزا نہ بھگت لیں اور ایسی رقموں کی ادائیگی کو قبول کرنے کے قبل لاچاری کے آخری مقام پر نہ پہنچا دیے جائیں، شریک داران کو تشفی نہیں ہوتی۔" یہاں پر ہم چودھری کو برادری کا صحیح معنوں میں نمائندہ اور اپنے فرائض منصبی سے سختی کے ساتھ بندھا ہوا پاتے ہیں۔ دوسری طرف چودھری کا عہدہ انھیں ایسے وسائل فراہم کرتا تھا جس سے وہ لوگ "اکثر اپنے برادری کے افراد اور حکمران طاقت کو زک پہنچا کر خود فائدہ اٹھاتے تھے۔" چنانچہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، وہ سرکاری افسران سے قرار پائے ہوئے جمع (مالگذاری) سے زائد خانہ کرنے اور

اس پار مسلم حکومت کی ماتحتی میں تھا۔ اس کی جنوبی اور تبدیل ہوتی ہوئی سرحد وجائے نگر کا تحت ہندو علاقہ تھا۔ دوسرے باب میں گذر چکا ہے کہ علاء الدین خلجی نے مسلم قلمرو کو نربدا کے اس پار پہنچایا اور چودھویں صدی کے ایک حصّہ کے دوران دکن کے کچھ صوبے دہلی کے ماتحت رہے۔ علاء الدین نے اپنا مخصوص نظامِ مال اس علاقہ میں رائج نہ کیا اور اس کے متعلق ہماری جملہ اطلاع تقریبًا اس قدر ہے کہ یہاں اجارہ داری کا طریقہ رائج تھا۔ منفرد مندرج تحریری مثالوں کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اجارے بڑے بڑے رقبوں، پورے صوبے، یا صوبوں کے مجموعوں کے لیے دیئے جاتے تھے اور محمد تغلق کے عہد حکومت میں کم از کم ان پر بعض اوقات محض سٹہ باز (SPECULATORS) قابض تھے۔ دہلی کی بادشاہت کے منتشر ہونے کے نتیجہ میں دکن میں دو مسلم صوبے وجود میں آئے۔ شمال میں خاندیش اور اس کے اس طرف بہمنی سلطنت۔ تقریبًا پندرھویں صدی کے خاتمہ پر بہمنی سلطنت پانچ اکائیوں میں تقسیم ہوئی۔ برار، احمد نگر، گولکنڈہ، بیدر اور بیجاپور۔ چنانچہ سولہویں صدی میں کل چھ طاقتیں تھیں جو اکبر کی برار اور خاندیش کی فتح اور بیدر کو اس کے پڑوسیوں کے ہضم کر لینے کے بعد گھٹ کر تین رہ گئیں۔ ان دو صدیوں کے لیے تاریخ کے لیے ہمارا انحصار تقریبًا پوری طور پر محمد قاسم فرشتہ کی لکھی ہوئی سرگذشت پر ہے۔ اس تصنیف سے یہ اندازہ ملتا ہے کہ وہ زرعی مسائل سے دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ ہمیں اس سے یہ ضمنًا اطلاع ملتی ہے کہ بہمنی سلطنت میں جاگیریں عام تھیں اور یہ کہ مخصوص کی ہوئی زمینیں (خالصہ) موجود تھیں (ص ص ۳۲۰، ۳۵۶) لیکن اس سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ معمولاً بادشاہ کا پیداوار میں کس قدر حصّہ ہوا کرتا یا یہ کیوں کر تشخیص اور وصول کیا جاتا اور نہ ہی اس میں موضع کی تنظیم کے متعلق کوئی دلچسپ تفصیل یا فی الوقت ہمارے زیر بحث دیگر موضوعات درج ہیں۔ ہمیں بہرحال یہ اطلاع ملتی ہے کہ برار میں اکبر کی فتح کے وقت نسق کے ذریعہ تشخیص کا طریقہ بہت زیادہ دنوں سے رائج تھا اور یہ کہ غالبًا خاندیش میں بھی ان ایام میں یہی طریقہ تھا۔ مزید جنوب کی بادشاہتوں کے لیے ہمیں اس قسم کی کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے، اس سلسلہ میں نسق کی اصطلاح کا صحیح مفہوم مشتبہ ہے۔ یہ اصلاح منفرد کسانوں پر نہیں بلکہ ایک موضع (یا اس سے بڑے رقبہ) پر تشخیص کی قطعی نشاندہی کرتی ہے۔ آیا کہ تشخیص جو دھری پر ہوتی تھی یا ان اجارہ داروں پر جو موضع کے رہنے والے نہ ہوتے، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر کسی

قابلِ اعتماد فیصلہ کے لیے مجھے بہت ہی تھوڑی شہادت مل سکی ہے اور اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ یہ اصطلاح ان دونوں متبادل صورتوں پر حاوی ہو۔

ملک کے اس حصّہ کی زرعی تاریخ کا قطعی طور پر پہلا اہم واقعہ، احمد نگر میں ملک عنبر کا جاری کیا ہوا نظامِ تشخیص تھا۔ اس نے یہ کام اس وقت کیا تھا جب وہ بادشاہت کے اس حصّہ کی خود مختاری کو جہانگیر سے محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ روایات کی ان شہادتوں سے جو برطانوی عہد تک قائم رہیں ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت جو تبدیلیاں کی گئیں اہم تھیں، لیکن میں ان کی صحیح نوعیت کے تعین میں ناکام رہا۔ مجھے کوئی ہم عصر بیان نہ مل سکا اور گرانٹ ڈف اور رابرٹسن کے لکھے ہوئے حالات[40] جو اس موضوع پر جملہ تحریروں کی اصل معلوم ہوتے ہیں کچھ غیر واضح سے ہیں اور ان میں ایسے امور پر اختلاف پایا جاتا ہے جنھیں بنیادی تصوّر کرنا چاہیے۔ گرانٹ ڈف کا مختصر تذکرہ خاص طور پر چند مرہٹی مخطوطات پر جو اب قابلِ شناخت نہیں ہیں مبنی تھا مگر یہ مشکل ہی سے ہم عصر مآخذ ہو سکتے ہیں۔ اس کی رو سے ملک عنبر نے اجارہ داری کو موقوف کر کے اس کے بجائے "بمقدار جنس" واقعی پیداوار کے ایک معتدل تناسب کی" وصولی کو" جسے متعدد فصلوں کے تجربہ کے بعد کاشت کے مطابق ہر سال طے کی ہوئی نقدی رقم کی ادائیگی میں تحویل کرتے تھے "رائج کیا۔ ایک حاشیہ میں یہ اضافہ ملتا ہے کہ اس (گرانٹ) کے مآخذ حکومت کے حصّہ کو پیداوار کا دو بٹہ پانچ بتاتے ہیں، جب کہ روایات کی رو سے نقد میں تحویل کی ہوئی رقم تقریباً ایک تہائی کے مساوی ہے، اس تذکرہ کے مطابق تشخیص کے طریقوں کی ترتیب اس طور پر تھی: پہلے اجارہ داری، اس کے بعد بٹائی بمقدار جنس، پھر نقدی شرحوں پر پیمائش یا اس کے بہت زیادہ مشابہ کوئی دوسرا طریقہ۔

رابرٹسن کا بیان ضلع پونہ میں اس کی جمع کی ہوئی روایات پر مبنی تھا لیکن وہ جیمس گرانٹ کے ٹوڈرمل کے نظام کے متعلق غلط بیانی[41] سے مرعوب تھا۔ جیمس گرانٹ کا خیال تھا کہ ٹوڈرمل کے نظام کی ملک عنبر نے نقل کی ہے اور روایت کو ان کاموں سے جو اس کے خیال کے مطابق ٹوڈرمل نے انجام دیئے تھے ہم آہنگ کرنے کی اس کی کوششوں نے اسے بہت زیادہ قیاس آرائی میں مبتلا کیا۔ بقول اس کے ملک عنبر نے بٹائی کے طریقہ کو موقوف کیا اور "بمقدار جنس ایک مستقل لگان" قائم کی جس کی جگہ بعد میں "بمقدار رقم ایک مستقل لگان" نے لے لی۔ رپورٹ کی مختلف عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ان اصطلاحوں کو ان کے

عام مفہوم میں استعمال کیا ہے، چنانچہ وہ "موضع کے ایک استراری بندوبست" کی مالگذاری کو فصلی نشیب و فراز سے آزاد بیان کرتا ہے۔ وہ بہرحال ایک دوسرے مقام پر بہ اعتبار بیگھہ عائد کی گئی غلہ کی شرحوں کا حوالہ دیتا ہے اور وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کے زیر تحقیقات خطہ کے ۲۹۰ مواضعات میں سے صرف ۱۱۰ میں مستقل رقمی لگان پائی جاتی تھی۔ اسے طلب کیے ہوئے حصہ کے متعلق کوئی قطعی بیان نہ مل سکا، مگر اس کے قیاس کے مطابق ایک تہائی سے کم تھا۔

پس ملک عنبر کا آخری طریقہ یا تو کاشت کی بنیاد پر سالانہ مقرر کیا ہوا ایک نقدی مطالبہ تھا یا کاشت کی تبدیلیوں سے آزاد ایک ایسا مطالبہ تھا جو نقد یا غلہ میں مستقلاً مقرر کیا گیا ہو۔ ہماری معلومات کی موجودہ حالت میں ان متبادل صورتوں کے درمیان کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ گو وقت کے حالات کے اعتبار سے اوّل الذکر زیادہ امکانی صورت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے طریقوں کے قائم رہنے کی مدت بھی خواہ وہ کچھ ہی رہی ہو، غیر یقینی ہے، وہ تقریباً ۱۶۲۶ء میں فوت ہوا اور اس کا طریقہ بھی اس کے ساتھ ختم ہو گیا۔ لیکن کسی صورت میں بھی وہ اگلے دس سال کے آفات کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ ۱۶۳۰ء کے بڑے قحط نے دکن کو ویران کر دیا تھا اور احمد نگر کی آخری تسخیر کے قبل کی جنگ سے زراعت کی بدنظمی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی تھی۔ اس کا پورا یقین ہے کہ رابرٹسن کے الفاظ میں "مستقل لگانوں" کی ادائیگی قائم نہ رہی ہوگی اور اس میں بہت شک ہے کہ گرانٹ ڈف نے جس نظام کی نشاندہی کی ہے اس کے لیے جس قسم کی مشینری کی ضرورت تھی وہ کام کرتی رہی ہوگی۔

ہماری تمام تر اطلاع بس اس قدر ہے کہ دکن کی اقتصادی اور مالی حالت احمد نگر کی مغلوں کی تسخیر کے چند برسوں بعد تک فی الجملہ غیر اطمینان بخش رہی۔ اس خطہ کا انتظامی ڈھانچہ ایک مرتبہ سے زائد بار تبدیل کیا گیا لیکن بالآخر چار مغلیہ صوبے قائم کیے گئے جو بعض اوقات سب کے سب ایک واحد نائب سلطنت کی ماتحتی میں رکھے گئے۔ کچھ دنوں بعد شاہزادہ اورنگ زیب اس عہدہ کے لیے مقرر ہوا اور تقریباً ۱۶۵۳ء سے شروع کر کے یہاں کے مالی نظام کو مکمل طور پر از سر نو مرتب کیا گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تشکیل اور تکمیل مدبرانہ خطوط پر کی گئی۔ یہ کام مرشد علی خاںؒ نامی ایک عہدہ دار کے سپرد کیا گیا، جسے پہلے تو دو جنوبی صوبوں کا پھر پورے خطہ کا دیوان مقرر کیا گیا، وہ ایک غیر ملکی یعنی خراسان کا باشندہ تھا جو

علی مردان خاں کی ملازمت میں ہندوستان آیا اور یہاں اسے اس وافر سرپرستی سے ایک حصہ ملا جو علی مردان کی وابستگی کے فارس سے ہندوستان منتقل ہونے کے بعد اس کے ساتھ آنے والوں کو حاصل ہوئی۔ تحریروں میں مرشد علی خاں کی پہلی تقرری پنجاب کی پہاڑیوں میں بحیثیت فوجدار کے ملتی ہے۔ اس کے بعد وہ اصطبل کا داروغہ، پھر لاہور کا بخشی ہوا اور اس عہدہ سے وہ دکن کا دیوان بناکر بھیجا گیا۔ اس طور پر وہ، جہاں تک سرگذشتوں سے پتہ چلتا ہے اس کے قبل ہندوستان میں مالی کاموں کا کوئی تجربہ نہ رکھتا تھا۔

اس علاقہ کی فوری ضرورت کافی وسائل رکھنے والے کسانوں کی فراہمی تھی اور اس معاملہ میں خاص طور پر گانوں کے چودھری پر انحصار کرتے ہوئے شمالی ہندوستان کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ ہماری اطلاع ہے کہ چودھریوں کی انعامات کے ذریعہ ہمت افزائی کی گئی، انھیں نقد پیشگی رقمیں دی گئیں اور جن مواضعات کے چودھری لاپتہ ہوگئے تھے وہاں باصلاحیت افراد مقرر کیے گئے۔ ساتھ ساتھ وسیع پیمانہ پر جائزہ لینے کے بعد، قابل کاشت اور بنجر زمینوں میں امتیاز قائم کرکے بحالی کے امکانات کو متعین کیا گیا۔ اگر ہمارے لیے بدایونی کا یہ بیان کہ اکبر کے محصلین نے اپنے کام کو پورے ملک کی جانچ کے بعد قابلِ کاشت رقبوں کے انتخاب سے شروع کیا تھا قابلِ قبول ہو تو، مذکورہ بالا عمل بھی شمال ہی کے طریقہ کے مطابق تھا۔ مرشد قلی خاں کے کام کی جدت اس کے تشخیص کے طریقوں میں تھی۔

ہمارے زیرِ مطالعہ تذکرہ میں درج ہے کہ دکن میں اس وقت تک نہ تو پیمائش اور نہ بٹائی کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ تشخیص کی قدیمی مقررہ اکائی ہل تھی "ہر چودھری یا کسان جو ایک ہل اور اس میں جتے ہوئے بیلوں سے جس قدر رقبہ کی کاشت کرسکتا تھا اتنی کرتا اور اپنی پسند کی فصل بوتا، اور ہر ہل پر تھوڑی سی رقم ادا کرتا" ہر ہل پر طلب کی جانے والی رقم پرگنہ کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہتی تھی اور پیداوار کے متعلق کوئی تحقیقات نہ کی جاتی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس بیان کا پورے خطّہ پر اطلاق ہوسکتا تھا، کیونکہ اتنے بڑے علاقہ میں یکساں طریقۂ تشخیص کچھ ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بیان احمد نگر میں ملک عنبر کی اصلاحات کے روایتی تذکرہ سے بھی مختلف ہے۔ لیکن ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ فی ہل کی شرح سے لگان جس کی موجودگی کا برطانوی عہد میں پتہ لگایا جاسکتا ہے ان دنوں دکن کے بیشتر حصہ کا مروجہ طریقہ تھا۔ مرشد قلی خاں نے ہل پر لگانوں کو پوری طور پر موقوف نہ کیا،

بلکہ اس کے متبادل طریقوں کے طور پر بٹائی اور پیمائش رائج کی۔ اس طور پر اس کے پاس کل تین طریقے تھے جو بلاشک مقامی حالات کے اعتبار سے نافذ کیے جاتے تھے۔ پچھڑے ہوئے علاقے پر بہ اعتبار ہل اور اس سے زیادہ ترقی یافتہ مواضعات پر جدید متبادل طریقوں میں سے کوئی ایک لیکن ترجیحاً پیمائش کے حساب سے تشخیص کی جاتی۔

بٹائی کا اب نافذ کیا ہوا طریقہ وہی تھا جسے میں نے پہلے باب میں "تفریقی" کہا ہے، یعنی طلب کیا ہوا حصہ ہر پیداوار پر یکساں نہیں بلکہ حالات کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتا۔ ایسی فصلوں میں جن کا انحصار بارش پر ہوتا حکومت کا حصہ پیداوار کا آدھا اور جن کی آبپاشی کنویں کے پانی سے ہوتی پیداوار کا ایک تہائی ہوتا، جب کہ اونچی قسم کی فصلوں مثلاً گنے، یا پوستہ پر پیداوار کے خرچ میں فرق کے اعتبار سے ایک چوتھائی سے کم کرتے ہوئے ایک بٹہ نو تک وصول کرتے تھے اور آخر میں نہروں سے سیراب ہونے والی فصلوں کی نرخیں کنوؤں کی فصلوں سے تھوڑی مختلف تھیں لیکن انھیں اعداد میں درج نہیں کیا گیا ہے۔

دوسری طرف پیمائشی طریقہ کے تحت تمام فصلوں پر، پیداوار کے ایک چوتھائی کی مقامی قیمتوں پر مبنی نقدی شرحوں کے حساب سے وصول کرتے تھے۔ پس اس خطہ کے حالات کے پیش نظر جہاں بیشتر رقبہ میں بارش والی فصلیں ہوتیں غلہ بخشی کی جگہ پیمائشی طریقہ قبول کرنے کے لیے بڑی ترغیب دی جاتی۔ ایسی صورت میں زمین کا بہت بڑا حصہ آدھے کے بجائے چوتھائی ادا کرتا اور صرف ایسے مواضعات میں جہاں اونچی قسم کی فصلوں کے بڑے بڑے رقبے ہوتے، کسان معمولاً بذریعہ بٹائی تشخیص کو ترجیح دیتا۔ تذکرہ میں یہ تحریر نہیں کہ کسانوں کو فی الواقعی حق انتخاب دیا جاتا، لیکن اس امر کے پیش نظر کہ اس وقت خاص مقصد ویران علاقوں کی طرف متوجہ کرنا تھا، یہ بجا طور پر نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ، جیسا اکبر نے شمال میں کاشت کاری کی توسیع کی غرض سے کسانوں کو ان کی پسند کا اختیار دیا تھا ویسا ہی انھیں بھی دیا گیا ہوگا۔

سندھ کے بارے میں ابتدائی عہد کے اس ضمنی واقعہ کے علاوہ جس کا پہلے باب میں ذکر آچکا ہے، غلہ بخشی کا تفریقی پیمانہ اب ہندوستانی تحریروں میں پہلی بار دکھائی دیتا ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، یہ پیمانہ اسلامی اور ہندو زرعی نظاموں کے درمیان اہم امتیازوں میں سے ایک ہے اور یہ امر کہ اس کا رائج کرنے والا ایک غیر ملکی شخص تھا معنی خیز ہے۔ مجھے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرشد قلی خاں جن ایّام میں فارس میں مردان علی خاں کی ماتحتی میں کام کر رہا تھا تفریقی غلہ بخشی سے بخوبی واقف ہو چکا تھا اور دکن کی از سر نو تنظیم کے کام پر مامور ہونے پر اس نے فارس کے اپنے تجربہ سے استفادہ کیا۔ لیکن اس مسئلہ پر قطعی شہادت نہیں ملتی۔ اس طریقہ پر کس درجہ عمل کیا گیا۔ ایک ایسا سوال ہے جس پر مجھے کوئی اطلاع نہ مل سکی، لیکن میرے زیرِ حوالہ تذکرہ میں اس کے بجائے پیمائش کے متبادل طریقہ کے پھیلاؤ پر زیادہ زور دیا گیا ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مرشد قلی خاں کی فراست کی بنا پر زیادہ مقبول ہوا اور جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے جملہ عام صورتوں میں کسانوں کے لیے زیادہ موافق تھا۔ اس طریقہ کے تحت پیداوار میں طلب کیے ہوئے حصّہ کو چوتھائی کے تناسب پر منتخب کرنے کا کوئی سبب نہیں بیان کیا گیا ہے اور ہم اس وقت شامل میں مقرر کیے ہوئے خطرناک طور پر اونچے تناسب کی منسوخی کو مرشد قلی خاں کے عملی تدبر کا ایک ثبوت تصور کر سکتے ہیں۔ یہ بات کہ وہ جزئیات اور نیز اصولوں پر خود توجہ دیتا تھا اس تحریری روایت سے اخذ کی جاسکتی ہے کہ پیمائش کے مشتبہ ہونے کی صورت میں وہ پیمائشی رسّی کا ایک سرا خود اپنے ہاتھ میں لے لیا کرتا تھا۔ خطیبانہ مبالغہ آرائی کی گنجائش رکھتے ہوئے بھی ماخذ کے بیانات سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس کی پالیسی کی وجہ سے اس کے زیرِ انتظام علاقہ کی کاشت کاری اور نتیجتاً مالگذاری میں ایک ترقی پذیر اضافہ ہوا۔

اگلی نصف صدی کے دوران اس خطّہ کے بیشتر حصّہ پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا جن کی زرعی پالیسی اس مقالہ کی حدود سے باہر ہے۔ لیکن اس کے جنوبی شمالی حصّہ پر حیدر آباد کی موجودہ ریاست کے بانی آصف جاہ کا تسلط ہو گیا اور جیسا کہ اگلی فصل میں واضح کیا جائے گا یہ امر بنگال میں برطانوی نظم و نسق کی شروعات کے لیے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

اب گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں کی صورتِ حال کا بیان باقی رہ جاتا ہے جو خراج ادا کرنے کے باوجود بھی مرشد قلی خاں کی از سر نو تنظیم کے وقت مغلیہ سلطنت کی حدود سے باہر تھیں۔ مجھے سولہویں صدی کے دوران گولکنڈہ کی صورتِ حال کا کوئی ہم عصر تذکرہ نہ مل سکا۔ لیکن سترہویں صدی کے ابتدائی مدّت میں یہ علاقہ پوری طور پر اجارہ داری کی بدترین شکل کے تحت تھا۔ واجب الادا رقم ہر سال نیلام کے ذریعہ مقرر کی جاتی اور جو بیانات ہمارے پاس موجود ہیں ان کی تحریر کے وقت یہ طریقہ واضح طور پر زیادہ عرصہ سے چل رہا تھا۔ ایک پیشتر باب میں گذر چکا ہے کہ اس علاقہ میں چودھویں صدی میں اجارہ داری رائج تھی اور سترہویں صدی

کے دوران ہم اسے پورے عروج پر پاتے ہیں۔ اگر درمیانی مدت میں کوئی تبدیلیاں ہوئیں تو یہ ان ماخذ میں سے کسی ایک میں بھی جو میری نظر سے گذرے درج نہیں ہیں اور یہ نتیجہ نکالنا کہ اجارہ داری مسلسل قائم رہی مجھے اغلب معلوم ہوتا ہے، لیکن کسی براہ راست شہادت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

سالانہ نیلامی اجارہ داری کے تحت، کسانوں پر دباؤ لازماً زیادہ سے زیادہ رہتا ہوگا۔ بقول میتھولڈ بادشاہ کے رعایا، "سب کے سب اس کے اسامی تھے اور لگان کمر توڑنے والی تھی" اور جبری وصولیوں پر وامدروک کسانوں کے باغی ہو جانے یا بھاگ جانے کا خطرہ تھا۔ پیداوار کے جس تناسب کی ادائیگی ان سے متوقع تھی، تحریروں میں درج نہیں ہے۔ لیکن اس کی ایسی صورت میں کہ اجارہ دار کو صرف زیادہ سے زیادہ امکانی رقم وصول کرنے کی فکر رہتی ہو اور کوئی ایسا سبب بھی نہ پایا جاتا ہو جو اسے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرے مشکل ہی سے زیادہ عملی اہمیت ہو سکتی تھی۔ مجھے اس خطہ کی جس کا بہت بڑا حصہ آصف جاہ کے تسلط میں آگیا تھا اور جو اب حیدرآباد میں شامل ہے سترہویں صدی کے بعد کی تاریخ کے متعلق کوئی ہم عصر تحریر نہ مل سکی، لیکن کہا جاتا ہے کہ یہاں پوری اٹھارہویں صدی میں اجارہ داری کا دستور تھا اور یہ کہ یہ ۱۸۵۳ء میں یا اس کے جلد ہی بعد سالار جنگ کے موقوف کر دینے کے وقت تک قائم رہی۔

بیجاپور کی باقی رہ جانے والی ریاست کے متعلق مجھے مشکل ہی سے کوئی اطلاع مل سکی ڈِ لندیزی تحریروں میں چند اتفاقیہ اندراجات سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سترہویں صدی میں اجارہ داری کا رواج تھا، لیکن وہ ایک ایسے عمومی بیان تک کے لیے جیسا کہ گولکنڈہ کے متعلق لکھا گیا ہے کافی نہیں ہیں اور اس صدی کے آخر تک بیجاپور کا بہت بڑا علاقہ مرہٹوں کے قبضہ میں آگیا تھا۔ ہم عصر تحریروں کی غیر موجودگی میں، مسلم عہدِ حکومت کے دوران یہاں کے زرعی نظام کی تفصیلات پر قیاس آرائی کرنا کارِ عبث ہوگا۔

مسلم حکومت کے آخری جنوبی توسیع شدہ علاقہ کی زرعی صورتِ حال کا، ٹیپو سلطان کے ۱۷۸۵ء میں اپنی میسور کی بادشاہت کے ایک جزء کے لیے جاری کیے ہوئے ضابطوں سے پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ میں ان ضابطوں کا فارسی متن نہ حاصل کر سکا، لیکن اس کے موجود ترجمہ میں ہمیں بہت سی ایسی فنی اصطلاحیں ملتی ہیں جن کی بنا پر ہم یہاں کی زرعی صورتِ حال کو اس طور پر بیان کر سکتے ہیں:۔ اس خطہ کے کسان اپنی زمین (ضابطہ ۲) پر ٹھیکہ یا بٹائی میں سے کسی ایک طریقہ کی آراضی داری کے طور پر قابض تھے۔ آخر الذکر صورت میں حکومت پیداوار کا نصف حصہ طلب کرتی تھی اور بظاہر

اس قسم کی آراضی داری کو ترجیحی حیثیت حاصل تھی کیونکہ محصلین کو اس نوعیت کی زمین کے تناسب کو برقرار رکھنے کی ہدایت تھی۔ کسان کی کاشت کرنے کی ذمہ داری (ضابطہ ۲) اور فصلوں کی نوعیت کی بہتری (۴) پر زور دیا گیا تھا اور ان مقاصد کے حصول کے لیے قرضے اور دیگر مراعات (ضابطے ۲، ۱۵ لغایتہ ۱۸، ۲۱، ۲۶ لغایتہ ۲۸) کی منظوری دی گئی تھی اور عدم ادائیگی کے لیے چودھریوں کو کوڑے کی سزا (ضابطہ ۹) مقرر تھی۔ آبپاشی کی تعمیرات و مرمت اور دیگر ترقی کے کاموں پر بھی زور دیا گیا تھا (ضابطہ ۳۴ لغایتہ ۳۶) اور عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضابطے ایک روایتی پالیسی کے مظہر ہیں جن کی رو سے کسانوں کو سخت ضابطوں کے تحت رکھا جاتا اور انھیں اپنی زمینوں کا بہترین مصرف کرنے کی ترغیب دی جاتی یا اس پر مجبور کیا جاتا۔ کسانوں کے ناکافی تعداد میں ہونے کی صورت میں محصلین کا فرض ہوتا کہ وہ انھیں آنے کی ترغیب دیں (ضابطہ ۱۰) اور کسانوں کی فراری کے باعث ہر ہل کے نقصان پر وہ جرمانہ کی سزا کے مستوجب ہوتے (ضابطہ ۴۹)۔

محصلین کو ضابطہ کے اندر منفرد کسانوں سے معاملہ کرنے کی ہدایت تھی، لیکن مواضعات کو اجارہ پر دینے کے طریقہ کو تسلیم کیا جاتا تھا (ضابطے ۸، ۹، ۱۶، ۳۹) اور تفصیلی ضابطوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اجارے بہر حال عام تھے۔ محصل کو اس کی وصول کی ہوئی رقم پر کمیشن دیتے تھے۔ کمیشن کی مجموعی رقم سے اسے منظور شدہ عملہ کی تنخواہ ادا کرتا ہوتا (ضابطہ ۵۸) اور بقیہ اس کا معاوضہ ہوتا۔ اس طور پر اپنے کام سے اس کا براہ راست مالی مفاد وابستہ ہوتا۔

ان بعض دوسرے ضابطوں کے جن پر پچھلے ابواب میں بحث آچکی ہے، ان ضابطوں کے متعلق بس اس قدر کہنا ضروری ہے کہ ان کے نتائج کا انحصار نظم و نسق کی صلاحیت پر رہتا ہوگا۔ ایک ایماندار اور مستعد محصل باصلاحیت نگراں کی ماتحتی میں اس نظام کو اطمینان بخش نتائج کے ساتھ چلا سکتا تھا۔ ان اوصاف کی غیر موجودگی کسانوں کی زندگی کو تقریباً ناقابل برداشت بنا سکتی تھی۔ متعدد ممانعتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ خرابیاں متوقع تھیں لیکن ان کے تعدد کے متعلق محض قیاس آرائی کی جا سکتی ہے اور دوسرے مقامات کے طرح یہاں بھی، کسانوں کی حالت کا بہت کچھ انحصار زمین کے لیے مقابلہ کی موجودگی یا غیر موجودگی پر رہا ہوگا۔ جب تک نقل مکانی کے مواقع موجود رہتے، مظالم یا جبری وصولی پر روک لگی رہتی اور جب کسان کسی پناہ کی جگہ نہ ہونے کے باعث اپنے گانوں سے بندھا رہتا تو کسی رکاوٹ کا ہونا مشکل ہی ہوتا۔

■ بنگال

بنگال کی زرعی تاریخ ایک خصوصی دلچسپی کی حامل ہے، کیونکہ ابتدائی انگریز انتظامی عہدہ داروں نے کلکتہ ہی میں وہ اصطلاحیں سیکھیں جنھیں وہ اپنے ساتھ شمال کی طرف لے گئے اور جنھوں نے دیگر واقعات کے ساتھ مل کر انھیں غلط فہمیوں کے اس انبار میں مبتلا کیا جو ہولٹ میکنزی کی یادداشت میں درج ہیں۔ لیکن بنگال کے متعلق فی الجملہ مجھے شمالی تحریروں میں بجز آئین [(۱)، ۳۸۹] کے اس بیان کے کہ اکبر نے اس کی فتح کے وقت، یہاں تشخیص کے جن طریقوں کو رائج پایا انھیں کو برقرار رکھا، مشکل ہی سے کچھ اور مل سکا ہے۔ اس کے قبل کے ماخذسے میں جو معلومات جمع کر سکا وہ محض دریائے ہگلی کے کنارے کے چند مواضعات کے متعلق ہیں جن کا غالباً پورے صوبہ پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ان مواضعات کے واقعات کا قدرے تفصیل بیان ضروری ہوگا کیونکہ ان سے ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں برطانوی نظم و نسق کی بعض ابتدائی دقتوں کی بظاہر نشاندہی ہوتی ہے۔ میں یہاں کی صورتِ حال کو جیسا سمجھتا ہوں وہ اس طور پر تھی کہ یہاں انگریزوں کا پہلے پہل ایسے خطّہ کے زرعی معاملات سے ربط قائم ہوا جہاں کی مقامی اصطلاحیں شمالی علاقہ میں زیرِ استعمال اصطلاحوں سے مختلف تھیں اور جو دقّتیں بعد میں پیدا ہوئیں اُن کا ایک حد تک یہ سبب تھا کہ ان مقامی اصطلاحوں کو ایسے خطّوں میں رائج کیا گیا جہاں وہ پہلے سے استعمال میں نہ تھیں۔

ان واقعات کی ابتدا سولھویں صدی میں سات گانوں بندر کے زوال اور اس کے نتیجہ میں پیش آنے والی آبادی کی نقل مکانی سے ہوتی ہے۔ بیشتر لوگ ہگلی منتقل ہوئے جس پر غیر ملکی تجارت کے ایک مرکزی حیثیت سے پرتگالیوں کا عملی طور پر قبضہ ہو گیا۔ اس وقت ہگلی کا نواحی علاقہ بیشتر غیر آباد تھا اور ہماری اطلاع ہے کہ مغلوں کے قبضہ کے پہلے پرتگالی منفرد اشخاص نے اس کے کچھ حصّوں کے بہت تھوڑی لگان پر اجارے حاصل کیے تھے۔ جو حالات پائے جاتے تھے ان کے پیشِ نظر، بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان اجارہ داروں کی نوعیت زمینوں کو صاف کرنے کے ٹھیکوں کی تھی، یعنی یہ خالی زمینوں کے لیے جنھیں اجارہ داروں کو منافع حاصل کرنے کی غرض سے زیرِ کاشت لانا ہوتا تھا ایک مقررہ سالانہ رقم قبول کی جاتی تھی۔ یہ مخصوص اجارے شاہ جہاں کے پرتگالیوں کے ہگلی سے خارج کرنے کے وقت بالمقطع ختم کر دیئے گئے تھے۔ شاہی احکام میں ہدایت تھی

کہ دخل اندازی کرنے والوں کو نیست و نابود کر دیا جائے مجب کہ ان کے خلاف کارروائیوں کے دوران قریبی مواضعات میں "اجارہ داروں کے عیسائیوں کو جہنم رسید کرنے کے لیے" فوجی دستے بھیجے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے ان عیسائی لگان داروں کا مفہوم تھا جنھیں پرتگالی اجارہ داروں نے زمینوں پر لبسا رکھا تھا۔

بہر حال جب کہ سات گاؤں کے بیشتر باشندے تو ہگلی منتقل ہوئے، لیکن چند ہندو گھرانوں نے دریا کے بہاؤ کے رخ پر اور آگے کی طرف پہنچ کر بستیاں قائم کیں اور ان کا گوبند پور اور سوتانتی نام رکھا۔ انھوں نے یا ان کے جانشینوں نے اس وقت موجود ایک موضع دیہی کل کتا پر بھی قبضہ حاصل کیا اور ان مقامات کو انگریزی تحریروں کے الفاظ میں "تین قصبے" کہا جا سکتا ہے۔ سوتانتی میں پہلے فورٹ ولیم کی جس وقت تعمیر ہو رہی تھی اس وقت انگریز تاجروں کی فطری طور پر اس سے بالکل متصل کچھ زمین حاصل کرنے کی خواہش ہوئی اور ۱۶۹۸ء میں صوبجاتی نائب مملکت کی اجازت سے انھوں نے ان تینوں قصبات کے قابضین کے حقوق (یہ جو کچھ بھی تھے) خریدے۔ بیع نامہ میں قابضین کو زمیندار کہا گیا ہے اور انگریز اس معاملہ کو زمینداری کی یا خود ان کے اس لفظ کے ترجمہ کی رو سے ان قصبات کو لگان پر اٹھانے کے حقوقِ خریداری تصوّر کرتے تھے۔

اس کارروائی میں لفظ زمیندار کا ان دو میں سے کوئی ایک مفہوم لیا جا سکتا ہے۔ اپنے عمومی مفہوم میں اس کے معنی "زمین پر قابض" کے ہو سکتے ہیں جو قبضہ کے واقعہ کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس میں جس حق پر قبضہ کا انحصار ہوتا ہے اس کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا اور غالباً اس علاقہ میں اس کے ان دنوں یہی معنی رائج تھے۔ بصورتِ دیگر اس کا مفہوم مسلم حکمراں سے حاصل کیے ہوئے کسی مخصوص حق (یہ جو کچھ بھی رہا ہو) کے تحت زمین پر قبضہ کا ہو سکتا تھا ان میں سے کسی بھی معنی کو شمالی ہندوستان کی تحریروں میں لفظ زمیندار جس طور پر استعمال ہوا ہے اس سے ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا جہاں چودھویں سے اٹھارہویں صدی تک یہ مسلم حکومت کے قبل کے کسی مخصوص حق کے تحت قبضہ کو ظاہر کرتا تھا، یعنی یہ کہ اس کا اطلاق اس طبقہ تک محدود تھا جسے میں نے سرداروں کے لقب سے موسوم کیا ہے۔ گوبند پور اور سوتانتی کے بانی واضح طور پر اس طبقہ کے تحت نہیں لائے جا سکتے تھے اور اتفاقی اعتبار سے بنگال کے سرکاری عملے نے کمپنی کے خریدے ہوئے حقوق کو زمینداری کا نام نہیں دیا تھا۔ ۱۷۱۷ء

میں سرمین کی سفارشات نے فرخ سیر بادشاہ سے ایک فرمان حاصل کیا جس میں منجملہ دیگر شرائط کے انگریزوں کے تینوں قصبوں کے موجودہ حقوق کی تصدیق اور ان مماثل حقوق کے ساتھ دوسری زمینوں کے حاصل کرنے کی منظوری شامل تھی۔ فرمان کے اِس وقت موجود ترجمے میں "تین قصبوں کے لگان پر دیئے جانے کا" ذکر ہے۔ انگریز حکام نے اس فقرہ کو زمینداری کے مساوی تصور کیا۔ لیکن خود فرمان میں جس کے مسودہ کی وزارت مال میں جانچ کی گئی تھی، زمینداری کی نہیں بلکہ تعلقہ داری کا ذکر آتا ہے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ آخرالذکر اصطلاح کا اس وقت تک شمالی ہندوستان میں قبضہ کے مفہوم میں استعمال خواہ حق جو کچھ بھی ہو ہونے لگا تھا۔ پس اس وقت کلکتہ میں زمینداری کا وہی مفہوم تھا جو دہلی میں تعلقہ داری کا، اور شمال کی متعین سرکاری اصطلاح میں ایسٹ انڈیا کمپنی بذریعہ خریداری تینوں قصبوں کی تعلقہ دار ہوئی تھی۔ لیکن تاجروں نے مقامی اصطلاحوں کو مصرف میں رکھتے ہوئے اس کے استعمال کی اشاعت شروع کی۔ وہ ممبر کونسل جس کے سپردگی میں ان تینوں مواضعات کا انتظام دیا گیا، زمیندار کے لقب سے موسوم ہوا اور ان دنوں کے دستور کے مطابق اس کے ہندوستانی مددگاروں پر "کالے زمیندار" کی اصطلاح کا اطلاق کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں انگریزی تحریروں میں وقتاً فوقتاً پائے جانے والے اس تخیل کے کہ لفظ زمیندار ایک ایسے محصل لگان کے مصداق تھا جسے تنخواہ یا کمیشن کی شکل میں، جیسی بھی صورت ہوتی، معاوضہ ادا کرتے تھے جراثیم ملتے ہیں۔ اس مفہوم اور اس کے شمال میں مسلمہ استعمال یعنی مسلم حکومت کے قبل عطا کیے ہوئے حقوق کے تحت بطور ایک موروثی سردار کے درمیان بڑا فرق ہے۔

لہٰذا ہم کمپنی کے حق کے مفہوم کو اسے دیئے گئے ہوئے ناموں سے جو خصوصی نہیں بلکہ عمومی نوعیت کے ہیں، اخذ نہیں کر سکتے۔ تحریروں سے کمپنی کے محصلین کا بظاہر اونچے حکام کی مقررہ زیادہ سے زیادہ شرحوں کی بندش کے تحت پٹوں کا منظور کرنا لگانوں کا وصول کرنا، اور عام طور پر مواضعات کا انتظام کرنا اور لگان کے مقامی وصول کرنے والوں کو تقریباً ۱۲۹۰ روپیہ کی سالانہ رقم کا ادا کرنا جو اسے تین معمول کی قسطوں[11] میں کبھی تو بادشاہ کے لیے اور کبھی قابض جاگیردار کے لیے طلب کرتے تھے، ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ کمپنی کے ذمہ ہر سال بدلتی ہوئی لگان واجب نہ ہوا کرتی، بلکہ یہ ایک مقررہ رقم ادا کرتی تھی جسے (کمپنی سے متعلق انگریز) تاجر ناقابل تبدیل تصور کرتے تھے۔ مجھے شبہ ہے کہ جو چیز انھوں نے حاصل کی وہ[12] اصل میں زمین کی صفائی کے ایک پٹہ کی نوعیت کا پرانا اجارہ تھا اور کمپنی کے اس وعدہ

کا کہ " انھیں (قصبوں کو) سرسبز بنانے پر خصوصی توجہ دی جائے گی " یہی مفہوم ہو سکتا ہے۔ یہ فقرہ خالی زمین کو ترقی دینے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس زمانہ کی حکومت کے کیے ہوئے کسی معاملہ کو " مستقل " کہنا ایک عاجلانہ فیصلہ ہوگا۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ کمپنی کے اپنے حقوق حاصل کرنے کے وقت ادائیگی کی مقررہ رقم پہلے سے مستقل ہو چکی تھی اور گفت و شنید کے دوران مستقبل میں امکانی اضافہ کا سوال بظاہر نہیں اٹھایا گیا۔ کمپنی کے حقوق قبضہ داری اصلاً جو بھی رہے ہوں یہ حقیقت ہے کہ لفظ زمیندار کا پہلے پہل انگریزی میں استعمال اسی سلسلہ میں کیا گیا۔ کمپنی کے حقوق اصلاً اجارہ دارانہ تھے یا کسی اور قسم کے لیکن کلکتہ میں انگریز اسے زمینداری کہنے پر مجبور ہوئے اور وہ اس لفظ سے اسامیوں سے لگان جمع کرنے اور حکومت کو مالگذاری ادا کرنے کے مفہوم میں عادی ہو گئے اور یہ وہی مفہوم تھا جسے وہ بعد میں شمالی ہندوستان لے گئے۔

آیا کہ یہ مفہوم بنگال میں عام طور پر رائج تھا یا محض ہگلی کے قرب و جوار تک محدود تھا، ایک ایسا سوال ہے جس کا ہم عصر ماخذ کی بنیاد پر میں کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں کے دوران کی کسی مقامی تاریخی تحریروں کے مطالعہ کا مجھے کوئی موقع نہ مل سکا اور میں، آئین کی ترتیب اور ۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بحیثیت دیوان تقرر کی درمیانی مدت میں اس صوبہ کی مجموعی صورتِ حال کا کوئی مستند بیان نہیں کر سکتا۔ بہر حال اگر ہمارے لیے سرجان شور کا بعد کا بیان صحیح صورتِ حال کو پیش کرنے کی حیثیت سے قابلِ قبول ہو تو لفظ زمیندار کا پورے بنگال میں وہی مفہوم پایا جاتا تھا، جو اس اصطلاح کا کلکتہ میں تھا۔ شور کو یہ تسلیم تھا کہ عہدِ اکبری کے زمینداران وہی تھے جنھیں میں نے سرداران کہا ہے۔ یہ وہ اشخاص جن کے حقوق حکومت مغلیہ کے قبل کے تھے اور بادشاہ کی منظوری کے تحت انھیں موروثی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن بنگال کی زمینداریوں کی بڑی اکثریت عہدِ اکبری کے بعد وجود میں آئی تھی۔ پہلے تو زمیندار کی حیثیت قطعی طور پر سرکاری یعنی ایک مقررہ بامعاوضہ محصل مالگذاری کی تھی۔ لیکن محصل ارتقائی منازل طے کر کے ایک مقررہ رقم ادا کرنے کے بعد جس قدر بھی ہو سکے نفع کمانے والا مستاجر بن گیا اور پھر مستاجر منزل بہ منزل سردار میں تبدیل ہو گیا اور اس نے موروثی حیثیت حاصل کر کے یہی لقب اختیار کر لیا۔ اس طور پر اس لقب کے تحت سردار، مستاجر اور محصلین سب ہی ایک طور پر شامل ہو گئے۔ اس تذکرہ کی رو سے اٹھارہویں صدی کے بنگال کا زمیندار اس زمانہ کے شمالی

ہندوستان کے تعلقہ دار کا ہوبہو مثنیٰ تھا یعنی ایک قبضہ رکھنے والا شخص، اس کا حق خواہ کچھ بھی ہو۔ یہ خیال، مجھے کم از کم امکانی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اسی عہد کے دوران مالگذاری کی تشخیصوں کے تذکروں کو جو گرانٹ کی کوششوں سے کلکتہ میں رائج ہوئیں اور جو اس موضوع پر حالیہ تصنیفات کا نقطۂ آغاز ہے، قبول کرنا اس قدر زیادہ آسان نہیں۔ بقول گرانٹ کے اس نے اپنی تحقیقات کو آصف جاہ کی قائم کی ہوئی ریاست کے صدر مقام حیدر آباد میں انجام دیا۔ یہاں دکن کے، جس کا ایک حصہ آصف جاہ کے علاقہ میں شامل کیا گیا تھا، مالی نظام کی قلی مرشد خاں کی از سرِ نو تنظیم کے متعلق کاغذات تک اس کی رسائی ہوئی۔ اس نے اپنے ۱۷۸۴ء میں لکھے ہوئے "شمالی سرکار کے پولیٹیکل سروے" میں مرشد قلی خاں کے طریقوں کو ایک معقول حد تک صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن اس میں اس نے اس غلط بیان کا اضافہ کر دیا کہ یہ عہد اکبری میں راجہ ٹوڈرمل کے شمالی ہندوستان میں جاری کیے ہوئے طریقوں کی اندھی تقلید تھی۔ اس کے جلد ہی بعد اس نے اپنی تصنیف "پولیٹیکل سروے" کے نتائج کو اپنی اس سے زیادہ معروف تصنیف "HISTORICAL AND COMPARTIVE ANALYSIS OF THE FINANCES OF BENGAL" میں بنگال کے معاملات پر منطبق کیا، جس کی تمام تر دلیل اس تخیل پر مبنی ہے کہ ٹوڈرمل نے مرشد قلی خاں کے دکن کے طریقوں کے مطابق پورے بنگال کے کسانوں پر مفصل تشخیص کی تھی۔

گرانٹ کے قول کے مطابق بنگال کی تشخیص کی تاریخ اس طور پر تھی:-

(۱) ۱۵۸۲ء کے لگ بھگ، ٹوڈرمل نے کسانوں پر اوسط پیداوار کی چوتھائی کے اعداد پر مطالبۂ مالگذاری کو منفصلاً مقرر کیا۔ اس طور پر مطالبہ کا معیار قائم ہو گیا اور زمین دار اس کے مطابق وصولیاں کرتے تھے۔ یہ زمیندار سالانہ ٹھیکہ لینے والے اجارہ دار ہوا کرتے جن کے کمیشن کی شکل میں معاوضے معین تھے اور ان کے چھوٹی چھوٹی زمینداریوں کے علاقے تھے۔ ان کی جملہ جائز وصولیاں کبھی بھی مطالبہ کے دس فیصدی سے زائد نہ ہوتیں۔

(۲) ۱۶۸۵ء میں شاہ شجاع نے اس مطالبہ پر نظرِ ثانی کی۔ لیکن اس کی بنیاد نہ تبدیل کی گئی۔ چند حاصل شدہ اضافے (غیر واضح نوعیت کے) اور بذریعہ فتح زیرِ تسلط لائے گئے یا دوسرے صوبوں سے بنگال کو منتقل کیے گئے علاقوں کے مطالبات کو بھی اعداد میں شامل کر دیا گیا۔

(۳) مرشد قلی خاں یا جعفر خاں نے ۱۷۲۲ء میں مطالبہ پر اسی طرح کی نظرِ ثانی کی۔

(۴) اس کے بعد سے بنیادی مطالبہ کو بغیر تبدیل کیے ہوئے، زمینداروں پر ابواب کی

شکل میں یکے بعد دیگرے محصول عائد کیے جاتے رہے۔

اگر یہ بیان درست ہے تو "تینوں قصبوں" میں جو صورتِ حال ہمارے علم میں تقریباً ۱۷۰۰ء میں پائی جاتی تھی وہ ۱۵۸۲ء سے ۱۷۲۲ء کے دوران بنگال کی عمومی صورتِ حال کے لیے تقریباً مثالی تھی، یعنی یہ کہ حکومت کی مالگذاری کے مطالبہ میں تقریباً کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور تحریری اضافے خاص طور پر علاقائی تبدیلیوں کے باعث تھے۔ ان کے علاوہ ناقابلِ توضیح اضافے ۱۵۸۲ء اور ۱۶۵۸ء کی درمیانی ۷۶ برسوں کی مدت میں ۱۵½ فیصدی اور اگلے ۶۴ برسوں میں مزید ۱۲½ فیصدی تھے۔ چنانچہ اگر گرانٹ کی اعداد، مطالبہ کو ظاہر کرتے ہیں تو اضافہ تقریباً ناقابلِ لحاظ تھا۔ میں اس کی مبہم توجیہہ سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ وہ اسے عمومی نہیں بلکہ مقامی تصور کرتا تھا، کیونکہ مخصوص علاقوں کی خاص وجوہ کی بنیاد پر دوبارہ تشخیص کی گئی تھی۔ اس طور پر صوبہ کا بہت بڑا جز ایک مقررہ مطالبہ ادا کرتا رہا ہوگا اور اس میں اضافہ صرف سرکاری اعداد سے زائد کی گئی بے ضابطہ وصولیوں کی وجہ سے ہوتا ہوگا۔

آیا کہ گرانٹ کی پیش کی ہوئی اطلاعات درست ہیں، ایک ایسا سوال ہے جس کا میں یقین کے ساتھ کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ اس سلسلہ میں کسی قطعی فیصلہ کا انحصار ان کے ماخذ، قدیم فارسی تحریروں اور دیگر دستاویزات کے جن کا وہ عمومی انداز میں حوالہ دیتا ہے، آزادانہ مطالعہ پر ہوگا اور میں کسی بعد کے ایسے حوالہ کا پتہ نہ چلا سکا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ان میں سے کوئی اب بھی موجود ہیں یا نہیں۔ یہ بہر حال یقینی ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز غلط تھا۔ جیسا کہ شور نے نشاندہی کی ہے اس کا یہ بیان کہ ٹوڈرمل نے اس صوبہ کی تفصیلی تشخیص کی تاریخی اعتبار سے ناممکن ہے۔ علاوہ اس کے یہ آئین کے اس سرکاری بیان سے کہ اکبر نے وہاں تشخیص کے مروجہ طریقہ (نسق) کو برقرار رکھا براہِ راست متضاد رہے۔ لفظ نسق، اس سے اجتماعی تشخیص یا اجارہ داری یا دونوں جو کچھ بھی مراد ہو اس قسم کی کسی تشخیص کو جس کا گرانٹ مدعی ہے خارج از امکان کرتا ہے۔ اس کے اس بیان کو بھی کہ تشخیص کی بنیاد، پیداوار کی چوتھائی پر تھی، غلط ہونا چاہیے، کیونکہ ٹوڈرمل کے زمانہ میں حکومت کا حصہ مسلسل ایک تہائی تھا۔ ایک چوتھائی کا حصہ واضح طور پر گرانٹ کے دکن کی تشخیص کے ابتدائی مطالعوں سے ماخوذ تھا جسے وہ ٹوڈرمل کے طریقوں کی ایک اندھی تقلید تصور کرنے پر مجبور ہوا۔ لہٰذا گرانٹ کے بیان کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اس کی ابتدائی غلط فہمی اس کی پوری دلیل کو متاثر کرتی ہے۔

میری رائے میں گرانٹ کے پہلے والے اعداد کی سب سے زیادہ امکانی تعبیر یہ ہے کہ اس کے استعمال میں لائے ہوئے دستاویزات مطالبہ کے نہیں بلکہ مالیت سے متعلق تھے۔ میں نے ضمیمہ "ز" میں اپنی اس تجویز کے اسباب کے مثل دیگر صوبوں کے بنگال کے، آئین میں مندرج شماریات بھی غالباً اس مالیت کو ظاہر کرتے ہیں جو اس تحریر کی ترتیب کے وقت مروج تھی درج کیے ہیں۔ میری اس تجویز کی بنیاد پر بنگال کے اعداد جسے گرانٹ نے ٹوڈرمل کا تشخیص کیا ہوا مطالبہ تصور کیا درحقیقت ایک نئے فتح کیے ہوئے صوبہ کی ٹوڈرمل کی خود یا اس کے احکام کے تحت قائم کی ہوئی پہلی اور سرسری مالیت تھی جس کی بنیاد فتح کے وقت جو کچھ بھی قابلِ حصول مواد تھا یعنی غالباً سابقہ حکومت کے تیار کیے ہوئے کاغذات پر تھی۔ میری اس تجویز سے یہ بیّن دقت کہ ٹوڈرمل کے لیے مشرقی بنگال کے ان حصّوں پر مطالبہ کی تفصیلی تشخیص کرنا ممکن نہ تھا جن پر اکبر کا قبضہ نہ ہوا تھا، حل ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ دیکھ کر کہ پرانے کاغذات میں چٹاگانگ بنگال کی بادشاہت کے ایک جز کے طور پر دکھایا گیا ہے، اس نے چٹاگانگ پر قبضہ ہو جانے کی توقع میں اس کی آمدنی کو بنگال کی مالیت میں شامل کر لیا ہوگا، اور دوسری طرف یہ ایک بالکل یقینی امر ہے کہ کم ازکم اس خطہ میں وہ اس تفصیلی تشخیص کو انجام نہ دے سکتا تھا جسے گرانٹ نے اس سے منسوب کیا تھا۔

اس لیے ہمیں شاہ شجاع اور جعفر خاں کی کی ہوئی دوبارہ ترمیمات کو اس ابتدائی مالیت میں ایسی تصیحات تصوّر کرنی چاہیے جن میں درمیانی مدّت کے دوران حاصل کیے ہوئے علاقے اور مخصوص رقبوں کے اعداد میں وہ اضافے جو وقتاً فوقتاً کیے گئے تھے شامل تھے۔ یہ تعبیر اس حقیقت سے ہم آہنگ ہے کہ گرانٹ جملہ تینوں کاغذات کو "جمع" (AGGREGATES) کے نام سے جانتا تھا۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو مالیتوں کے لیے موزوں ہے اور جسے لازماً ان کی تحریروں کے سرورق ہونا چاہیے۔ لیکن گرانٹ کے بنگال میں اپنا عہدہ سنبھالنے کے قبل، مالیت کا تخیل متروک ہو چکا تھا اور ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونے والے انسان کے لیے یہ فطری بات تھی کہ وہ "جمع" سے اس کا متبادل مفہوم یعنی مطالبہ جو ہندوستان میں موجودہ صدی تک میں قائم ہے سمجھے۔ بہرحال میری تجویز سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ گرانٹ کی مبسوط بحث بالکل ہی بے محل تھی، کیونکہ یہ بہت ممکن ہے کہ بنگال کے معاملہ میں، مالیت ہی سے فی الواقعی اس مطالبہ کے معیار کو معین کیا جانے لگا ہو جو حکومت کے جانب سے کسانوں پر تو ہرگز نہیں

جیسا کہ اس کا خیال تھا بلکہ درمیانیوں پر جنھیں حکومت تسلیم کرتی ھی عائد کیا گیا تھا۔ بنگال میں صوبجاتی دیوان کو سترہویں صدی کے شروع میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ مخصوص کی ہوئی (خالصہ) زمین سے زیادہ سے زیادہ مالگذاری کی وصولی اس کا فرضِ منصبی تھا جو گرانٹ کے اعداد کی رو سے جاگیر میں دیئے ہوئے رقبہ سے بہت زیادہ تھی لیکن جہاں تک ہمارے علم میں ہے اس کے پاس، اس مالیت کے علاوہ جو بنگال کی مملکت میں شامل کیے جانے پر قائم کی گئی تھی، مقامی تشخیص کنندوں کے کام کی جانچ کرنے کی غرض سے کسی معیار کے قسم کی قطعاً کوئی چیز نہ تھی۔ تشخیص کنندوں کو آزاد چھوڑ دینا مغلوں کے انتظامِ حکومت کے طریقوں کے سراسر خلاف تھا اور ان کی تشخیصوں کی بذریعہ مالیت جو دیوان کے دفتر میں واحد قابلِ حصول کاغذ تھا، جانچ کرنا اور سالانہ تشخیصوں کے اس معیار سے کم ہونے کی صورت میں ان سے جواب طلب کرنا، ایک کھلا ہوا راستہ تھا۔ اگلی نصف صدی تک تشخیصوں کے فی الجملہ اس معیار سے زائد ہونے کی شکل ہی سے توقع کی جا سکتی تھی کیونکہ اس اثنا میں غیر ملکی تجارت میں خلل واقع ہو جانے کے نتیجہ میں چاندی کی قلت واقع ہونے سے قیمتیں غیر معمولی طور پر کم رہیں اور صوبہ میں عمومی کساد بازاری پیش آئی۔ چنانچہ ۱۶۵۸ء میں جب مالیت پر نظرِ ثانی ہوئی تو کسی عمومی اضافہ کے جواز میں کوئی جمع کیا ہوا مواد موجود نہ تھا گو مخصوص خطوں میں وہ مختصر اضافہ ہوا ہو گا جو گرانٹ کے اعداد میں دکھایا گیا ہے۔

ان ایام میں ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں کی درآمد کی ہوئی چاندی کے زیادہ افراط کے باعث اقتصادی حالات تیزی سے تبدیل ہونا شروع ہوئے اور گرانٹ کا گمان غالب تھا کہ شروع میں یہ تبدیلی رسمی مطالبہ کے اضافہ میں نہیں بلکہ نجی محصولوں کے عائد کیے جانے میں ہوئی۔ اگر یہ حقیقت ہے تو فی الواقعی اضافہ کو ماتحت عملہ کے جانب سے خرد برد کر لیے جانے کے باعث باضابطہ دستاویزوں میں درمیانیوں پر مطالبہ کے جس کا انحصار ابتدائی مالیت پر ہونے لگا تھا بطور ایک مستقل رقم کے دکھائے جانے کی توجیہہ، اورنگ زیب کے عہد میں مغلیہ انتظامیہ کے انحطاط سے کی جا سکتی ہے اور اس طور پر ہم اس صورتِ حال تک پہنچیں گے جسے گرانٹ نے اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل کے متعلق پیش کیا ہے یعنی درمیانیوں پر ایک ایسا مطالبہ جو تقریباً ایک صدی سے زائد تک محض نام کے لیے تقریباً غیر تبدیل شدہ رہا، لیکن جس میں ابواب کے ذریعہ

جنھیں پہلے نجی طور پر وصول کیا گیا پھر باضابطہ کاغذات میں درج کیا گیا اضافہ ہوا اور یہ تدریج بڑھتا گیا، یہاں تک کہ تقریباً ۱۷۵۵ء میں درمیانیوں پر تحریری مطالبہ کی میزان ابتدائی معیار کی تقریباً دوگنا ہوگئی۔

یہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ گرانٹ کے بیان کی توجیہہ قیاسی ہے۔ میرے اسے پیش کرنے کے اسباب اس طور پر ہیں:۔ اوّل تو یہ بیان جیسا کچھ بھی ہے، مملکتِ مغلیہ کے معروف انتظامی طریقوں کے منافی تھا اور دوسرے یہ کہ بنگال کی اٹھارہویں صدی کے حالات کے متعلق جملہ حالیہ مباحث میں اسے ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ بات بالکل ہی ناقابلِ قیاس نہیں ہے کہ اکبر کے انتظامی عہدہ داروں نے شروع ہی سے اپنے معمول کے سراسر مخالف طریقے اختیار کرتے ہوئے، بنگال میں ایک ایسا مطالبۂ مالگذاری قائم کیا ہو جو عام طور پر سال بہ سال تبدیل نہ ہوتا ہو، بلکہ مجھے تو یہ بہت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کی اس انوکھی خصوصیت کو غیر معمولی حالات کے دباؤ کے تحت تدریجی نشوونما حاصل ہوئی یہاں تک کہ ان اعداد نے جو ابتداً جاگیروں کی منظوری کے سلسلہ میں استعمال کیے جانے کے لیے تیار کیے گئے تھے بالآخر درمیانیوں پر بار بار عائد کیے جانے والے مطالبہ کے لیے ایک ایسے معیار کی شکل اختیار کر لی جس میں تبدیلی نہ ہو سکتی تھی لیکن اس میں ان طریقوں پر ابواب کے ذریعہ اضافہ ہو سکتا تھا جن کا گرانٹ ذکر کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گرانٹ کے دکن سے بنگال لائے ہوئے محکم خیالات نے بنگال میں اس کے پورے کام کو متاثر کیا اور جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے مجھے اس کے استعمال کیے ہوئے دستاویزات کے ذریعہ شماریات کے متعلق اس کی تعبیر کی جانچ کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس کے بیان پر مبنی ایک مفروضہ پیش کروں جو غالباً اس عہد کے محفوظ کاغذات کو سمجھنے میں مدد کر سکتا ہے۔

اس مفروضہ کی بنیاد پر ہم عارضی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکبر کے بنگال کو فتح کرنے کے وقت کچھ سردار اور کچھ پہلے سے جمے ہوئے اجارہ دار موجود تھے جن کی تعداد کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اور یہ دونوں طبقے بطور مطالبہ کے ایک مقررہ رقم ادا کرتے تھے اور یہ کہ اس طور پر زیرِ قبضہ رقبوں کے علاوہ سرکاری عملہ یا جاگیردار مواضعات کے ساتھ اجارہ داران یا چودھریوں کی وساطت سے معاملہ کرتے تھے۔ صوبہ کی مالیت سے جو بنیادی طور پر انتظامی استعمال کی غرض سے قائم کی گئی تھی، کسی اور مواد کی غیر موجودگی میں سرکاری مطالبہ کا معیار متعین ہونے

لگا اور بقول شور سرکاری عمل نے مالیت کی رقم ادا کرنے والے اور زیادہ سے زیادہ ممکن امداد حاصل کرنے والے اجارہ دار کی حیثیت اختیار کر لی۔ جیسے جیسے وقت گذرا سرداروں، اجارہ داروں اور سرکاری عملہ کے درمیان امتیاز اٹھتا گیا کیونکہ ان مختلف عہدوں کی حیثیتوں کے درمیان حقیقتاً کوئی فرق نہ تھا اور سب کے سب ایک طرف سے زمیندار کہے جانے لگے۔ انگریزی تحریریں جن کا پہلے حوالہ آچکا ہے یہ نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ تغیر سترہویں صدی کے ختم ہونے تک مکمل ہو چکا ہوگا، لیکن ان تحریروں کا اطلاق اس قدر کم رقبہ تک محدود ہے کہ اس موضوع پر کسی فیصلہ تک پہنچنے کے لیے مزید شہادت کی ضرورت ہوگی۔ گو درمیانیوں پر مطالبہ کو باضابطہ طور پر نہ بڑھایا گیا مگر سترہویں صدی کے نصف آخر میں پیش آنے والی تجارت کی بحالی اور ترقی کے نتیجہ میں جو منافع ہوا اسے سب کا سب انھیں نہ لینے دیا گیا۔ موجودہ مطالبہ میں محصولوں کے ذریعہ اضافہ کیا گیا جو وقتاً فوقتاً بڑھائے گئے اور جنھوں نے درحقیقت ملک کی پیداوار میں حکومت کے حصہ کے استحقاق کو برقرار رکھنے میں اعانت کی۔ گو کہ پیش آنے والی تبدیلیاں اس استحقاق کی بنیادی نوعیت پر پردہ ڈالنے کا لازمی رجحان رکھتی تھیں۔ سب سے شروع کے برطانوی انتظامی عہدہ داروں کو اس قسم کی غیر واضح صورت میں ایک قابلِ عمل زرعی نظام تک پہنچنے کے لیے راہ تلاش کرنا پڑی۔

حوالہ جات باب-۷

۱؎ مالوہ کے لیے بیلی (BAYLY) ۲۵۳۔ گجرات کے لیے ۵ تا ۱۶ اور جا بجا۔

۲؎ فرشتہ کے حوالے ۱۸۶۳ء کے کانپور کے لیتھوگراف کے متن سے دیئے گئے ہیں۔ میں نے اس کے بمبئی ایڈیشن سے متعلقہ عبارتوں کی جانچ کی ہے اور مجھے کوئی اہم فرق نہیں ملا۔ برگس کا ترجمہ اس کی استعمال کی ہوئی اصطلاحوں کی بے قاعدگی کے باعث، بہ اعتبار نظم ونسق کی تفصیلات کے بالکل بے کار ہے۔

۳؎ گرانٹ ڈف کے لیے ملاحظہ ہو اس کی (1) HISTORY OF THE MAHRATTAS ۹۵ (۱۸۲۶ء ایڈیشن)۔ رابرٹسن کی رپورٹ SELECTION OF PAPERS FROM RECORDS OF THE E-I. HOUSE,

(۱۸۲۹ء) ص ص ۳۹۷ و مابعد میں موجود ہے۔

۷ے گرانٹ کے تذکرہ پر اگلے باب میں بحث آئی ہے۔

۸ے بادشاہ نامہ (۱)، (۲)، ۲۰۵، (۲) ۱۰۷ وصفحات مابعد۔

۹ے مرشد قلی خاں کے کارناموں کے لیے ملاحظہ ہو مآثر الامرا (۳)، ۴۳۰ وصفحات مابعد اور خوانی خاں (۱)، ۷۳۱ وصفحات مابعد۔ خوانی خاں کی عبارت غیر واضح ہے اور ص ص ۷۳۱، ۷۴۱ پر عبارتیں تفصیلات میں متضاد اور اس قدر زیادہ مختصر ہیں کہ انھیں از خود مشکل ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک واحد مخطوطہ ص ۷۳۲ نوٹ میں دیا ہوا مفصل بیان واضح اور قطعی ہے۔ یہ مآثر الامرا میں مندرج بیان سے اس قدر زیادہ مطابقت رکھتا ہے کہ غالباً ان میں سے ایک الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ، دوسرے سے نقل کیا گیا ہے یا پھر دونوں ہی ایک مشترک ماخذ سے لیے گئے ہیں۔ ہر ایک صورت میں انھیں بمنزلہ ایک واحد سند کے تصوّر کرنا چاہیے۔ اس مرشد قلی خاں کو اسی نام کے ایک دوسرے عہدہ دار سے جو نصف صدی بعد بنگال کی ایک بہت اہم شخصیت کے طور پر ابھرا اور جو جعفر خاں کے لقب سے زیادہ مشہور ہوا مختلف خیال کرنا چاہیے۔

۱۰ے میں نے اس امر کے متعلق کہ خاندیش یا برار میں ہل پر لگانوں کا رواج تھا کسی براہِ راست سند کا پتہ نہیں چلایا ہے لیکن اگر ایسا تھا تو یہ بات اس بیان کے اکبر کے تحت ان صوبوں میں نسق کے ذریعہ تشخیص کا قاعدہ تھا متناقض نہ ہوگی۔ چودھری یا اجارہ داران پورے موضع کے لیے کوئی یکمشت رقم ادا کرنے کے پابند ہو سکتے تھے اور پھر وہ اس رقم کو زیر کاشت رقبہ یا کاٹی ہوئی فصل کے بجائے ہلوں کی بنیاد پر کسانوں پر تقسیم کر سکتے تھے۔

۸ے PURCHAS HIS PILGRIMAGE طبع چہارم میں میتھولڈ کی تصنیف RELATIO-OF THE KINGDOM OF GOLKONDA اور سمندری سفروں کے دلنذیز ی مجموعہ موسومہ BEGINENDE VOORTGANGH VANDE... O. I. COMPAGNIE [(۲) ۷۷، صفحات مابعد] میں DESCRIPTION OF THE DOMAINS OF KING KOTAPIBA

۹ے امپیریل گزیٹیر (۱۳)، ۲۸۰

۱۰ے BRITISH INDIA ANALYSED، ص ص ایک اور مابعد۔ کتاب کا مصنف گمنام ہے لیکن برٹش میوزیم کی فہرست میں GREVILLE کے نام کے تحت درج ہے۔

۱۱ے بادشاہ نامہ (۱) (۱)، ۴۳۴، ۴۳۷۔

۱۲؎ متعلقہ تحریروں کا خلاصہ EARLY ANNALS اور OLD FORT WILLIAM میں درج ہے۔ تینوں قصبوں کے بیع نامہ کی نقل برٹش میوزیم ایڈیشنل ۲۴۰۳۹، نمبر ۲۹ میں ہے۔

۱۳؎ فرمان کا متن معہ ترجمہ کے انڈیا آفس ریکارڈس، ہوم مسی لے نیس، جلد ۶۹، ص ۱۳۰ پر درج ہے۔ مزید مواضعات کی منظوری کا نفاذ نہ ہوا، لہذا ان کے متعلق وضاحتی دستاویزات نہیں ہیں۔

۱۴؎ فرمان میں سالانہ ادائیگی کو ۱۱۹۵ روپیہ ۶ آنے بتایا گیا ہے۔ لیکن کمپنی نے لگان کو ۱۲۸۱-۶-۹ روپیہ لکھا ہے۔ EARLY ANNALS (۲) (۱)، ۱۶ اور ۱۷۰۱ء کے بعد کے برسوں سے تحریری ادائیگیوں کی میزان تقریباً ۱۲۹۰ روپیہ آتی ہے۔ جس قسم کے روپیہ میں ادائیگی کی جاتی اس کے اعتبار سے صحیح رقم تھوڑی گھٹ بڑھ جاتی تھی۔ میرا قیاس ہے کہ زائد رقم، اصل لگان میں بڑھائے ابواب کو ظاہر کرتی تھی اور کمپنی کی درخواست [۲: ۶۰] میں اس فقرہ کے کہ "تھوڑا زائد" "لگان کی رقم ... بادشاہ کے کاغذات کے مطابق ۱۱۹۴ روپیہ ۱۴ اور قدرے زائد ہے جو ہر سال خزانہ میں داخل ہوتی ہے" کے یہی معنی ہو سکتے ہیں۔

۱۵؎ EARLY ANNALS، [(۲)(۲)، ۶۰]۔ ۱۷۱۷ء کے دستاویزات کے ترجموں میں ایک فرق پایا جاتا ہے۔ بادشاہ کے فرمان یا عام منظوری کے ساتھ مخصوص احکام کا ایک مجموعہ تھا جس میں ہر امر کی علیحدہ علیحدہ تفصیل درج ہے۔ ان میں سے اٹھائیسواں زمین کی منظوری سے متعلق ہے۔ فرمان کے ترجمہ میں "لگان پر دینے کا" ذکر ہے جب کہ احکام میں "اجارہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور چونکہ ترجمہ اسی وقت اور غالباً اسی عملے نے کیا تھا اور بہت ممکن ہے کہ فرق کا سبب اصل نسخوں کی زبان کا فرق ہو۔ میں اس حکم کی فارسی عبارت کا پتہ نہ چلا سکا، لہذا اس مسئلہ پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کا امکان ہے کہ ترجمہ میں "فارمنگ" کا لفظ غیر موجود اصل میں اجارہ کی جگہ ہو۔

۱۶؎ شور کی ۲ اپریل ۱۷۸۸ء کی یادداشت جو فرمنگر (۲)، ۳۷ میں دوبارہ طبع ہوئی۔

۱۷؎ گرانٹ کی دونوں تحریریں ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات پر سلکٹ کمیٹی کی پانچویں رپورٹ ۱۸۱۲ء کے ضمیموں کے طور پر طبع ہوئی تھیں، "SURVEY" بطور ضمیمہ ۱۳ "ANALYSIS" بطور ضمیمہ ۴۔ ان کے کچھ اجزاء پر آر کڈیکن فرمنگر نے پانچویں رپورٹ کے اپنے حالیہ ایڈیشن

میں اور مسٹر اسکولی نے EARLY REVENUE HISTORY OF BENGAL، ۱۹۱۷ء
میں بحث کی ہے۔ میں نے گرانٹ کی بعض تصنیفوں کا جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسایٹی جنوری
۱۹۲۶ء ص ۴۳ پر جائزہ لیا ہے۔ لیکن میں نے اس مقالہ کی تحریر کے وقت ' AGGREGATE
کی اصطلاح میں جو ابہام مخفی تھا اسے پوری طرح محسوس نہ کیا تھا۔

۱۸ ANALYSIS ، ۲۵۵ صفحات مابعد۔ مجھے جاگیروں کے متعلق گرانٹ کے اعداد کی
اہمیت کے متعلق شبہ ہے۔ یہ اپنی آپ وضاحت نہیں کرتیں اور ان کی ایک سے زائد طریقوں
پر تعبیر کی جا سکتی ہے۔ لیکن بہر حال مخصوص کیے ہوئے رقبے اہم تھے۔

۱۹ میں نے ' FROM AKBAR TO AURANGZEB ' میں ان امور پر بحث کی ہے۔
میں نے وہاں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ملک کے اندر چاندی کا سالانہ خرچ بقدر ۵۰ لاکھ روپیہ کے
ہو سکتا تھا۔ گرانٹ کا دعویٰ خرچ کے کم از کم بقدر ایک کروڑ روپیہ سالانہ ہونے کا ہے، لیکن یہاں
بھی مجھے اس کے بیان کی سند مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔

باب ■

خلاصہ

میں نے مسلم حکومت کی چھ صدیوں کی مدت کے دوران مروجہ زرعی نظام کے متعلق جس قدر شہادتیں مہیا کی ہیں انھیں گذشتہ ابواب میں پیش کیا گیا ہے۔ قارئین جو اسے ابھی تک پڑھتے چلے آئے ہیں غالباً میرے اس تاثر میں شریک ہوں گے جس کے ساتھ میں اس موضوع سے رخصت ہوتا ہوں۔ اس موضوع پر زمانی و مکانی دونوں ہی اعتبار سے شہادت کی تقسیم غیر مساوی ہے۔ ہم بعض ایسے ادوار کے متعلق اگر سب کچھ نہیں تو بہت کچھ جانتے ہیں جن کے دوران حکومت نے چند یا تمام کسانوں کے ساتھ جو اس کے اقتدار کو تسلیم کرتے تھے براہ راست تعلق قائم کیا۔ لیکن اگر انھیں وقت کے پیمانہ سے ناپا جائے تو یہ عہد محض حکایتی ہوں گے اور ہمیں بقیہ واقعات کا اس سے نسبتاً بہت ہی کم علم ہے۔ چند بڑی شخصیتوں کے نام، مثلاً علاء الدین، شیر شاہ یا اکبر، ٹوڈرمل یا مرشد قلی خاں ایسے ہیں جو ایک دھندلکے کے سمندر میں نمایاں طور پر پہاڑ کی چوٹیوں کے طرح ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کی اہمیت کو بجا طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس زیادہ وسیع ترحصۂ ملک کے منظر پر نگاہ ڈالیں جسے اس دھندلکے نے، اپنے اندر چھپا رکھا ہے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے اس منظر کو پوری طور پر پیش کیا ہے، لیکن بعض مقامات پر اس کے اجزا کی موقع بہ موقع جھلکیاں اس دھندلکے کے اندر دیکھی جاسکتی ہیں اور میں آنے والے اوراق میں ان جھلکیوں پر مبنی واقعات کی ایک فرضی تعمیر نو شہادتوں سے مصدق حقیقت کے طور پر نہیں بلکہ عارضی نتائج کے طور پر پیش کروں گا

جن کی مزید معلومات کی روشنی میں توثیق یا ترمیم کی جا سکتی ہے۔

مجھے یہ ایک امکانی نقطۂ نگاہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلم حکومت کے قیام کے فوراً قبل شمالی ہندوستان میں ہندو بادشاہ یا سرداران مختص طور پر تو نہیں مگر معمولاً ایک موضع یا کبھی کبھی مواضعات کے ایک مجموعہ کے ساتھ بطور ایک اکائی کے معاملہ کرتے اور مطالبہ مالگذاری کو جو فصل بہ فصل یا سالانہ واجب الادا ہوتا، چودھری یا کسی اجارہ دار سے جیسا حالات اجازت دیتے، طے کیا کرتے تھے۔ اس کا مقصد بادشاہ یا سردار پیداوار کے جس قدر حصّہ کا بھی دعویدار ہوتا اس کے مطابق رقم کو وصول کرنا ہوتا، لیکن اس معاملہ میں سودے بازی کا ایک عنصر شامل رہا کرتا اور یہ انتظام چودھریوں یا اجارہ داروں کے لیے لازمی طور پر حصول معاوضہ کا موقع فراہم کرتا جو کم از کم اس قدر ہوتا کہ ان کی شرکت کو نفع بخش بنا دینے کے لیے کافی ہو۔ موضع کے اندر چودھری اس مطالبہ کو منفرد کسانوں سے اس نواح کا جو بھی دستور ہو اس کے مطابق ہل پر محصول عائد کر کے یا بذریعہ بٹائی یا پیمائش وصول کیا کرتے اور بادشاہ یا سردار کو یہ اختیار حاصل رہتا کہ وہ جس وقت چاہے چودھری یا اجارہ دار کو علیحدہ کر کے جو بھی معمول کا طریقہ ہو اس کے مطابق کسانوں سے براہ راست تعلق قائم کرے۔

ایک ایسے ماحول میں مسلم حکومت کا قیام ان دو میں سے کوئی ایک شکل اختیار کرتا۔ ہندو بادشاہ یا سردار کے اطاعت اور خراج کی ادائیگی کو قبول کر لینے کی صورت میں حالات بدستور سابق برقرار رہتے بجز اس کے کہ سردار جس کی حیثیت اب بادشاہ کی نہ رہ جاتی، غالباً خراج کی رقم کو اپنے مواضعات سے ان پر مطالبہ کو بڑھا کر پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ عمل ہمیشہ تو نہیں، لیکن بعض صورتوں میں ممکن ہو سکتا تھا۔ بادشاہ یا سردار کے اطاعت نہ قبول کرنے اور بذریعہ فتح اپنی حیثیت سے محروم ہو جانے کی صورت میں، فاتح ان کی جگہ آجاتا اور غالباً مواضعات کے ساتھ موجود تعلقات کو بطور کم از کم مزاحمت کی راہ کے جب تک ایسے حالات نہ پیش آجاتے کہ تبدیلی ضروری ہو جاتی، جاری رکھتا۔

پہلی تحریری تبدیلی وہ ہے جس پر علاءالدین خلجی نے عمل کیا اور جن محرکات سے اس کا متاثر ہونا مورخ بیان کرتا ہے، اس خیال سے مطابقت رکھتا ہے کہ میں نے جس صورتِ حال کو بطور ایک معروضہ کے مختصراً بیان کیا ہے وہ تیرہویں صدی میں حقیقتاً پائی جاتی تھی۔ ہماری اطلاع ہے کہ سرداران اور چودھری، بادشاہت کی آمدنی کے ایک جز پر متصرف ہو رہے تھے جو سیاسی

اعتبار سے انھیں خطرناک بنا رہا تھا اور یہ کہ مطالبہ کا بار مضبوط اور کمزور کے درمیان مساوی طور پر تقسیم تھا۔ نتیجتاً علاءالدین نے سرداروں اور چودھریوں کو علیٰحدہ کر دیا اور بادشاہت کے ایک بڑے حصّہ کے کسانوں سے براہ راست تعلق قائم کر کے اس وقت کے مروجہ تفصیلی تشخیصوں کے طریقوں میں سے کسی ایک کو عمومی استعمال کے لیے پسند کر لیا۔

اس عہد کے حالات کے اندر اس کے اس عمل کو ایک غیر معمولی طور پر طاقتور منتظم کی قوّت کا کارنامہ تصور کرنا چاہیے اور اس کا قائم کیا ہوا نظام اس کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس کے بہت ہی تھوڑے برسوں بعد ہم مستاجروں اور ان کے دلالوں کو وزارت مال کو تنگ کرتا ہوا پاتے ہیں۔ یہ انتظام ہمارے قائم کیے ہوئے اس مفروضہ پر کہ مستاجری پہلے سے رائج تھی، انتظامی انحطاط کے زمانہ میں بالکل فطری تھا، لیکن اگر مستاجری پہلے رائج نہ تھی تو اس کی توجیہہ کرنا تقریباً ناممکن ہوگا۔ اس کے تھوڑے بعد ہم تفصیلی نظم ونسق کے بار کے خاص جز کو جاگیرداروں پر منتقل ہوا دیکھتے ہیں جو اسے بہت ہی مختصر وقفوں کے ساتھ اٹھارہویں صدی تک چلاتے رہے۔

اس تاریک دور کے لیے جو شیر شاہ اور فیروز تغلق کے درمیان میں واقع ہے، ہمیں اس امر کے خفیف سے مگر معنی خیز اشارے ملتے ہیں کہ موضع ہی وہ اکائی تھی جس کے ساتھ بادشاہ اور جاگیرداران معمولاً معاملہ کرتے تھے۔ شیر شاہ کے مستحکم انتظام حکومت کی نمایاں خصوصیت، بادشاہت کے ایک جز میں کسانوں کے ساتھ براہ راست تعلق کی بحالی تھی اور اکبر نے بھی اس کی مثال پر کچھ دنوں تک عمل کیا۔ لیکن وسط سترہویں صدی تک موضع نے پھر ایک اکائی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہ صورت مسلم حکومت کے ختم ہونے تک قائم رہی۔

میرے خیال میں یہ نتیجہ بجا طور پر نکالا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے حالات کے تحت منفرد کسانوں کے ساتھ براہ راست تعلق پر مبنی کوئی نظام، بحیثیت ایک عمومی اور مستقل انتظام کے قابل عمل نہ تھا۔ ایک غیر معمولی طور پر مستحکم انتظامیہ اسے ایک وسیع رقبہ پر تھوڑے دنوں تک کامیابی کے ساتھ چلا سکتا تھا۔ بلاشک منفرد سرداران اور جاگیرداران بھی ایک چھوٹے پیمانہ پر ایسا ہی کر سکتے تھے۔ لیکن اس صورت میں انتظامی بار اس قدر بڑھ جاتا جو زیادہ دنوں قابل برداشت نہ ہوتا۔ موضع اپنی جگہ موجود تھا اور کم از کم مزاحمت کی راہ یہ تھی کہ اس کی مالگزاری کے لیے، اس کے چودھری یا مستاجر کے ساتھ جیسا بھی حالات اجازت دیں، سودے بازی کی جائے۔

گو کہ معمولاً تشخیص میں سودے بازی کا عنصر شامل رہا کرتا، لیکن پیداوار میں ایک معین حصہ لینے کا بنیادی تخیل قائم رہا۔ ہمارے علم میں ہے کہ علاءالدین پیداوار کا نصف طلب کیا کرتا اور یہ ممکن ہے کہ یہ تیرہویں صدی میں طلب کیے ہوئے حصہ سے تھوڑا بہت زائد رہا ہو کیونکہ اس کا مقصد سرداروں اور چودھریوں کو اس آمدنی کے ایک جز سے جو وہ پہلے حاصل کرتے تھے محروم کرنا تھا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے جانشین نے کسی نہ کسی قسم کی تخفیف کی تھی لیکن اس کی مقدار کہیں درج نہیں اور اس کے بعد کا مسلمہ واقعہ شیر شاہ کا ایک تہائی مطالبہ تھا۔ مجھے یہ ممکنات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تناسب جدید نہیں بلکہ قدیمی تھا اور کسی تحریر کی غیر موجودگی میں یہ قیاس غالباً بجا ہوگا کہ علاءالدین کی وفات کے بعد نصف سے تہائی کی تخفیف ہوئی تھی اور یہ کہ یہی تناسب بطور ایک معیار کے سترہویں صدی کے نصف اول میں کسی وقت تک قائم رہا جب کہ زیادہ سے زیادہ مطالبہ کو بڑھا کر نصف کر دیا گیا۔ بنا بریں یہ ممکنات میں سے ہے، گو قطعاً ثابت نہیں کہ ایک تہائی حصہ جسے ہندوؤں کے مقدس قانون کے شارحین زیادہ سے زیادہ جائز مطالبہ کے طور پر تسلیم کرتے تھے حقیقتاً شمالی ہندوستان میں بارہویں صدی کے دوران ایک عمومی مطالبہ کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ کہ مسلم فاتحین نے اسے قبول کر لیا تھا اور یہ کہ علاءالدین کے وقتی اقدام کے علاوہ یہ عہد مغلیہ تک بطور ایک روایتی معیار کے قائم رہا اور ہر شخص اس سے اس قدر زیادہ واقف تھا کہ وقائعوں میں اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی گئی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بارہویں صدی میں عام قاعدہ زیادہ لچک دار یعنی مطالبہ، حالات کے لحاظ سے ایک تہائی سے ایک نصف تک تبدیل ہوتا رہا ہو اور یہ کہ منفرد مسلم حکمران ان میں سے کسی نہ کسی کو جسے مناسب تصور کرتے پسند کر لیتے تھے اور یہ کہ اورنگ زیب کے فرمانوں میں جس مطالبہ کی نشاندہی کی گئی ہے وہ ملک کی قدیمی روایات کے مطابق تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اودے پور میں موجودہ صدی تک مطالبہ ایک تہائی یا ایک نصف تھا اور یہ صورت اسی روایت کی یادگار ہو سکتی ہے جو مسلمانوں کے طریقہ سے متاثر نہ ہوئی تھی۔ موجود شہادت کی بنا پر ان میں سے کوئی بھی ایک مفروضہ قابل قبول ہو سکتا ہے مگر بطور ایک نتیجہ کے ہرگز نہیں بلکہ نئے ظاہر ہونے والے واقعات کو جانچنے کی ایک بنیاد کے طور پر۔

کسانوں کی ادائیگیوں کی شکل کے متعلق ہمارے علم میں ایسے دو مواقع آئے ہیں جب مخصوص اسباب کی بنا پر مطالبہ کو غلہ میں جمع کرنے کا حکم دیا گیا اور ہم جانتے ہیں یا ہمارے ایسا

سوچنے کا سبب موجود ہے کہ بعض پچھڑے ہوئے علاقوں میں، یہی طریقہ مستقلاً رائج رہا۔ لیکن شمال میں غلہ کی عام وصولی کے زمانے واضح طور پر قلیل المیعاد طریقوں کی حیثیت میں تھے اور ہمیں تیرہویں صدی اور اس کے بعد سے نقدی ادائیگی کو ایک عام قاعدہ تصور کرنا چاہیے۔ مجھے ایسے چودھریوں اور مستاجروں کی ایک بھی مثال نہ مل سکی جس میں انھوں نے غلہ میں ادائیگی کی ہو اور چونکہ ان کے ساتھ تشخیص معمولاً نقد میں کی جاتی۔ لہٰذا ہم بلا تامل یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ادائیگی بھی اسی شکل میں ہوتی تھی۔ آیا کہ نقد ادائیگی مسلمانوں کی فتح کے قبل رائج تھی یا نہیں ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ہندو تحریروں کے طالب علموں کے سپرد کرنا مناسب ہوگا۔ لیکن یہ مسلم انتظام حکومت کی قطعی طور پر ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

جب ہم اس عہد پر فی الجملہ نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں کسانوں کی قسمت کی مالک دو ممتاز شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ ان میں نہ تو بادشاہ اور وزیر ہیں اور نہ ہی تشخیص کنندہ اور محصل بلکہ اجارہ دار اور جاگیردار ہیں۔ یہ دونوں ادارے آپس میں ایک دوسرے کو خارج کرنے والے نہ تھے، کیونکہ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے جاگیردار بھی کبھی کبھی اپنی آمدنی کو اجارہ پر دے دیتے تھے یہ دونوں مل کر پورے زرعی نظام کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے کوئی اجارہ بنیادی طور پر خراب نہیں، لیکن دونوں کے متعلق ان کے حالات کے لحاظ سے بلکہ سب سے زیادہ ان کی مدت کے لحاظ سے رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ بطور ایک تاریخی حقیقت کے، مسلم ہندوستان میں اجارہ داروں کے مثل جاگیرداری کی قبضہ داری، ترقی کی کسی تعمیری پالیسی پر سرمایہ یا کوشش صرف کرنے کے لیے معمولاً بہت کم اور ہمیشہ بہت زیادہ غیر یقینی ہوا کرتی تھی۔ ان کے لیے دانائی کا واحد طریقہ جس پر واقعتاً معمولاً عمل کیا جاتا یہ تھا کہ کسانوں سے جس قدر بھی ممکن ہو وصول کر لیا جائے اور مستقبل کو خود اپنی فکر کرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ وسط سترہویں صدی کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے برنیئر، با اقتدار طبقہ کے افراد سرکاری عملہ، جاگیرداران اور مستاجرجن سب سے وہ مانوس تھا کی زبان میں حسب ذیل دلیل پیش کرتا ہے۔

"اس زمین کی خستہ حالی ہمارے ذہنوں کو کیوں بے چین کرے؟ اور ہم اسے زرخیز بنانے پر اپنا پیسہ اور وقت کیوں صرف کریں؟ ہم اس سے کسی لمحہ محروم کیے جا سکتے ہیں، پھر ہماری محنتیں نہ تو ہمارے اور نہ ہمارے بچوں کے کام آئیں گی۔ ہمیں زمین سے جس قدر رقم ممکن ہو کھینچ لینی چاہیے، کسان خواہ فاقہ کریں یا بھاگ جائیں اور جب چلے جانے کا حکم ہو تو ہمیں اسے ایک

سنسان ویرانہ چھوڑ کر رخصت ہو جانا چاہیے۔"

زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اس دلیل کی معقولیت محلِ نظر نہیں اور جس زرعی نظام کے متعلق یہ پیش کی گئی ہے اس کے لوحِ مزار پر یہ ایک کتبہ کا کام کر سکتی ہے۔

بعض اوقات طالب علموں نے مجھ سے یہ دریافت کیا ہے کہ فلاں فلاں دور کے مروجہ زرعی نظام کو "زمینداری کے زمرہ میں رکھا جائے یا رعیت واڑی" کے۔ اس سوال کے ساتھ کچھ سہوِ زمانی وابستہ ہے، کیونکہ ان دو الفاظ کے درمیان ایک واضح امتیاز محض شروع کے برطانوی انتظامی عہدہ داروں کے مباحث کے نتیجہ میں ظہور میں آیا، لیکن جس حد تک اس سوال کا کچھ جواب دیا جا سکتا ہے وہ اس طور پر ہے کہ مسلم نظام میں معمولاً دونوں عناصر شامل تھے۔ سرداروں کی طاقت اور مرکزی انتظامیہ کی طاقت میں ایک معکوس نسبت پائی جاتی تھی لیکن سردار پورے عہد کے دوران برقرار رہے اور ان کی حیثیت بنیادی طور پر موجودہ زمینداری کی سی تھی۔ وہ ایک پیشگی مقررہ سالانہ رقم کی ادائیگی یا حساب فہمی کے ذمہ دار ہوتے اور اپنے زیر قابو کسانوں سے جس قدر بھی ممکن ہوتا نفع حاصل کرتے۔ مسلم اور موجودہ عہد کے درمیان خاص امتیاز موجودہ قانون مزارعین میں جو زمیندار اور کسانوں کے باہمی تعلق کو مفصلاً معین کرتا ہے پایا جاتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے، مسلم حکومتیں معمولاً سرداروں پر اس قسم کی بندشیں نہ عائد کرتی تھیں۔

دوسری طرف مخصوص کیے ہوئے علاقوں کو ان ادوار کے دوران جب تنخواہ دار عملہ منفرد کسانوں سے معاملہ کرتے تھے، قطعی طور پر رعیت واڑی کہا جا سکتا ہے۔ جب سرکاری عملہ، چودھریوں سے معاملہ کرتا تو ان نمائندوں کی دوہری حیثیت سے عدم یقین کا ایک عنصر شامل ہو جایا کرتا۔ کیونکہ ہر چودھری امکانی طور پر ایک زمیندار ہوتا، گو ان میں کے بہت سے کسانوں کے محض نمائندہ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ پھر جب یہی عملہ اجارہ داروں سے معاملہ کرتا تو ان پر موجودہ زمرہ بندی کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اجاروں کے قلیل المیعاد ہونے کی صورت میں قبضہ کا زمانہ اس قدر غیر یقینی ہوتا کہ اسے زمینداری کے زمرہ میں نہیں رکھ سکتے اور اسے صرف اس عہد کے اختتامی زمانہ میں اس قدر استحکام حاصل ہوا کہ جو اس اصطلاح کے اطلاق کے لیے کافی ہو۔ جاگیردار کی حیثیت بھی اس سے کم مبہم تھی، کیونکہ ایک طرف تو وہ بعض اوقات ایسے اختیارات کو استعمال کرتا جو موجودہ زمیندار کے اختیارات سے مشابہ ہوتے، دوسری طرف اس کے قبضہ

کا زمانہ اس قدر مختصر اور غیر یقینی ہوتا کہ اسے یہ نام نہیں دیا جاسکتا۔ پھر ہمیں باعتبار اشخاص کی کثرت کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ جاگیردار چودھریوں کے ساتھ معاملہ کرنے والے مستاجروں سے اپنی آمدنی حاصل کرسکتا تھا جو اپنی جگہ کسانوں سے معاملہ کرتے تھے اور ایسی صورت میں اب زمینداری کہے جانے والے حقوق مختلف افراد میں تقسیم ہوجاتے تھے۔ پس کسی طالب علم کو ایک رسمی زمرہ بندی کی راہ سے اس موضوع کے طرف قدم نہ اٹھانا چاہیے بلکہ اسے اسی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے جس کے متعلق ہولٹ میکنزی نے ابتدائی انگریز انتظامی عہدہ داروں پر زور دیا تھا یعنی یہ کہ نظری اصولوں اور اصطلاحات سے گریز کرتے ہوئے حقائق پر متوجہ ہونا چاہیے۔

آخر میں جو واقعات اکٹھا کیے گئے ہیں ان کی معاشی اہمیت کے متعلق تھوڑا لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ زرعی ترقی کا تخیل جو دھیرے دھیرے مگر مسلسل آگے بڑھ رہا تھا چودھویں صدی میں پہلے سے موجود تھا اور غالباً یہ کبھی بھی کلیتہً ناپید نہ ہوا تھا۔ لیکن سیاسی اور سماجی ماحول اس کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے سازگار نہ تھا۔ کوئی بھی شخص جو اس کی زحمت برداشت کرے مطالبۂ مالگذاری کے اونچے معیار کو جو پورے معاشی لگان کے تقریباً برابر ہوا کرتا، اسلامی تحریروں کی رو سے جائز ٹھہرا سکتا تھا، لیکن اس کا حقیقی محرک یکے بعد دیگرے قائم ہونے والے انتظام حکومت اور ان کے عہدہ داروں کی ضروریات تھیں اور اس کے تاثرات میں ان متفرق ناجائز دصولیوں سے جو وقتاً فوقتاً ممنوع قرار دیئے جانے کے باوجود ہر ممانعت کے بعد مسلسل پیش آیا کرتیں، لازمتہً شدت پیدا ہوجایا کرتی تھی۔ اس کا براہ راست نتیجہ یہ ہوا کہ کسان سے جس قدر بھی زیادہ سے زیادہ ممکن ہوسکا دصول کرکے اس کے معیارِ زندگی کو مستقلاً گھٹا دیا گیا۔ لیکن اس کے علاوہ اس کا مزید نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے کسان جو روپیہ کمانے والے تھے ان کے لیے ضروری ہوا کہ وہ اپنی جمع کی ہوئی رقم کو گانوں کے باہر کے ہر شخص سے اور غالباً اپنے پڑوسی تک سے خفیہ رکھیں۔ چنانچہ عام صورتِ حال، انتظامیہ اور کسان کے درمیان ایک نزاع کی تھی جس میں انتظامیہ کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ اس چیز کا جسے کسان اپنے پاس رکھنے اور چھپانے کی کوشش کرتا پتہ چلا کر دصول کرلے۔ ایسی فضا میں یہ متوقع نہ تھا کہ زرعی ترقی کا کام زیادہ آگے بڑھ سکے گا۔

اگر تمام زمین مصرف میں لائی جاچکی تھی تو یہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکتی تھی کیونکہ کسانوں کے درمیان مقابلہ کی موجودگی سے ادائیگیوں میں اضافہ اس مقام پر پہنچ جاتا جہاں زندگی اجیرن ہوجاتی یا انتظامیہ اپنے رویہ کو تبدیل کرنے پر مجبور ہوتا جیسا کہ واقعتاً انیسویں صدی

کے دوران ہندوستان کے بیشتر حصہ میں پیش آنے والا تھا۔ پورے مسلم عہد کے دوران، بہرحال معمولاً فاضل زمین موجود تھی اور کسانوں سے محروم ہو جانے کا خطرہ انتظامِ حکومت کی ناجائز وصولیوں سے کچھ رکاوٹ پیدا کرتا تھا۔ میرے خیال میں ایسا ممکنات سے ہے کہ ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں یہ خطرہ حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہو اور یہ کہ وقتاً فوقتاً مقامی طور پر آبادی میں کمی واقع ہوتی رہی ہو گو ایسا کبھی اتنے بڑے پیمانہ پر واقع نہ ہوا جو وقائع نگار کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ لیکن تاریخ میں دو ایسی مثالیں ملتی ہیں: محمد تغلق کے تحت دیائی علاقہ کی ویرانی اور وسط سترہویں صدی کے بعد ایک عمومی معاشی ابتری۔ ان دونوں صورتوں میں، انتظامیہ نے موجود نظام پر تباہ کن حد تک دباؤ ڈالا اور یہ نظام فی الواقعی تباہ ہوا۔ لیکن ان زیادہ طویل وقفوں کے دوران جب کہ یہ نظام کام کر رہا تھا اس کے بدترین ساخت انفرادی قوتِ عمل پر جبر و تشدد اور اضافہ کی کسی متفقہ کوشش کے بجائے ملک کی سالانہ پیداوار کو آپس میں تقسیم کرنے کی لاحاصل جدّ و جہد پر توجہ کا ارتکاز تھا۔ یہ نفع سے زیادہ بار کی یعنی خسارہ کی وہ وراثت تھی جسے مسلم حکومتوں نے اپنے جانشینوں کے لیے چھوڑا اور جس کی آخری بے باقی کی منزل اب بھی بہت دور ہے۔

ضمیمہ الف

مالگذاری زمین کے لیے

ہند۔ فارسی اصطلاحیں

مترجموں نے مسلم عہد کی تحریروں میں زمین کی مالگذاری کے لیے استعمال ہونے والے مختلف الفاظ کو ایک دوسرے کا مرادف خیال کیا ہے اور ان کا ترجمہ "مالگذاریٔ زمین" یا زیادہ مختصراً "مالگذاری" کیا گیا ہے۔ یہ لفظ جیسا کہ ہندوستان میں مستعمل ہے خود ہی مبہم ہے۔ تشریح کے مقصد کے لیے ان میں سے بعض الفاظ کے درمیان امتیاز قائم کرنا اور متعین مفہوم کے محاوروں کے ایک مجموعہ کو مرتب کرنا ضروری ہے۔ اس ضمیمہ میں مندرج نتائج ان تمام موزوں عبارتوں سے ماخوذ ہیں جنھیں میں نے ماخذ کی فہرست (ضمیمہ ش) میں مندرج ہند۔ فارسی تحریروں سے جو طبقات ناصری سے شروع ہو کر اس کے تقریباً پانچ صدی بعد کی تحریر پر خوافی خاں کی سرگذشت پر ختم ہوتی ہے جمع کیا ہے۔

ہمارے موجودہ مقصد کے لیے "مالگذاری" کے مبہم لفظ کو نظر انداز کر دینا قرینِ مصلحت ہوگا میں نے حسب ذیل اصطلاحوں کو ان کے سامنے مندرج متعین مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

پیداوار۔ فصلوں کا مجموعی حاصل خواہ وہ وزن میں یا بہ اعتبار مالیت درج ہو۔

مطالبہ۔ پیداوار کی مقدار یا اس کی مالیت جو حکومت کے حصہ کے طور پر طلب کی جاتی، اس کی تشخیص کا طریقہ اور اس کا دعویدار خواہ کوئی بھی ہو۔

آمدنی۔ کسی فرد کو معافی یا جاگیر میں دیئے ہوئے مطالبہ کی وصول شدہ یا متوقع رقم۔

مالیت۔ کسی رقبہ سے مستقبل میں ہونے والی امکانی آمدنی کا تخمینہ جس کی کسی مقررہ آمدنی کے حق کے دعویداروں کے لیے معافیاں یا جاگیریں متعین کرنے کے سلسلہ میں ضرورت ہوتی۔

غور طلب الفاظ حسب ذیل ہیں:-

۱- خراج- جیسا کہ باب ۱، فصل ۳ میں گذر چکا ہے یہ اسلامی قانون کی ایک متعین اصطلاح ہے۔ اس کا مفہوم وہ مطالبہ ہے جو غیر مسلموں کے قبضہ میں چھوڑی ہوئی مفتوحہ زمین کے لیے طلب کیا جاتا اور عام مسلمانوں کے مفاد کے لیے مخصوص ہوتا- علیحدہ علیحدہ مسلم حکومتوں کے وجود میں آجانے کے بعد، یہ بعد والی خصوصیت عملاً خارج ہوگئی اور خراج کو بادشاہ اپنی سلطنت سے وصول کر کے خود خرچ کرنے لگے۔ یہ لفظ بتدریج تحریروں میں کم ملنے لگتا ہے اور اس کی جگہ دوسرے مندرج ذیل الفاظ آجاتے ہیں- لیکن یہ جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے بیشتر مطالبہ کے معین مفہوم میں ہوا ہے مجھے جو واحد مستثنیات ملے ہیں وہ چند مبالغہ آمیز عبارتیں ہیں جن میں اس کے جمع کا صیغہ "مطالبات" "مطالبہ" نہیں، ایسی وصولیابیوں کے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے جن کی آسانی کے ساتھ شناخت کی جاسکتی ہے۔

۲- مال- اس کا عام مفہوم "دولت یا جائداد" ہے، لیکن انتظامی استعمال میں اس کے دو مخصوص پائے جاتے ہیں۔

(الف) فوجی شعبہ میں اس لفظ کے معنی "جنگ میں حاصل کیا ہوا مالِ غنیمت" تھا۔

(ب) مالیاتی نظم و نسق میں اس کے معنی معمولاً "مطالبہ" کے ہوتے تھے، لیکن کبھی کبھی یہ اس پورے نظام کے وسیع تر مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا جس کے تحت مطالبہ کی تشخیص اور وصولی ہوا کرتی، جیسے کہ فقرہ 'ملکی و مالی' میں جو موجودہ دور کے انتظام "عامہ" اور "مالی" کے مماثل ہے۔

بعض وقت ان دو مفہوموں میں تفریق کرنا مشکل ہوجاتا ہے، جیسا کہ اکبر نامہ [۳، ص ۲۱۶] میں مسٹر بیورج نے اس کا ترجمہ REVENUE کیا ہے، جبکہ میرے خیال کے مطابق BOOTY بہتر ترجمہ ہوتا، کیوں کہ 'مال' کے ناوقت طلب کیے جانے سے جن افسران کے اخلاق خراب ہو رہے تھے وہ معمولاً مطالبہ ادا کرنے والوں کے زمرہ میں نہیں آتے تھے۔ میرے خیال میں اصل نکتہ یہ ہے کہ ان پر مالِ غنیمت کے تصرف کا الزام تھا اور ان سے اس کی حساب فہمی کا اصرار کیا جاتا رہا تھا۔ بہرحال، معمولاً صحیح مفہوم معلوم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

بعض اوقات 'مال' دوسرے الفاظ کے ساتھ ملتا ہے۔ مال واجبی، مطالبہ کے لیے ایک ایسی مسلّمہ اصطلاح ہے جو مبہم نہیں۔ مالگذاری معمولاً توصیفی بہ معنی "مطالبہ ادا کرنے والا" ہوتا ہے۔

خوافی خاں کی تحریروں کے قبل اس کا مستقلاً بطور ایک "مالگذاری ادا کرنے والے" کے استعمال نہیں ملتا۔ خوافی خاں [(۱) ۴۰۷] میں اس کا یہ استعمال موجود ہے۔ مالگذاری، مطالبہ ادا کرنے کے عمل یا طریقِ عمل کو ظاہر کرتی ہے۔ مجھے فارسی تحریروں میں یہ مطالبہ کے اپنے موجودہ مفہوم میں استعمال ہوتا ہوا نہیں ملا ہے۔ لیکن یہ مفہوم ایک بالکل شروع کی برطانوی تحریر [ریونیو سلیکشنز (۱)، ۱۶۹] میں موجود ہے۔

۳۔ اس کے بعد چند مرصع مگر متعین مفہوم کے الفاظ کا ایک مجموعہ جو مطالبہ کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے اور جسے بادشاہ کا معاوضہ تصور کرتے تھے، قابلِ غور ہے۔ یہ بہ معنی مزدوری ایک لفظ مثلاً 'پارنج' یا 'دستِ مزد' اور ایک دوسرے لفظ بہ معنی بادشاہی (مثلاً جہانبانی) یا سرپرستی (پاسبانی) سے مرکب ہیں۔ یہ محض سولہویں صدی کی تحریروں میں مثلاً آئینِ اکبری (۱)، ۲۹۸، ملتا ہے۔

۴۔ 'بازخواست' اور 'بازیافت'، کاشت کاری پر مطالبہ کے لیے کبھی کبھی استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح معنوں میں نظم و نسق کے مالیاتی پہلو سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے معنی معمولاً وصولی کے ہوتے ہیں، یعنی اس کا اطلاق کسی فرد کے ذمّہ حکومت کے حق پر، خواہ 'مطالبہ' کے متعلق ہو، خواہ کسی قرض یا تعرف بے جا کی ہوئی جائداد یا کسی حساب کے بقایا کے متعلق ہو، ہوسکتا تھا۔ جہاں تک میں پتہ چلا سکا ہوں یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے مرادف ہیں۔

۵۔ مطالبہ۔ نسبتاً شروع کی تحریروں میں یہ لفظ "طلب کرنے کے عمل" کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا بحیثیت "مطالبہ" کے جدید استعمال پہلی بار بادشاہ نامہ [(۲)، ۳۶۵] میں ملتا ہے۔ خوافی خاں میں اس کا استعمال بخوبی مستحکم ہوگیا تھا۔

۶۔ محصول۔ یہ لفظ کسی عمومی مفہوم میں نہیں ملتا اور اس کا اصطلاحی استعمال مبہم ہے۔ عام طور پر اس کے معنی 'مطالبہ' کے ہیں، لیکن بعض صورتوں میں یہ قطعاً پیداوار کو اور چند صورتوں میں اوسط پیداوار کو ظاہر کرتا ہے۔ خوافی خاں نے بعض اوقات اس کے پہلے دونوں مفہوموں کے درمیان پیداوار کے لیے 'محصولِ جنسی' اور 'مطالبہ' کے لیے 'محصولِ مال' لکھ کر، تفریق کی ہے۔ [مثلاً (۱)، ۷۳۱، ۷۴۳] لیکن اس نے عام طور پر اپنے سے پہلے مصنفوں کے مثل اس لفظ کو اپنی مرضی سے استعمال کیا ہے اور اس کے مفہوم کی رہنمائی محض عبارت کے سیاق سے ہوتی ہے۔

سب سے شروع کے مصنفین معمولاً اس کے معنی 'مطالبہ' سمجھتے ہیں اور تمام غیر سرکاری تحریروں میں یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کے "پیداوار" کے مفہوم کی ایک واضح مثال،

آئین (۱)، ۲۸۶ میں ملتی ہے جس میں محصول کو کھیت سے ہٹائے جانے کا حوالہ آیا ہے۔ دوسری مثال محمد ہاشم کے نام، اورنگ زیب کے فرمان میں ہے، جہاں (۴۰٬۱۴) 'مطالبہ' کو پیداوار کے نصف پر مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسری جگہوں پر چند ایسی مثالیں ہیں، جن میں اس لفظ کا ترجمہ "پیداوار" کیا جاسکتا ہے لیکن یہ ابہام سے پورے طور پر مبریٰ نہیں ہیں۔

"اوسط پیداوار" کا خصوصی مفہوم، آئین (۱)، ۲۹۷ و صفحات مابعد پر ملتا ہے اور اس کے متعلق کوئی شبہ کی گنجائش نہیں، کیونکہ وہاں باضابطہ تعریف درج ہے، جس کے بعد عددی مثالیں آتی ہیں جن سے اوسط نکالنے کے طریقہ کی وضاحت ہوتی ہے۔ آئین کی ایک یا دو عبارتوں میں بھی اس لفظ کا یہی مفہوم نکلتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا یہ مفہوم صرف دفتری زبان میں تصور کیا جاسکتا ہے۔ غیر سرکاری تحریروں میں یہ مفہوم سمجھنا خطرناک ہوگا۔

۷۔ حاصل۔ یہ محصول کا ہم مشتق لفظ ہے اور اس کی طرح 'مطالبہ' اور 'پیداوار' کے دو معنی رکھتا ہے۔ اور بعض اوقات یہ دونوں الفاظ اسلوب بیان کے تنوع کے خیال سے استعمال کیے جاتے ہیں، مثلاً جہاں جہانگیر نے لکھا ہے (تزک، ۲۵۲) کہ پھل کے درختوں پر کوئی محصول نہیں ہے اور یہ کہ جب مزروعہ زمین پر باغ نصب کیے جاتے تو حاصل معاف کر دیا جاتا ہے۔ یہاں اس لفظ کا واضح مفہوم 'مطالبہ' ہے۔ اس کا مفہوم اتنا ہی واضح طور فقرہ حکم حاصل، میں جسے ضیاء برنی بٹائی کے طریقہ پر تشخیص کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے 'پیداوار' ہے۔

لیکن اس کا سب سے زیادہ استعمال آمدنی کے مفہوم میں ملتا ہے۔ اس استعمال میں یہ 'مالیت' کے بالمقابل آتا ہے، جیسا کہ حسب ذیل عبارتوں میں۔ یاد ہوگا کہ عہدہ داروں کی تنخواہیں معمولاً نقدی مقرر کی جاتی تھیں۔ بعض اوقات تنخواہ شاہی خزانہ سے ادا کی جاتی لیکن عام طور پر اس کے مساوی کسی معینہ رقبہ کا مطالبہ جاگیر میں دے دیا جاتا تھا۔ کسی جاگیر سے فی الواقعی وصول کی ہوئی آمدنی لازمتہً فصل اور دیگر اسباب کی بنا پر تبدیل ہوتی رہتی تھی اور ضروری نہ تھا کہ یہ اس مالیت یا تخمینی آمدنی کے جس کی بنا پر جاگیر دی جاتی مطابق ہو۔

۸۔ جمع۔ یہ لفظ "جوڑ" یا "میزان" کا عمومی مفہوم رکھتا ہے اور یہ تحریروں کے اندر اس معنی میں اور کم از کم تین اور مخصوص مفہوموں میں پایا جاتا ہے۔

(الف)۔ حسابات کے شعبہ میں، اس کے معنی، کسی نقدی حساب کے خرچ کے خانہ کے بالمقابل آمد کا خانہ ہوتا تھا۔

ب ۔ (ج) مالی نظم و نسق میں اس کے معنی، سلسلۂ عبارت کے لحاظ سے 'مطالبہ' یا 'مالیت' ہو سکتے تھے اور مترجمین کا ابہام کا نہ سمجھنا، غالباً تقریباً ان تمام دقتوں کا سبب ہوا جو طالب علموں کو اس موضوع پر اصطلاحی تحریروں کے سمجھنے میں پیش آئیں۔

(د)۔ مطالبہ ۔ خوانی خاں نے کبھی کبھی [مثلاً (۱) ۴۰۳، ۱۴۷] جمع مال یا "مطالبہ کی میزان" کا پورا فقرہ استعمال کیا ہے اور یہ فقرہ جہاں کہیں بھی ملتا ہے وہاں مطالبہ کا مفہوم واضح ہے۔ اس مصنف نے بہر حال 'جمع' کو تنہا بھی استعمال کیا ہے اور پہلے کے بعض مصنفین کا بھی یہی دستور تھا۔ ایسی صورت میں تنہا سیاق عبارت ہی سے مفہوم کی طرف رہنمائی ہو سکتی ہے۔ بعض سرکاری دستاویزوں میں، جو سب کے سب مقامی نظم و نسق سے متعلق ہیں، مطالبہ کا مفہوم واضح ہے۔ سب سے زیادہ قابلِ ذکر صورت راسک داس کے نام اورنگ زیب کے فرمان کی ہے جس میں جمع کو کسان پر مطالبہ کے مفہوم میں تسلسل کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے اور تحصیلین اور ان کے محرروں (کارکنان) کے لیے اکبر کے ضابطوں [آئین (۱) ۲۸۶ - ۸۸] میں بھی اس کا یہی مفہوم نکلتا ہے، گو ان عبارتوں میں سے بعض میں ضروری نہیں کہ اس لفظ کے معنی "میزان" کے علاوہ کچھ اور ہوں۔ غیر سرکاری تحریروں میں 'مطالبہ' کا مفہوم بہت ہی شاذ ملتا ہے اور مجھے اس کی کوئی واضح مثال اٹھارہویں صدی کے قبل نہ مل سکی۔ متبادل مفہوم کے ساتھ اس کا یہی مفہوم ساقی کی ایک عبارت (۳۴۵) اور خوانی خاں [مثلاً (۱)، ۵۸۳، (۲) ۸۴۷] میں ملتا ہے۔

(ر) مالیت ۔ جب جمع مرکزی انتظامیہ کے سلسلہ میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا مفہوم برابر جاگیر کی مالیت ہوتی ہے اور سیاق عبارت کے لحاظ سے اس کا مطلب کسی مخصوص رقبۂ زمین کی لگائی ہوئی مالیت یا مملکت کی مجموعی مالیت کی تحریر ہو سکتی ہے۔ یہ لفظ اس مفہوم میں بظاہر ایک مخفف معلوم ہوتا ہے۔ عفیف نے جمع مملکات یا "بادشاہت کی مالیت" لکھا ہے۔ (۴۹)۔ اکبر نامہ [(۲)، ۲۷۰] میں جمع پرگنات یعنی "پرگنوں کی مالیت"، آئین [(۱)، ۳۴۷] میں جمع ولایت یعنی "ملک کی مالیت" اور اقبال نامہ [(۲)، ۲۸۷] جمع قصبات و قریات یعنی "پرگنوں اور موضعوں کی مالیت" ملتی ہے۔ سترہویں صدی کے دوران ان فقروں کی جگہ جنھیں میں ہم معنی تصور کرتا ہوں جمع دامی، یعنی "داموں میں جمع" نے لے لی۔ یہ فقرہ خوانی خاں کی تصنیف میں عام ہے اور اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ تنخواہوں کا بمقدارِ دام مقرر کیا جانا قائم رہا، گو کہ دیگر انتظامی کاموں میں روپیہ قدر کی عام اکائی تھی۔

تحریروں میں پہلی مالیت جو ہمیں ملتی ہے فیروز کی منظور کی ہوئی تھی۔ اس سے متعلق عبارت پر ضمیمہ ج میں بحث ہے۔ اکبر کی عام مالیتوں کی عبارتوں کا ضمیمہ ذیل میں جائزہ لیا گیا ہے۔ یہاں اس کے عہدِ حکومت کے ایسے دو واقعات کا جو اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم کو بخوبی متعین کرتے ہیں ذکر کرنا کافی ہوگا۔

(۱) گجرات کی فتح کے بعد، ٹوڈر مل نئے فتح کیے ہوئے علاقہ کی "تحقیق جمع" کی غرض سے وہاں بہ عجلت پہنچا [اکبر نامہ (۳)، ۶۵-۶۷]۔ اس کارروائی کو مسٹر بیورج کے ترجمہ میں "بندوبست مالگذاری" بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک اصطلاح ہے جس کا ان دنوں مطلب مطالبہ کی تشخیص کا ہوتا، لیکن حالات اور عبارت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹوڈر مل کے سفر کا یہ مقصد نہ تھا۔ یہ علاقہ ابھی حال ہی میں جاگیرداروں کے درمیان تقسیم ہوا تھا جن کا یہ فرض تھا کہ وہ وہاں مغلیہ انتظامِ حکومت قائم کریں اور پورے صوبہ میں مطالبہ کی تشخیص کے لیے نہ تو وقت ہی تھا اور نہ موقع اس عبارت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ٹوڈر مل نے حال ہی تقسیم کی ہوئی جاگیروں کی سرسری مالیت قائم کی اور اس نے دارالسلطنت واپس ہونے پر مرکزی دفتر خانہ کو مالیت کے کاغذات سپرد کر دیئے تاکہ محرران (کارکنان) جاگیرداروں کے حسابات کو درست کرنے کے سلسلہ میں اسے استعمال کر سکیں۔

طبقات اکبری کی مماثل عبارتوں سے یہ تعبیر ہر شکست سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ ان میں کی پہلی عبارت سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ "چونکہ گجرات کی جمع ممالک تحقیق کے بعد مرکزی دفتر خانہ کو موصول نہ ہوئی، لہذا ٹوڈر مل کو وہاں بھیجا گیا کہ وہ جمع ولایت کا صحیح تعین کر کے اصلاح کیے ہوئے گوشوارہ کو دفتر خانہ میں داخل کرے۔" دوسری تحریر ہے کہ ٹوڈر مل "جو جمع ولایت کو صحیح کرنے کی غرض سے گجرات گیا تھا، دربار واپس آیا اور اس نے (آداب بجا لانے کے بعد) گجرات کی جمع کے متعلق صحیح کیے ہوئے کاغذات پیش کیے۔" ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ صوبجاتی انتظامیہ کو صحیح مالیت متعین کرنے کی ہدایت کی گئی تھی اور وہ اس میں ناکام رہی۔ لہذا راجہ کو اس کام کی انجام دہی پر مامور کیا گیا۔ یاد رہے کہ یہ مصنف پہلے "صوبوں کی "میزان" پھر "ولایت کی میزان" اور اس کے بعد "گجرات کی میزان" کا ذکر کرتا ہے۔ یہ تینوں فقرے مترادف ہیں۔

(۲) پھر اکبر نامہ [(۳)، ۲۶، وصفحات مابعد] کشمیر کی فتح کے فوراً بعد وہاں کے کسانوں

کی بغاوت کو، نئے جاگیرداروں کے مظالم سے منسوب کرتا ہے، جنھوں نے (دوسری غلطیوں کے علاوہ) حماقت سے 'پوری' جمع' طلب کی تھی۔ یہاں جمع کا مطلب مطالبہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ مطالبہ طلب کرنا تو حماقت ہوسکتی ہے اور نہ ہی ظلم۔ اصل بات یہ ہے کہ ابتدائی مالیت جس کی بنیاد پر جاگیریں دی گئی تھیں بہت زیادہ تھیں اور جاگیرداروں کی صحیح صورت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی پوری متوقع آمدنی کو وصول کرنے کی کوششوں سے کسان بغاوت پر مجبور ہوئے۔ یہ بات کہ یہ صحیح تعبیر ہے، بادشاہ کے کیے ہوئے عمل سے واضح ہوتی ہے۔ اوّل تو پیش آئی ہوئی ہنگامی صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے، اس نے جاگیرداروں کی آمدنی کو مطالبہ کے مقامی معیار کے مطابق پیداوار کے نصف پر محدود کر دیا اور اس رقم سے زائد وصول کی ہوئی رقم کو کسانوں کو واپس کیے جانے کا حکم دیا۔ پھر مستقبل کے لیے [اقبال نامہ (۲) ۴۵۳] اس نے صحیح حالات کے مطابق ایک نئی مالیت تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس طور پر اس نے اس قسم کی پریشانی کو دوبارہ پیش آنے سے روکا۔

سترہویں صدی کی تحریروں میں "مالیت" کا مفہوم برقرار رہتا ہے، بادشاہ نامہ [(۲)، ۳۶۰] میں اس طور پر تحریر ہے کہ جب پلاموکے سردار کو تھوڑی پریشانی کے بعد مملکت میں شامل کر لیا گیا تو اس کے علاقہ کی ایک کروڑ دام جمع مقرر کر کے اس علاقہ کو اسے اس رقم پر جاگیر میں دے دیا گیا۔ یہاں جمع، کسانوں پر مطالبہ نہیں ہوسکتا۔ میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ اس لحاظ سے کہ کسی رقم کے پانے یا ادا کرنے کا کوئی سوال نہ تھا، خالصتہً رسمی تھا۔ جو کچھ کہا گیا وہ یہ تھا کہ ایک من مانی مالیت مقرر کی گئی اور سردار کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیا گیا مگر ایک خود مختار حکمران کے بجائے ایک جاگیردار کی شکل میں۔

ایسی سرگذشت کی ایک عبارت [(۲)، ۳۹۷] میں مالیت یا تخمینی آمدنی اور حاصل یا واقعی وصول کی ہوئی آمدنی کے درمیان فرق کو واضح کیا گیا ہے جس میں معافی کو بندر سورت کے انعام کے طور پر تحریر کیا گیا، جس کی مالیت ایک کروڑ درم یعنی ڈھائی لاکھ روپے تھی، لیکن غیر ملکی تجارت میں اضافہ کے باعث اس کی آمدنی (حاصل) بڑھ کر پانچ کروڑ ہوگئی تھی۔ اسی طور پر یہ درج ہے [(۲)، ۱۰۸] کہ ۱۶۳۰ء کے قحط کے بعد بگلانہ کی آمدنی گھٹ کر مالیت کا نصف ہوگئی تھی۔ اس سرگذشت اور اس کے بعد کی سرگذشتوں کی متعدد عبارتوں میں، ضلع یا صوبوں کی مالیت کو ان کی دولت یا اہمیت کی علامت کے طور پر دکھایا گیا ہے۔

جیسا کہ باب ۵ میں گذر چکا ہے، اٹھارہویں صدی کے ابتدا ہی میں جاگیریں غیر مقبول ہو گئی تھیں اور اس زمانہ کی پریشانیوں میں مالیت کا تخیل بظاہر غیر مانوس سا ہو گیا تھا۔ برطانوی عہد کے ابتدا میں پیش آنے والی تبدیلیوں کے نتیجہ میں جن کے تحت مطالبہ کو چند معینہ برسوں کے لیے تشخیص کرتے تھے 'جمع' جن دو تخیلات کو ظاہر کرتا تھا ان میں جوڑ پیدا ہوا کیونکہ ایک معینہ برسوں کی مدت کے لیے واجب الادا مطالبہ واقعی میں ان برسوں کے دوران حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک تخمینہ ہوتا ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں "مالگذاری" مطالبہ اور مالیت دونوں ہی ہیں کیونکہ ان دونوں کا اعداد کا آپس میں جوڑ ہو گیا ہے۔ لیکن "برائے نام مالگذاری" میں جو مالگذاری سے مستثنیٰ مواضعات پر انتظامی اغراض سے تشخیص کی جاتی ہے، مالگذاری کا تخیل اب تک برقرار ہے۔ یہ برائے نام مالگذاری ادا کیے جانے کے لیے نہ ہوتی، لہذا یہ مطالبہ نہیں ہو سکتی۔ یہ حقیقت میں زمینداروں کی آمدنی پر شمار کی جانے والی وہ مالیت ہوتی، جس کی بنیاد پر مختلف ابواب (محصول) تشخیص کیے جاتے ہیں۔

حوالہ ضمیمہ الف

لے ایڈیشنل ۶۵۴۳، اوراق ۲۲۹، ۲۳۰۔ ایلیٹ (۵)، ۳۰۷ پر مندرج ترجمہ "گجرات کی مالگذاری اطمینان بخش طور پر نہ ادا کی گئی تھیں" میں پہلی عبارت کا اصل نکتہ موجود نہیں۔ یہ کسی جمع کو ادا کرنے کا نہیں بلکہ ایک دستاویز کے صدر دفتر خانہ میں پہنچنے کا مسئلہ تھا۔ کسی بھی قابلِ قیاس حالت میں دفتر خانہ "محاصل" کا انتظام نہ کر سکتا تھا۔ پھر "شاہی خزانہ" دفتر خانہ کی صحیح نمائندگی نہیں کرتا۔

ضمیمہ ب

تیرھویں صدی اور چودھویں صدی کے صوبے دار

باب دو میں الفاظ "صوبہ" اور "صوبیدار" اصطلاحوں کے دو ایسے مجموعوں کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں جنھیں میں یا تو ایک دوسرے کا بالکل مترادف یا ان کے درمیان فرق کو اس قدر معمولی خیال کرتا ہوں جو ہمارے موجودہ مقصد کے لیے کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتا پہلا مجموعہ 'ولائیت' والی ہے۔ لفظ ولایت' سرگذشتوں میں مختلف مفہوموں میں استعمال ہوتا ہے جنھیں تقریباً ہمیشہ سیاق عبارت سے تیقن کے ساتھ پہچانا جا سکتا ہے: اس کا مفہوم (۱) بادشاہت کا ایک متعین حصہ یعنی کوئی صوبہ (۲) بادشاہت کا کوئی غیر متعین حصہ یعنی ایک علاقہ یا خطہ (۳) پوری بادشاہت (۴) ایک غیر ملک (۵) کسی غیر ملکی کا وطن [اس آخری مفہوم میں اس کی ایک ماخوذ شکل کو حال میں بلائیٹی (BLIGHTY) کے طور پر انگریزی میں اپنا لیا گیا ہے] - والی کے معنی، کبھی کبھی کسی غیر ملک کے حکمران کے، لیکن اس کے عام معنی بادشاہت کے کسی صوبہ کے صوبیدار کے ہوتے ہیں، یعنی کسی مقام سے مختص کیا ہوا ایک عہدہ دار جو براہِ راست بادشاہ یا اس کے وزراء کے احکام کے تحت اپنی خدمت انجام دیتا ہے۔

جہاں تک میں جانتا ہوں یہ خیال کہیں بھی ظاہر نہیں کیا گیا ہے کہ والی کی حیثیت اس عہد میں سوائے ایک نوکر شاہانہ عہدہ دار کے کچھ اور تھی اور گورنر کا لفظ اس کی ٹھیک ٹھیک نمائندگی کرتا ہے جیسا کہ پورے مغربی ایشیا کی تاریخ کے دوران صورتِ حال پائی جاتی ہے۔ اصطلاحوں کے دوسرے مجموعہ یعنی اقطاع، مقطعی کے ساتھ صورتِ حال مختلف ہے۔ انیسویں صدی میں مختلف مترجموں نے ان اصطلاحوں کا ترجمہ یورپ کے نظام جاگیرداری سے ماخوذ

فقروں کے ذریعہ کیا ہے۔ بعض حالیہ مصنفوں نے بھی ان کے طریقوں کی تقلید کی اور ہمیں ان کی تحریروں میں فائیفس (FIEFS) فیوڈل چیفس (FEUDAL CHIEFS) اور اس قسم کی دوسرے تصورات ملتے ہیں اور عام پڑھنے والا یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت کی تنظیم مختلف عناصر پر مشتمل تھی جس میں بعض صوبوں پر نوکر شاہ صوبے دار (ذاتی) حکومت کرتے تھے لیکن بیشتر ملک کے ٹکڑوں (اقطاع) پر ایسے لوگ (مقطعی) جن کی حیثیت اس وقت کے یورپ کے جاگیرداروں کے مشابہ تھی قابض تھے۔ لہذا، اس سوال پر تحقیقات ضروری ہو جاتی ہے کہ کیا یہ الفاظ حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں، یا بالفاظ دیگر کیا دہلی سلطنت میں کوئی ایسا عنصر پایا جاتا تھا جس پر فیوڈل سسٹم (یورپی نظام جاگیر) کے لقب کو صحیح طور پر چسپاں کیا جاسکے۔ سوال یہ ہے کہ اس ملک میں حقیقت کیا تھی۔ یورپی جاگیردارانہ نظام کی نوعیت سے طالب علم خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔ دہلی سلطنت کے مقطیعوں کی نوعیت کو سرگذشتوں سے معلوم کیا جاسکتا ہے اور ان کے باہمی موازنہ سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ ان فرسودہ اصطلاحوں کے استعمال سے شمالی ہندوستان کے زرعی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے یا ان کی وجہ سے الجھن میں اضافہ ہوتا ہے۔

ہند فارسی تحریروں میں اقطاع کے معنی مالگذاری کی اس جاگیر کے ہوتے ہیں جو مستقبل کی خدمت کے ساتھ مشروط ہو۔ عہد مغلیہ میں یہ لفظ اکثر اس مفہوم میں (تیول کے ساتھ ساتھ) ایک نسبتاً زیادہ مانوس لفظ کے مرادف کے طور پر ملتا ہے اور یہ بات کہ تیرہویں صدی میں بھی اس کے یہی معنی ہو سکتے تھے، علاوہ متعدد عبارتوں کے برنی کے دو ہزار فوجیوں کے واقعے کے بیان (۶۰، ۶۱) سے بھی مسلم ہوتی ہے جو جاگیروں پر تو قابض تھے مگر جن خدمات کے ساتھ یہ مشروط تھیں اسے انجام دینے سے گریز کرتے تھے۔ جن مواضعات پر ان کا قبضہ تھا انھیں ان کے اقطاع اور خود ان لوگوں کو اقطاع دار کہا گیا ہے۔ لیکن اس عہد میں لفظ اقطاع معمولاً ایک سے زیادہ مفہوم میں مستعمل تھا، جیسا کہ فقرہ "بیس اقطاع" میں، جسے برنی نے سلطنت کے بیشتر حصّہ کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے (۵۰)۔ ظاہر ہے کہ یہ "بیس اقطاع" ان دو ہزار اقطاعوں سے جن کا ذکر مذکورہ بالا عبارت میں بھی آچکا ہے کسی مختلف نوعیت کی چیز کو ظاہر کرتے ہیں اور ہم پوری سرگذشت میں، معین اقطاعوں کا محض جاگیروں کے طور پر نہیں بلکہ انتظامی عہدوں کے طور پر حوالہ پاتے ہیں۔ ان دونوں مفہوموں کا فرق، اس لفظ

سے مشتق۔ قبضہ ظاہر کرنے والے اسموں کے استعمال سے بہت زیادہ نمایاں طور پر واضح ہوتا ہے۔ اس عہد میں اقطاع دار کے معنی ہمیشہ وہی ہوتے جو جاگیردار کا عام طور پر تھا، لیکن مقطعی کے معنی ہمیشہ ان انتظامی عہدوں میں سے کسی ایک پر قابض کے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مقطعی کی حیثیت جاگیردارانہ تھی یا عہدہ دارانہ؟

ہمیں پہلے امیروں کے اس طبقہ کی ابتدا پر غور کرنا چاہیے جن سے مقطعی منتخب کیے جاتے۔ سب سے پرانا وقائع نگار ہمیں اپنے زمانہ کے خاص خاص امیروں کی سوانح عمریاں فراہم کرتا ہے اور ہمیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تیرہویں صدی کے وسط میں تقریباً ہر شخص نے جس کا مقطعی کی حیثیت سے تحریروں میں ذکر آیا ہے اپنی ملازمت کو غلام کی حیثیت شروع کیا تھا۔ دہلی کے دوسرے اہم بادشاہ شمس الدین التمش نے جو خود ہی سابقہ بادشاہ کا مملوک رہ چکا تھا، زیادہ تعداد میں غیر ملکی غلام خرید کر انھیں اپنی خانہ داری کے کاموں پر لگایا اور ان کی صلاحیتوں کے متعلق خود اپنے فیصلہ کے مطابق انھیں سلطنت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر ترقی دی۔ اس سرگذشت سے تلخیص کی ہوئی سوانح عمریوں کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔

تاغان خاں (ص ۲۴۲) کو شمس الدین نے خرید کر یکے بعد دیگرے خدمت گار، دوات دار، خاصہ چکھنے والا، منتظم اصطبل، بدایوں کا قطعی اور لکھنؤ کا مقطعی مقرر کیا جہاں بالآخرہ بادشاہت کے نشان سے سرفراز کیا گیا۔

سیف الدین ایبک (ص ۲۵۹) کو بادشاہ نے خرید کر یکے بعد دیگرے محافظ توشہ خانہ، تیغ بردار، سمانہ کا مقطعی، برن کا مقطعی اور آخر میں وکیل دار جو اس عہد میں بظاہر درباری آداب کا سب سے اونچا عہدہ تھا مقرر کیا۔

طغرل خاں (ص ۲۶۱) بھی ایک غلام تھا جسے یکے بعد دیگرے نائب خاصہ چکھنے والا، نقیب دار، فیل دار، مہتمم اصطبل، پہلے سرہند کا مقطعی، پھر سلسلہ وار لاہور، قنوج اور اودھ کا مقطعی مقرر کیا گیا۔ آخر میں اسے لکھنوتی ملا جہاں اس کے بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔

الغ خاں (ص ۲۸۱) کے متعلق جو بعد میں بلبن کے لقب کے ساتھ بادشاہ بنا کہا جاتا ہے کہ وہ ترکستان کے کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن ایسے حالات میں جو مندرج تحریر نہیں وہ غلام بنا لیا گیا تھا۔ وہ فروخت کرنے کے لیے پہلے بغداد اور پھر گجرات لے جایا گیا جہاں سے ایک سوداگر نے اسے دہلی لا کر بادشاہ کے ہاتھ فروخت کیا۔ وہ پہلے ذاتی خدمت گار

کے طور پر، پھر کیپل کودکا مہتمم، پھر اصطبل کا مہتمم، پھر ہانسی کا مقطعی پھر میر حاجب اور اس کے بعد دہلی کا نائب بادشاہ مقرر ہوا اور پھر خود بادشاہ بن گیا۔ میرے خیال میں امیروں کے کسی ایسے طبقہ کو یورپ کے جاگیری نظام کے طور پر جس میں بادشاہ اپنے علاقائی ماتحتوں میں محض اوّل مقام کا مالک ہوا کرتا تصوّر کرنا بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ہمیں ایسے غلاموں سے بھرا ہوا ایک شاہی کنبہ نظر آتا ہے جو اپنی قابلیت یا دوسروں کے لطف و کرم سے یا اپنی محکومانہ خدمات سے ترقی کر کے صوبہ یا بادشاہت تک کے انتظام پر مامور ہو سکتا تھا۔ یہ لازمتہً عام ایشیائی طرز کی نوکرشاہی تھی۔ مقطعی کی فی الواقعی حیثیت کو جانچنے کے بعد بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ میرے علم میں اسے کہیں بھی معینہ شکل میں بیان نہیں کیا گیا ہے؛ لیکن سرگذشتوں میں مندرج واقعات حسب ذیل خلاصہ کو جائز قرار دیتے ہیں

۱۔ ایک مقطعی کی خود اپنی کوئی علاقائی حیثیت نہ ہوتی اور نہ کسی مخصوص علاقہ پر اس کا کوئی استحقاق ہوتا۔ اسے بادشاہ مقرر کرتا جو اسے کسی وقت بھی موقوف یا کسی دوسری ذمہ داری پر تبدیل کر سکتا تھا۔ اس بیان کی تائیدی عبارتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا۔ کوئی بھی شخص معمولاً سرگذشتوں کے تقریباً دس ایسے صفحات نہیں پڑھ سکتا جس میں اس شاہی اختیار کو استعمال کیے جانے کی مثال نہ ملتی ہو۔ جن سوانح عمریوں کا خلاصہ ابھی درج کیا گیا وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ تیرہویں صدی میں کسی مقطعی کے لیے ضروری نہ تھا کہ اس کا کسی مخصوص علاقہ سے تعلق ہو۔ وہ بادشاہ کے صوابدید پر لاہور سے لکھنوتی تک کسی جگہ بھی مقرر کیا جا سکتا تھا۔ اسی طور پر اگلی صدی کی ایک مثال کے طور پر ہم برنی کا یہ بیان (صفحہ ۴۲۴ و مابعد) تصوّر کر سکتے ہیں کہ غیاث الدین تغلق نے تخت پر بیٹھنے کے بعد اقطاعوں کو اپنے رشتہ داروں اور حامیوں کے درمیان تقسیم کیا۔ یہ ایسے لوگ تھے جو اپنی تقرری کے مقامات سے کوئی سابقہ تعلق نہ رکھتے تھے، بلکہ بظاہر اپنی انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر منتخب کیے گئے تھے۔ یہ انتظامات کی ایسی چیز کے جسے صحیح معنوں میں یورپ کا جاگیری نظام کہا جا سکتا ہے، ضد ہیں۔

۲۔ مقطعی لازمتہً اپنی تقرری کے علاقہ کا منتظم ہوتا تھا۔ یہ حقیقت سرگذشتوں کے کسی بھی بغور پڑھنے والے پر ظاہر ہو سکتی ہے اور بہت سی ایسی مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن غالباً مندرجہ ذیل دو مثالیں کافی ہوں گی۔ برنی قدرے تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے (صفحہ ۹۶

کہ بلبن نے اپنے لڑکے بغرا خاں کو کیوں کر بنگال کے تخت پر بٹھایا! ورنہ اس نصیحت کو بھی جواس نے اس موقع پر دیا درج کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کا لڑکا ڈھیلا اور سست تھا، اس نے اس ضرورت پر خاص طور سے زور دیا کہ اگر بادشاہ کو اپنے تخت کی حفاظت منظور ہو تو اسے عملی طور پر چوکس رہنا چاہیے اور اس سلسلہ میں اس نے بادشاہ کی حیثیت (اقلیم داری) اور صوبے دار کی حیثیت (ولائیت داری) کے درمیان امتیاز قائم کیا ہے۔ اس کی دلیل تھی کہ بادشاہ کی فروگذاشتیں ناقابل تلافی اور اس کے خاندان کے لیے مہلک ہونے کا رجحان رکھتی تھیں جبکہ کوئی مقطعی جو اپنی صوبے داری (ولائیت داری) میں غفلت شعار اور نااہل ہوتا، گو وہ جرمانہ یا برخواستگی کا مستوجب ہوتا، مگر خود اس کی زندگی یا خاندان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا اور اس کے باوجود بھی وہ دوبارہ بحالی کی امید رکھ سکتا تھا۔ بس ایک مقطعی کا لازمی فرض منصبی صوبے داری تھا اور وہ اپنے فرائض کو انجام نہ دینے کی صورت میں، جرمانہ یا برطرفی کا مستحق قرار پاتا۔

اگلی صدی کی ایک مثال کے طور پر ہم عفیف کے بیان کیے ہوئے (۱۴۸) اس واقعہ کو تصور کر سکتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ عین الملک نام کا امیر جو و زارتِ مال میں ملازم تھا اپنے وزیر سے جھگڑا کرنے کی وجہ سے برخواست کر دیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اسے ملتان کی مقطعی کا عہدہ پیش کیا اور کہا کہ "اس صوبہ (اقطاع) کو جاؤ اور اس جگہ کے کاموں (کار ہا و کار دار ہا) میں مصروف ہو۔" اس کا عین الملک نے جواب دیا کہ "میں جب اقطاع کا انتظام (عمل) اپنے ذمہ لوں گا اور وہاں کے کاموں کو انجام دوں گا تو میرے لیے حسابات کو وزارت میں پیش کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ میں اپنے حساب بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔" اس پر بادشاہ نے ملتان کے معاملات کو وزارت سے خارج کر دیا اور عین الملک نے باضابطہ اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ اس عبارت کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقطعی کی حیثیت خالصتہً انتظامی تھی۔

۳۔ مقطعی کے لیے لازم تھا کہ وہ فوجی دستہ بادشاہ کی ہر وقت خدمت کے لیے تیار رکھے۔ ان فوجی دستوں کی حیثیت غیاث الدین کے ان امیروں کے نام جاری کیے ہوئے احکام سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے "جنھیں اس نے اقطاعات اور ولائیتیں سپرد کی تھیں۔" اس نے حکم دیا کہ "فوجیوں کی تنخواہ کے چھوٹے سے چھوٹے حصہ کی لالچ نہ کرو۔ تم اپنی

تنخواہ سے اسے کچھ دو یا نہ دو اس کا تمھیں فیصلہ کرنا ہے، لیکن جو کچھ فوج کے نام وضع ہوتا ہے اگر اس کے ایک چھوٹے سے جز کی بھی تم توقع رکھو تو پھر امیر کا لقب تمھیں زیب نہ دے گا اور جو امیر ملازموں کی تنخواہ کے کسی حصّہ کو بھی خرچ کرتا ہے، وہ دھول پھانکتا ہے" اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ فوج کی تعداد اور تنخواہ مقرر کرتا تھا اور خرچ بھی وہی پورا کرتا تھا۔ مقطعی اگر چاہے تو اپنے پاس سے ان کی تنخواہ بڑھا سکتا تھا لیکن ان کے سلسلہ میں اس کے اختیار تمیزی کی یہ آخری حد تھی۔

۴۔ مقطعی کو اپنی سپردگی کے علاقہ کی واجب الادا مالگذاری کو وصول کرنا ہوتا تھا۔ اور منظور شدہ اخراجات، مثلاً فوج کی تنخواہ پوری کرنے کے بعد بقیہ کو دارالسلطنت کے شاہی خزانہ میں داخل کرنا ہوتا تھا۔ مثلاً (برنی صت۲۲ و مابعد) جن دنوں (جانشینی سے قبل) علاالدین خلجی کڑہ اور اودھ کا مقطعی تھا اور دکن کی مہم کا منصوبہ بنا رہا تھا اس نے اپنے صوبوں کی مالگذاری کی بچت کے مطالبہ کو ملتوی کرنے کی درخواست دی، تاکہ وہ اس رقم سے زائد فوج بھرتی کر سکے اور اس نے یہ وعدہ کیا کہ دکن سے واپسی پر وہ اس ملتوی کی ہوئی بچت کی رقم کو معہ مالِ غنیمت کے شاہی خزانہ میں جمع کر دے گا۔

۵۔ مقطعی کی آمد، خرچ دونوں کے متعلق مالی معاملات کی جانچ وزارتِ مال کا ئمہ کرتا تھا اور ان کے ذمہ واجب الادا بقایوں کی ایسے طریقوں سے وصولی کی جاتی جو بعض بادشاہوں کے زمانہ میں غیر معمولی طور پر سخت تھے۔ غیاث الدین تغلق کے حکم سے جس کا اوپر حوالہ آیا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ اقطاعوں اور ولائتوں پر قابض افراد کو ان کارروائیوں کے سلسلہ میں بہت زیادہ پریشان کیا گیا تھا اور اس نے ہدایت دی تھی کہ اس معاملہ میں ان کے ساتھ معمولی ملازمین ایسا برتاؤ نہ کیا جائے۔ اس کے لڑکے محمّد کے عہدِ حکومت میں بظاہر پھر تشدّد شروع ہوا، کیونکہ برنی (ص ص ۵۵۶، ۴۷۵) اس کے اور فیروز کے دانش مندانہ اور نرم انتظامِ حکومت کے درمیان فرق پر جس کے زمانہ میں "کوئی بھی مقطعی یا والی" اس سبب سے تباہ نہ ہوا زور دیتا ہے۔ پس حسابات کی جانچ اور بقایوں کی وصولی کی کارروائیوں میں سختی کے اعتبار سے فرق رہتا تھا، لیکن یہ دونوں چیزیں تسلسل کے ساتھ انتظامِ حکومت کے معمولات میں تھیں۔

مقطعی کی حیثیت کے متعلق اس بیان سے اس کا ظاہری طور پر ایک خالص نوکر شاہی

تنظیم کا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ ہم اس تنظیم میں ایسے افسران کو دیکھتے ہیں جنھیں بادشاہ مختلف علاقوں پر مقرر کرتے اور انھیں اپنی مرضی پر تبدیل، برطرف اور سزا دیتے اور یہ افسران، جن پر وزارتِ مال اپنی کڑی نگرانی رکھتی بادشاہ کے تحت اپنے اپنے علاقوں کا انتظام کیا کرتے۔ اس تنظیم کا کوئی بھی پہلو، یورپ کے جاگیری نظام سے مناسبت نہیں رکھتا اور یورپ کی تاریخ کے ایک طالب علم کے قول کے مطابق جسے میں نے مذکورہ بالا خلاصہ دکھایا تھا یہ جاگیری نظام کے مشابہ نہیں بلکہ ان نوکرشاہیوں کے مشابہ ہے جسے انگلستان کے ہنری دوئم ایسے بادشاہوں نے، جاگیری نظام کی ایک متبادل صورت کے طور پر قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ غالباً پوری جاگیری نظام کی اصطلاحوں کے استعمال کی محرک یہ حقیقت تھی کہ دہلی سلطنت کے بعض امیروں کا رویہ بعض اوقات پوری جاگیرداروں کے مثل ہوتا تھا، یعنی یہ کہ وہ بغاوت کرتے یا تخت نشینی کی نزاعوں میں کسی ایک فریق کی طرفداری کرتے۔ لیکن کم از کم ایشیا میں حکام اور جاگیرداران دونوں ہی بغاوت کر سکتے تھے اور تمثیل اس قدر زیادہ خفیف اور سطحی ہے کہ پوری جاگیری اصطلاحوں اور ان تمام گمراہ کن تخیلات کو جو وہ ظاہر کرتی ہیں اس پر چسپاں کرنا مناسب نہ ہوگا۔ بادشاہت، نوکرشاہی اور یورپی جاگیری نظام کا مرکب نہ تھی، بلکہ اس کا نظم و نسق سراسر نوکرشاہی پر موقوف تھا۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کیا والی اور مقطعی کی حیثیت اور فرائضِ منصبی میں کچھ فرق پایا جاتا تھا۔ سرگذشتوں میں کسی والی کا تذکرہ اس قدر شاذ آتا ہے کہ ان کی بنیاد پر کوئی ایسا بیان جیسا کہ مقطعی کے لیے مرتب کیا گیا ہے ترتیب دینا ناممکن ہے۔ مسلسل استعمال ہونے والے دوہرے فقرے، والی اور مقطعی یا اقطاع اور ولایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں ادارے بہرحال ایک ہی عمومی نوعیت کے تھے۔ لیکن ان کی تفصیلات میں فرق کی موجودگی کو خارج ازامکان نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ایک حالیہ مصنف کا بیان ہے کہ ان دونوں میں فرق، دارالسلطنت سے دوری کا تھا۔[۶۵] نسبتاً قریبی صوبے، اقطاع اور دور کے ولایت کہے جاتے لیکن اس خیال کی تائید سرگذشتوں کے الفاظ کے تفصیلی جائزہ سے نہیں ہوتی۔ خود ان الفاظ کو دیکھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ، والی، ایک نوکرشاہی زمرہ کے صوبے دار کے لیے صحیح اسلامی اصطلاح ہے۔ اسے اسی مفہوم میں، ابویوسف نے آٹھویں صدی میں بغداد میں استعمال کیا تھا، مثلاً (ص ص ۱۶۱، ۱۶۳) اور یہ اسی مفہوم میں اب بھی ترکی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

میں ابتدائی اسلامی تحریروں میں جن تک میری رسائی ترجموں کے ذریعہ ہوئی ہے، اقطاع یا مقطعی کی اصطلاحوں کا پتہ نہ چلا سکا، لیکن جس مفہوم میں اقطاع کی اصطلاح ہندوستان میں برقرار رہی یعنی جاگیر کے مفہوم کی بنا پر ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اقطاع کی اصطلاح کے کسی صوبہ پر اطلاق کے ابتداً یہ معنی تھے کہ صوبہ جاگیر میں دیا ہوا تھا، یعنی یہ کہ صوبے دار بادشاہ کی خدمت کے لیے فوج کے ایک دستہ رکھنے کا پابند تھا۔ پس یہ ممکن ہے کہ کسی عہد میں والی اور مقطعی میں اس بات کا فرق رہا ہو کہ والی پر فوج رکھنے کی پابندی نہ تھی اور مقطعی پر تھی۔ لیکن یہ ابتدائی فرق تھا بھی تو یہ بہرحال غیاث الدین تغلق کے زمانہ تک جس کے فوجوں کے متعلق احکام کا اطلاق دونوں طبقوں یعنی " امیروں جنھیں اس نے اقطاع اور ولایتیں دی تھیں " پر تھا، متروک ہو چکا تھا

سرگذشتوں سے والی اور مقطعی کے درمیان اس کے علاوہ کسی اور امکانی فرق کا اشارہ نہیں ملتا اور اس امر سے کہ ہم وقتاً فوقتاً کسی ولایت کے مقطعی کے بارہ میں سنتے ہیں اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ اصطلاحیں کم از کم تقریباً ہم معنی ہیں۔ اس امکان کو خارج نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی حیثیتوں میں معمولی فرق رہا ہو گا، مثلاً وزارتِ مال کے طریقۂ حسابات میں لیکن زرعی نظم ونسق کے نقطۂ نگاہ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ پس میرے خیال میں، ہم اس تجویز کو مسترد کرنے میں بالکل حق بجانب ہوں گے کہ دہلی سلطنت میں کوئی ایسا عنصر موجود تھا جس پر یورپ کے جاگیری نظام کی اصطلاحوں کو بجا طور پر منطبق کر سکتے تھے۔ وزارتِ مال کے براہ راست زیرِ انتظام خطوں کے علاوہ بقیہ تمام بادشاہت نوکر شاہی کے زمرہ کے صوبے داروں کے زیرِ انتظام صوبوں میں تقسیم تھی۔ ممکن ہے کہ ان صوبے داروں اور وزارتِ مال کے درمیان رشتوں کا فرق رہا ہو لیکن جہاں تک کسی صوبہ کے زرعی نظم ونسق کا تعلق ہے ہم والی اور مقطعی کو بلا تامل اگر کلیتہً نہیں تو عملی طور پر ہم معنی تصور کر سکتے ہیں۔

یہاں اس بات کا اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ 'مقطعی' کی اصطلاح زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ پندرھویں صدی کے وسط کی تصنیف 'تاریخ مبارک شاہی' میں اس کے نام کو سابقہ سرگذشتوں کے خلاصہ میں برقرار رکھا گیا ہے، لیکن اپنے زمانہ کے حالات کے بیان کے سلسلہ میں، مصنف ہمیشہ امیر کی اصطلاح کو استعمال کرتا ہے۔ اس اصطلاح کو ابن بطوطہ ایک صدی پہلے ہی استعمال کر چکا تھا۔ وہ ہندوستان کے صوبے داروں کے لیے کبھی تو 'والی' اور کبھی

امیر کی اصطلاح استعمال کرتا ہے، مگر جہاں تک مجھے علم ہو سکا اس نے اس مفہوم میں مقطعی کو کبھی استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ اس زمانہ میں 'امیر' کا عام طور پر استعمال شروع ہو گیا ہو۔ اکبر کے عہد میں نظام الدین نے اپنی تحریروں میں اس کی جگہ معمولاً 'حاکم'، استعمال کیا ہے، جیسا کہ اس کے الفاظ کا برنی کے الفاظ سے جس کا اس نے خلاصہ بیان کیا ہے، مقابلہ کرنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ فرشتہ نے کبھی کبھی مقطعی کا لفظ نقل کیا ہے لیکن اس نے اس سے زیادہ عام طور پر 'حاکم'، 'سپہ سالار' یا اس کا کوئی دوسرا جدید بدل استعمال کیا ہے اور اکبر کے زمانہ میں 'مقطعی' واضح طور پر متروک ہو چکا تھا۔

حوالہ جات ضمیمہ ب

۱؎ اس ضمیمہ کا خلاصہ جرنل آف انڈین ہسٹری، اپریل ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا ہے۔

۲؎ طبقات ناصری جز ۲۲، ص ۳۲۹ ومابعد۔ جو نام معمولاً التمش کے طور پر لکھا جاتا ہے اسے التمتش لکھنے میں، میں نے کیمبرج ہسٹری کی تقلید کی ہے۔

۳؎ داوات دار، سکریٹری آف اسٹیٹ کے لغوی معنی یہاں مناسب نہیں معلوم ہوتے کیونکہ ہماری اطلاع ہے کہ ایک موقع پر بادشاہ کا جواہرات سے مرصع قلم دان کھو دینے پر تاغان خاں کو سخت سزا دی گئی تھی۔ میں داوات دار سے اس عہدہ دار کا مفہوم سمجھتا ہوں جو بادشاہ کے لکھنے کے سامان کی نگرانی کا ذمہ دار ہوا کرتا۔ بعد کے دنوں میں میر داوات دار ایک اونچا عہدہ دار ہوا کرتا تھا۔

۴؎ اس عہد میں وکیل دار کی صحیح حیثیت کا تعین ایک قدرے پیچیدہ مسئلہ ہے لیکن ہمارے موجودہ مقصد کے لیے اس پر بحث ضروری نہیں۔

۵؎ وقائع نگار بلبن کی مدح سرائی میں جس کا وہ اپنی تحریر کے وقت ملازم تھا اس قدر زیادہ مبالغہ سے کام لیتا ہے کہ اس کا یہ بیان محض چاپلوسی کے کلمات ہو سکتے ہیں، لیکن وقت کے حالات کے لحاظ سے اس بیان میں فی نفسہٖ کوئی چیز ناممکن نہیں ہو سکتی۔ ابن بطوطہ نے اگلی صدی کی اپنی تحریر میں اس سے بہت کم توصیفی روایت درج کی ہے [(۳) ۱۷۱، ۱] ہمارے لیے یہ تحقیقات کہ ان میں سے کون سا بیان درست ہے، غیر ضروری ہے، کیونکہ اس خاص مسئلہ پر کہ بلبن کو ہندوستان میں بطور ایک غلام لایا گیا تھا، دونوں متفق ہیں۔

لہ برنی ۴۳۱۔ عبارت کے پورے ترجمہ کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ ج۔

شہ قانون گو کی تصنیف 'شیر شاہ'، ص ص ۳۴۹، ۳۵۰۔ لیکن برنی ولایت کی اصطلاح کا اطلاق دہلی کے نواحی صوبوں مثلاً برن (ص ۵۸)، امروہہ (ص ۵۸) یا سمانہ (۴۸۳) پر کرتا ہے، جب کہ ملتان (ص ۴۸۲) اور مرہٹ یا مرہٹوں کا علاقہ (ص ۳۹۰) 'اقطاع' کہا گیا ہے۔ چودھویں صدی کی مختلف مدتوں میں بعض دور کے صوبوں کی حیثیت بظاہر مختلف تھی۔ یہ صوبے دار کے بجائے کسی وزیر کے زیرِ انتظام تھے۔ (برنی ۳۷۹، ۳۹۷، ۴۵۴ وغیرہ)، لیکن انھیں ولایت یا اقطاع نہیں کہا جا سکتا۔

ٹہ مثلاً طبقات ناصری۔ ولایت اودھ کا مقطع (۲۴۶، ۲۴۷) ولایت سرسوتی کا مقطع (ص ۲۵۶)۔ جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے برنی (۹۶) مقطع کے فرائضِ منصبی کے لیے ولایت داری کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

ضمیمہ (ج)

چودھویں صدی کی بعض عبارتیں

چودھویں صدی کے زرعی نظام سے متعلق بعض اہم ترین عبارتوں کو سمجھنا مشکل ہے اور ان کے موجود ترجمے اگر کہیں ہیں بھی تو ہمیشہ صحیح نہیں ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ عبارتوں کا ترجمہ جو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے وہ بالکل لفظی ہو۔ اصل سے انحراف کی صورت میں انھیں قوسین میں درج کیا گیا ہے۔ اصطلاحی محاوروں پر ترجموں کے بعد آنے والی یادداشتوں میں بحث کی گئی ہے۔ فقروں پر حوالوں کی سہولیت کے خیال سے اوقاف اور نمبر لگائے گئے ہیں متن مسلسل ہیں اور ان پر معمولاً اوقاف نہیں لگائے گئے ہیں۔

علاء الدین کا مالی ضابطہ۔

(متن برنی، ۲۸۷۔ ترجمے ایلیٹ (۳)، ۱۸۲ اور جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، جلد ۳۹، صد ۳۸۲۔ آخر الذکر کے ساتھ بلاکمین کی یادداشت ہے)۔

۱۔ سلطان علاء الدین نے عالموں سے قاعدے اور ضابطے طلب کیے تاکہ ہندو (۱) کو پیسا جا سکے۔

۲۔ اور جائداد اور املاک جو بے چینی اور بغاوت کا سبب بنتی ہیں اس کے گھر میں نہ رہنی چاہئے

۳۔ اور مطالبہ کی ادائیگی کے لیے سردار سے لے کر جاروب کش تک کے لیے ایک ہی قاعدہ بنانا چاہیے۔

۴۔ اور طاقتور کے ذمہ مطالبہ کا بار کمزور پر نہ آنا چاہیے۔

۵۔ اور ہندو کے پاس اس قدر نہ بچ رہنا چاہیے کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو سکیں اور اسلحے

باندھ سکیں اور نفیس لباس پہن سکیں اور مزے اڑا سکیں۔
۶۔ اور مذکورہ بالا مقصد کے تحت جو حکومت کے جملہ مقاصد میں اہم ترین ہے دو ضابطے (۳) بنائے جائیں۔
۷۔ پہلا (ضابطہ)۔ یہ کہ جو لوگ کاشت کریں خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے پیمائش کے قاعدہ اور بسوہ پیداوار' (۴) کے مطابق کاشت کریں۔
۸۔ اور بغیر کسی منہائی کے نصف ادا کریں گے
۹۔ اور اس ادائیگی میں سرداروں اور بھنگیوں (۲) کے درمیان امتیاز نہ ہونا چاہیے۔
۱۰۔ اور سرداروں کی آمدنی (۵) کے طور پر ان کے پاس کچھ بھی نہ چھوڑنا چاہیے۔
(متن میں اس کے بعد دوسرے ضابطہ کا بیان ہے جس کے تحت چرائی پر محصول عائد کیا گیا)۔

یادداشتیں

(۱) "ہندو"۔ جیسا کہ باب دو میں وضاحت آچکی ہے، برنی اس لفظ کو ایک محدود مفہوم میں عام کسانوں سے اونچے طبقوں کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ اس سیاق میں یہ فی الواقعی سرداروں اور چودھریوں کے مرادف ہے۔

(۲) " سردار سے بھنگی تک " از خوطہ و بلدہر۔ بلدہر، فارسی لفظ نہیں ہے اور ہم اسے بلا تامل بلاکمین کی پیروی کرتے ہوئے کسی نیچی ذات کے نوکر کے لیے عام ہندی نام تصور کر سکتے ہیں جس سے موضع میں عام غلام کا کام لیتے تھے۔ بالائی دوآب میں جو برنی کا علاقہ تھا بلدہر تقریباً ہمیشہ بھنگی ذات کا ہوتا ہے۔ اور چونکہ یہ لفظ بظاہر دیہی آبادی کے سب سے نیچے طبقہ کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لہذا اس کے "بھنگی" کے ترجمہ سے غالباً مصنف کے ذہن میں جو تخیل تھا وہ ادا ہو جاتا ہے۔ اس کا انگریزی میں کوئی معین مرادف نہیں ہے۔

جس لفظ کو ہم نے وقتی طور پر انگریزی میں KHUTA لکھا ہے، تحریروں میں کہیں اور پایا نہیں جاتا۔ ہمیں اس کی تعبیر برنی کی تحریروں میں اچھی خاصی تعداد میں پائی جانے والی مماثل عبارتوں سے کرنی ہوگی۔ یہ بغیر کسی فرق کے خوط اور خوطہ کے طور پر ملتا ہے اور ان دونوں

ؔ بلدہر کی حیثیت کے لیے ملاحظہ ہو، لوبنو سلیکشنز (۲) ۹۷۔

میں کوئی امتیاز قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اسے بظاہر کی ضد کے طور پر استعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں خوط کو گانوں کے امیر طبقہ میں تلاش کرنا چاہیے اور تمام عبارتوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ خوط کو عام طور پر مُکھیے یا مقدم کے ساتھ جوڑا گیا ہے (مثلاً ۲۸۸، ۲۹۱، ۳۲۴، ۴۳۰، ۴۷۹، ۵۵۴) اور دو عبارتوں (۲۸۸) میں اسے چودھری یا پرگنہ کے مُکھیے اور نیز مقدم سے متعلق کیا گیا ہے اور اس کی بالائی رقوم اسی سطح پر تھیں (۴۳۰) جیسی کہ مقدم کی۔

برنی اپنی تصنیف کے تقریباً خاتمہ کے قبل تک (۵۸۹،۵۲۹) ایک زمیندار کے لیے (جو بادشاہ کا ماتحت ہو) سردار کا لفظ نہیں استعمال کرتا اور یہ زرعی پالیسی پر اس کی بحث میں بالکل نہیں ملتا اور جہاں کہیں بھی لفظ 'زمیندار' کے استعمال کیے جانے کی توقع ہوسکتی تھی، ہمیں وہاں زمیندار ملتا ہے اور اس کی واحد معقول توجیہہ یہی ہوسکتی ہے کہ اس کی زندگی میں زمیندار کے لفظ کا استعمال شروع ہو گیا تھا اور یہ خوط کی جگہ لے رہا تھا۔ پس یہ دونوں الفاظ حقیقتاً مترادف ہیں۔ اگر ہم ہر جملہ میں استعمال ہونے والے خوط کا ترجمہ زمیندار کریں تو ہمیں مکمل طور پر معقول مفہوم ملتا ہے۔ اگر یہ دونوں الفاظ مرادف نہیں ہیں تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اگلے وقائع نگار کی تحریر کے وقت خوطوں کا اہم طبقہ، جیسا کہ برنی اسے جانتا تھا، بالکل ختم ہوچکا تھا اور یہ کہ اتنا ہی اہم زمینداروں کا طبقہ پراسرار طور پر وجود میں آچکا تھا۔ یہ مفروضہ اسی قدر غیر معقول ہے جس قدر غیر ضروری۔

لفظ خوط کی اصل مشتبہ ہے۔ بلاکمین نے اسے وہ شاذ استعمال ہونے والا عربی لفظ تصور کیا جس کا اسٹین گاز نے ترجمہ "ایک لچکدار ٹہنی' ایک فربہ مگر خوبصورت اور مستعد شخص" سے کیا ہے، لیکن اس نے یہ واضح نہیں کیا کہ آخر کسی ایسے لفظ کے سرداریوں کے معنی ہوگئے۔ میں نے جن قلمی نسخوں کو دیکھا ہے ان میں حروفِ علت نہیں ملتے اور یہ ممکن ہے کہ اس کا تلفظ مختلف ہو اور یہ کہ ہمارے سامنے جو لفظ ہے وہ جداگانہ طور پر ہندوستان میں وجود میں آیا ہو۔ لیکن بہرحال اس لفظ کی اصل جو کچھ بھی ہو برنی کی تحریروں میں اس کے معنی بیّن طور پر سردار کے ہیں۔ بلاکمین نے تجزیہ کرنے کے بعد یہ صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ لفظ دیہاتی سماج کی دو انتہاؤں کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس نے اس کے جس ترجمہ کی تصدیق کی ہے یعنی "مالکان زمین اور اسامی" وہ ایک غیر منطقی نتیجہ اور تاریخی طور پر غیر معتبر تصور کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ بھی تجویز پیش کی گئی ہے کہ زیر بحث لفظ کی اصل واقعتاً ہندوستانی ہے اور یہ کہ ممکن

کا مانوس مرہٹی لفظ "کھوت ہے"۔ لیکن یہ بات کہ برنی نے اس لفظ کو دو عربی حروف (خ اور ط) کے ساتھ لکھا ہے، اس کے کسی سنسکرتی زبان سے ماخوذ ہونے کو بہت حد تک غیر یقینی بناتی ہے۔ لفظ 'کھوت' کا پتہ سولہویں صدی کی بیجاپور کی سلطنت کے قبل نہیں لگایا جاسکا ہے اور اس کی ایک امکانی توجیہہ یہ ہوسکتی ہے کہ عربی لفظ 'خوط' علاء الدین کی فتح کے زمانہ میں دکن میں داخل ہوا اور اس نے وہاں کی دیسی شکل 'کھوت' اختیار کرلی۔ یہ بات کہ گجرات میں بھی کھوت پائے جاتے تھے، پروفیسر ہودی والا کے مطبوعہ ایک دستاویز (STUDIES IN PARSI HISTORY, P. 204) سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن ان کی حیثیت کو واضح نہیں کیا گیا۔ یہ ممکن ہے کہ عربی لفظ جو شمال میں جلد ہی متروک ہوگیا، گجرات میں ایک ہندوستانی شکل میں قائم رہا ہو، جیسا کہ دکن میں ہوا، لیکن اس نکتہ پر مزید دستاویزی شہادت کی ضرورت ہوگی۔

۳- یہ فقرہ اپنی موجودہ شکل میں قواعد کے خلاف ہے۔ فقرہ ۵ کے خاتمہ پر وقف کی علامت لگاکر، آور دان کی جگہ آور دند پڑھنا مناسب ہوگا۔ اس صورت میں ترجمہ اس طور پر ہوگا: " اور مذکورہ بالا مقصد کے تحت دو ضابطے بنائے گئے"۔ اس طور پر قواعد اور مفہوم دونوں درست ہوجاتے ہیں۔ بہرحال برنی کی قواعد بےعیب نہیں ہے، اور متن سے اس نے جو کچھ واقعتاً لکھا ہے ظاہر ہوسکتا ہے۔

۴- "پیمائش اور بسوہ کی پیداوار کا قاعدہ": حکم مساحت و وفائے بسوہ۔

برنی تشخیصِ مساحت اور حاصل کے لیے دو "حکموں" یا قاعدوں کا ذکر کرتا ہے، یعنی "پیمائش" اور "پیداوار"۔ وہ طریقوں کو بیان نہیں کرتا، لیکن اس کے بعد آنے والی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ مساحت میں فصل کے نقصان کا لحاظ رکھے تھے، جب کہ حاصل میں ایسا نہ تھا۔ اگر ہم ان دونوں اصطلاحوں کو ان طریقوں کا جواب بالکل بھلائے جاچکے ہیں مرادف نہ خیال کریں، تو پھر ہمیں انھیں ان دو طریقوں کا مرادف تصور کرنا ہوگا جنھیں میں نے پیمائش اور بٹائی کہا ہے، جنکے متعلق پہلے گذر چکا ہے کہ اس عہد میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کے درمیان مساوی طور پر معروف تھے اور جو سولہویں صدی میں مختلف ناموں سے دوبارہ سننے میں آتے ہیں اور جو انیسویں صدی میں بھی برقرار رہے۔ مغلیہ عہد کے سرکاری کاغذات میں لفظ مساحت کی جگہ جریب یا پیمائش نے لے لی۔ لیکن بظاہر مقامی طور پر اس کا استعمال قائم رہا، کیوں کہ اس قدر بعد یعنی ۱۸۲۲ء میں " دیسی جریب " " نظام مساحت " کے نام سے

موسوم تھی [ریونیو سلکشنز (۲)، ۸، ۲]۔ حاصل کا مفہوم بالکل فطری طور پر پیداوار کی بٹائی کا عمل تصور کیا جاسکتا ہے، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا کوئی اور مفہوم نہیں ہوسکتا۔

'وفائے بسوہ' کا فقرہ، برنی کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا اور ہم یہاں اسے صرف اس کے قبل آنے والے فقرہ: "رقبہ کی اکائی پر اعتماد" کی تکرار یا نقل تصور کرسکتے ہیں۔ "بسوہ چھوٹی اکائی یعنی ۱/۲۰ بیگھہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اگلی دو سرگذشتوں کی عبارتیں بہرحال یہ ظاہر کرتی ہیں کہ لفظ' وفا' نے فصلوں کی پیداوار کا اصطلاحی مفہوم حاصل کرلیا تھا اور یہاں اس کا غالباً یہی مفہوم ہے۔ ایسی صورت میں "بسوہ کی پیداوار" کے معنی رقبہ کی فی اکائی کا معیاری حاصل ہوگا، جو طریقۂ پیمائش کے لیے ایک ضروری اطلاع تھی۔ ہمیں فیصلہ کن عبارت تاریخ مبارک شاہی (اورینٹل ۵۳۱۸، فولیو ۳۴ آر) میں ملتی ہے، جس میں محمد تغلق کے عہد میں دریائی علاقہ میں مظالم کے بیان کے سلسلہ میں ہمیں یہ فقرہ ملتا ہے: کشتہا می پیمودند و وفا ہا فرمانی می بستند، وہ لوگ کھیتوں کو ناپتے تھے اور فرمان کے ذریعہ پیداوار کو مقرر کرتے تھے۔ یہاں' وفا ہا' کو کسی دوسرے مفہوم میں تصور کرنا ممکن نہیں۔ عفیف ۱۸۰ میں بھی اس کا یہی مفہوم نکلتا ہے جس میں یہ دوبارا استعمال ہوا ہے اور ان مثالوں کے پیشِ نظر یہ نتیجہ نکالنا واجب ہوگا کہ برنی بھی اس لفظ کے اس اصطلاحی مفہوم سے مانوس تھا۔ میں نے عہدِ مغلیہ میں اس کا یہ استعمال نہیں پایا اور یہ غالباً اس وقت تک متروک ہوچکا تھا۔

(۵) "سرداروں کی آمدنی" "حقوق خوطان"۔ اس کے بعد میں آنے والی عبارت سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان حقوق میں سرداروں کی خدمات کے معاوضہ کے طور پر انھیں زمین کے ایک جز کی مالگذاری سے دی گئی چھوٹ شامل تھی۔ غیاث الدین کا خیال تھا کہ یہ اس قدر ہو کہ وہ مطمئن رہیں۔ لہٰذا اس کی مقدار مزید اچھی خاصی رہی ہوگی، لیکن کس قدر زمین کی مالگذاری کی چھوٹ دی جاتی اس کے متعلق کوئی تحریر نہیں ملتی۔ اسی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرداروں پر کسانوں سے خود اپنے لیے مالگذاری وصول کرنے کا شبہ تھا۔ چوتھے فقرہ کا غالباً یہی مفہوم ہے کہ جو مالگذاری سرداروں یا چودھریوں کو ادا کرنا چاہیے تھا، اسے حقیقتاً کسان ہی ادا کررہے تھے۔

■ غیاث الدین کی زرعی پالیسی

(۱) متن، برنی ۴۲۹، اورئنٹل ۲۰۳۹ سے موازنہ کیا گیا۔ ترجمہ جرنل آف دی (رائل)

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال جلد ۳، ص ۲۲۹۔ ایلیٹ (۳)، ۲۳۰ میں ترجمہ بالکل ہی نامکمل ہے
میں نے مسٹر آر۔ بیجیٹ ڈیو ہرسٹ سے اس انتہائی الجھی ہوئی عبارت کے سلسلہ میں
مدد طلب کی اور انھوں نے فراخ دلی کے ساتھ حسب ذیل ترجمہ فراہم کیا ہے۔ جن یادداشتوں
پر [د] کا نشان لگا ہوا ہے وہ بھی ان کی ہیں اور بقیہ میری۔

۱۔ اس نے سلطنت کے علاقوں کی مالگذاری کو پیداوار کے قاعدہ (۱) (حکم حاصل) کے مطابق منصفانہ طور پر مقرر کیا۔

۲۔ اور علاقوں و سلطنت کے کسانوں کو نقصان فصل (۲) پر مبنی جدتوں اور تقسیموں کے بار سے محفوظ کیا۔

۳۔ اور صوبوں اور سلطنت کے علاقوں کے متعلق وہ جاسوسوں کے حصّوں اور اضافہ پر اصرار کرنے والوں (موفران) کی تقریروں (۳) اور مالگذاری کے مستاجروں کی بولیوں (لفظ: قبولیتوں) پر دھیان نہ دیتا تھا۔

۴۔ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ جاسوسوں اور اضافہ کی رائے دینے والوں اور مالگذاری کے مستاجروں اور زمین کو خراب کرنے والوں (مخربان) کو وزارت کے گرد چکر لگانے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔

۵۔ اور اس نے وزارت کے دفتر کو ہدایت کی کہ تخمینہ اور قیاس سے یا جاسوسوں اور اضافہ کرنے والوں کے نمائندوں کی رپورٹوں پر، صوبوں اور علاقوں پر ۱/۱۰ یا ۱/۱۱ سے زائد اضافہ نہ کرنا چاہیے۔

۶۔ اور یہ کہ اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ کاشت کاری ہر سال بڑھے اور مالگذاری میں بہت دھیرے دھیرے اضافہ کیا جائے۔

۷۔ اور اس طور پر نہیں کہ زیادہ دباؤ کے باعث علاقہ سب کا سب ایک ساتھ برباد ہو جائے اور اضافہ کی راہ بند ہو جائے۔

۸۔ سلطان تغلق شاہ اکثر یہ کہا کرتا کہ علاقہ سے مالگذاری اس طور پر وصول کی جائے کہ علاقہ کے کسان کاشت کاری کو بڑھا سکیں۔

۹۔ اور قائم کی ہوئی کاشت کاری مستقل ہو جائے اور ہر سال تھوڑا تھوڑا اضافہ ہو۔

۱۰۔ وہ کہا کرتا کہ تمھیں ایک ساتھ اس قدر نہ لے لینا چاہیے کہ نہ تو موجود کاشت ہی

قائم رہ سکے اور نہ مستقبل میں کوئی اضافہ ہو سکے۔

۱۱- جب بظاہر سلطنتیں برباد ہوتی ہیں (لفظ: برباد ہوتی ہیں اور برباد دکھائی دیتی ہیں) تو اس کا سبب ظالمانہ مالگذاری اور شاہی مطالبہ کی زیادتی ہوتی ہے۔

۱۲- اور تباہ کن مقطعیوں اور سرکاری عملے سے بربادی واقع ہوتی ہے۔

۱۳- کسانوں سے مالگذاری کی ناجائز وصولی کے متعلق سلطان تغلق شاہ خود سلطنت کے علاقوں کے تمام مقطعیوں اور صوبے داروں کو اس طور پر ہدایت دیا کرتا تھا۔

۱۴- کہ ہندو کو ایسی حالت میں رکھنا چاہیے کہ دولت کی زیادتی کے باعث وہ اندھا، باغی اور سرکش نہ ہو جائے،

۱۵- اور یہ کہ وہ غربت و افلاس سے اس قدر مجبور نہ ہو جائے کہ کاشت وزراعت کو چھوڑ دے۔

۱۶- وصولیٔ مالگذاری کے سلسلہ میں ذکر کیے ہوئے معیاروں اور اصولوں کی انجام دہی مخصوص طور پر ممتاز مدبّرین و ماہرین ہی کر سکتے ہیں،

۱۷- ہندوؤں (۴۰) کے سلسلہ میں تدبّر و حکمت کا لب ولباب مذکورہ بالا ہدایت کی انجام دہی میں ہے۔

۱۸- مزید کہ مالگذاری کی وصولی کے سلسلہ میں سلطان غیاث الدین تغلق کے متعلق جو ایک بہت ہی تجربہ کار، دور اندیش اور سمجھ دار بادشاہ تھا کہا جاتا ہے،

۱۹- کہ وہ مقطعیوں اور صوبے داروں کو مالگذاری کی وصولی کے سلسلہ میں تحقیقات اور یکساں روی پر مجبور کرتا تھا،

۲۰- تاکہ سردار اور چودھری کسانوں پر بادشاہ کی مالگذاری کے علاوہ کوئی اور تشخیص عائد نہ کریں۔

۲۱- اور اگر خود ان کی کاشت کاری اور چراگاہوں پر تشخیص عائد نہ ہو تو اس مفروضہ پر کہ وہ اس پر کچھ ادا نہیں کرتے، بحیثیت سرداروں اور چودھری کے ان کے حقوق کو ان کے لیے کافی ہونا چاہیے اور انھیں کوئی زائد مطالبہ نہ کرنا چاہیے۔

۲۲- اس سے انکار نہیں کہ سرداروں اور چودھریوں کی گردنوں پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر مثل کسانوں کے وہ بھی کچھ ادا کریں تو سردار یا چودھری

ہونے کا فائدہ ختم ہو جائے گا۔

۲۳- اور امیروں اور مالکوں (۵) میں سے ایسے لوگوں کے متعلق جنھیں سلطان غیاث الدین تغلق نے ترقی دی تھی اور اقطاع اور صوبے منظور کیے تھے،

۲۴- وہ اس کی اجازت نہ دیتا تھا کہ یہ لوگ (معمولی) سرکاری عملہ (۶) کی طرح وزارت کے سامنے پیش کیے جائیں اور یہ کہ ان سے اسی بدتمیزی اور سختی کے ساتھ مالگذاری طلب کی جائے جیسا کہ مذکورہ عملے کے ساتھ کی جاتی ہے،

۲۵- لیکن وہ یہ کہتے ہوئے انھیں ہدایت دیا کرتا کہ،

۲۶- اگر تم وزارت کے دفتر میں طلبی کی زحمت سے اور دباؤ اور بداخلاقی (کے خطرہ) سے بچنا چاہتے ہو،

۲۷- اور یہ کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمھارا حیثیت ایک امیر یا مالک کے اعتبار، ذلت اور رسوائی میں تبدیل نہ ہو، تو،

۲۸- تو تم اپنی اقطاعوں پر تھوڑے مطالبات عائد کرو،

۲۹- اور ان تھوڑے مطالبات میں سے اپنے گماشتوں کے لیے کچھ مخصوص کردو،

۳۰- اور سپاہیوں کی تنخواہ سے قلیل ترین رقم کی بھی خواہش نہ کرو،

۳۱- تم اپنے پاس سے سپاہیوں کو کچھ دو یا نہ دو، اس کا فیصلہ تم پر منحصر ہے۔

۳۲- لیکن اگر تم سپاہیوں کے لیے جو رقم وضع کی جاتی ہے، اس میں سے تھوڑے حصہ کی توقع رکھتے ہو تو،

۳۳- ایسی صورت میں تمھارے لیے امیر اور مالک کا لقب زیب نہ دے گا۔

۳۴- اور جو امیر، ملازموں کی تنخواہ کا ایک حصہ خود ہڑپ کر لیتا ہے وہ دھول پھانکتا ہے۔

۳۵- لیکن اگر مالک اور امیر خود اپنے علاقوں اور صوبوں سے مالگذاری کے $\frac{1}{2}$ یا $\frac{1}{22}$ اور $\frac{1}{10}$ یا $\frac{1}{15}$ کی توقع رکھتے ہیں،

۳۶- اور اقطاع داری اور صوبے داروں کے حقوق لیتے ہیں،

۳۷- تو انھیں اس سے باز رکھنے کی ضرورت نہیں اور ان سے اسے دوبارہ طلب کرنا اور امیروں پر دباؤ ڈال کر اس رقم کو ان سے وصول کرنا بہت ہی زیادہ افسوسناک ہوگا۔

۳۸- اسی طور پر اگر علاقوں اور صوبوں کے کارکنان اور متصرفان (۷)، اپنی تنخواہ کے

علاوہ نصف یا ایک فیصدی وصول کریں تو،

۳۹۔ انھیں اس رقم کے لیے ذلیل نہ کرنا چاہیے اور اسے ان سے مار پیٹ اور اذیت اور قید اور بیڑیوں کے ذریعہ واپس نہ لینی چاہیے۔

۴۰۔ لیکن اگر وہ قابل اعتنار رقموں (۸) پر تصرف کرتے ہیں اور مالگذاری کے مطالبہ سے منہائیاں قلم زد کرتے ہیں اور صوبہ اور علاقوں سے باہمی تقسیم کے ذریعہ لمبی رقمیں لے لیتے ہیں تو،

۴۱۔ ایسے دغاباز اشخاص اور چوروں کو مار پیٹ اور اذیت اور قید اور بیڑیوں کے ذریعہ ذلیل ورسوا کرنا چاہیے اور انھوں نے جو کچھ بھی چرایا ہوا سے مع ان کے خاندانی ذخیروں کے ان سے لے لینا چاہیے۔"

متن پر یادداشتیں

فقرہ ۳۔" (نیلامی) بولیاں" متن میں 'پذرفتیتھا' واضح طور پر 'پذیرفتیتھا' کے بجائے ایک فاش غلطی ہے (د)

۴۔" زمین کو خراب کرنے والے" 'محذمان' کے بجائے محزبان پڑھتے ہوئے۔ اور نیٹل ۲۰۳۹ کو اس طرح پڑھا جاسکتا ہے۔

۷۔" اس طور پر نہیں" 'تا' کے بجائے 'نہ' پڑھتے ہوئے جیسا کہ اورنیٹل ۲۰۳۹ میں ہے

۲۶۔" اگر تم چاہتے ہو" 'خواہد' کے لیے 'خواہد' پڑھتے ہوئے جیسا کہ اورنیٹل ۲۰۳۹ میں ہے

فقرہ ۲۶۔" (خطرہ سے) بچنا" 'بیفتد' کے بجائے 'نیفتد' پڑھتے ہوئے جیسا کہ اورنیٹل ۲۰۳۹ میں ہے

۳۸۔" تصرف کریں" اصایت کے لیے اصابت پڑھتے ہوئے جیسا کہ اورنیٹل ۲۰۳۹ میں ہے۔

یادداشتیں

(۱)" پیداوار کا قاعدہ": "حکم حاصل"۔ اس کے قبل کی عبارت پر یادداشت نمبر ۳ ملاحظہ ہو۔

(۲)" نقصان فصل": 'بود ونابود ہا'۔ اس محاورہ کا اصطلاحی مفہوم جس کے لفظی معنی "موجودگی اور غیر موجودگیاں" ہیں اکبر کے تشخیص کے قاعدوں [آئین (۱) ۲۸۸] کے تحت مقرر کیا گیا ہے جن میں کارکن کو 'نابود' منہا کرنے اور 'بود' کو درج کرنے یعنی پیمائش کیے ہوئے رقبہ سے اس رقبہ کو جس پر فصل کا نقصان ہوا ہو خارج کرنے کی ہدایت ہے۔ غالباً لفظ قسمت نقصان کے رقبہ کی زمرہ بندی کے عمل سے متعلق ہے۔ لفظ "نابود"

انیسویں صدی میں مجموعی تشخیص سے منہائی کے وسیع تر مفہوم میں قائم رہا۔ ریونیو سلیکشنز [(۱)، ۳۰۵]

(۳) "اضافہ کرنے والے" موفرآن۔ ہم اس لفظ کو جو لغت میں نہیں ملتا، توفیر کے اصطلاحی مفہوم یعنی زمین سے حاصل کیے ہوئے کسی خفیہ نفع سے منسوب کر سکتے ہیں۔ ایک بعد کی عبارت (۴، ۵) میں برنی نے اس کا مرادف' توفیر نمایاں' یعنی خفیہ نفع کو ظاہر کرنے والا' استعمال کیا ہے۔ یہ واضح طور پر ایک دفتری اصطلاح ہے اور مسٹر ڈیو ہرسٹ نے 'ENHANCEMENT MONGER' کو جسے میں نے ایک تخمینی مرادف کے طور پر گڑھا ہے اختیار کیا۔

(۴) اس عبارت میں 'ہندو' کا بظاہر وہی محدود مفہوم ہے جو اس کے قبل کی عبارت میں ہے۔

(۵) "امیروں اور ملکوں" اس وقت امیروں کے طبقہ کے لیے تین مسلمہ القاب تھے: خاں، امیر اور ملک۔ یہاں ان الفاظ کو تخمینی طور پر 'امراء' کا مرادف تصور کیا جا سکتا ہے۔

(۶) "سرکاری عملہ" عاملان 'عمّال'۔ لفظ عامل کو ابھی تک کسی معین عہدہ کے ساتھ مخصوص نہ کیا گیا تھا بلکہ اس کے معنی کوئی بھی انتظامی عہدہ دار تھے۔

(۷) کارکنان و متصرفان۔ کارکن اشتقاقی طور پر ایک گماشتہ کا مفہوم رکھتا ہے۔ یہ بات مجھ پر واضح نہ ہو سکی کہ آیا یہ لفظ اس وقت تک "محرروں" کے مفہوم میں جو سولھویں صدی میں معمولاً اس کے معنی تھے مخصوص ہوا تھا یا نہیں۔ بعض عبارتوں میں یہ مفہوم نکلتا ہے اور بعض مشتبہ ہیں۔ غالباً اس لفظ کا یہ مخصوص استعمال اس زمانہ میں جاری ہو گیا تھا مگر ابھی مکمل نہ ہوا تھا۔ مجھے کوئی ایسی عبارت نہیں ملی ہے جس سے یہ واضح ہو کہ 'متصرف' کوئی معین عہدہ تھا یا نہیں۔ یہ لفظ مقامی ملازمتوں میں ملتا ہے اور اس کے معنی عمومی یا ماتحتین یا ماتحتوں کا ایک مخصوص طبقہ ہو سکتا ہے۔

(۸) "قابل لحاظ رقمیں" 'معتدّ بہا'۔ میں اس کے معنی "ایک قابل لحاظ رقم" تصور کرتا ہوں۔ اس کے لفظی معنی "کوئی شمار کی ہوئی چیز" لہٰذا "کوئی قابلِ شمار چیز" (۳ د) ہوتے ہیں۔ الفاظ اقطاع اور مقطعی پر جو ترجمہ میں قائم رکھے گئے ہیں ضمیمہ ب میں بحث آ چکی ہے۔ ان کے برقرار رکھے جانے کا مقصد بار بار استعمال ہونے والے دوہرے الفاظ کے صحیح

مفہوم کو ظاہر کرنا ہے۔

■— فیروز شاہ کا دوسرا ضابطہ

متن برنی ۴، ۵ - اس کا کوئی چھپا ہوا ترجمہ میرے علم میں نہیں آیا ہے۔ جس باب میں یہ ضابطہ پایا جاتا ہے وہ اور نیز متعدد دیگر ابواب بہت توصیفی اور خطیبانہ ہیں اور اس کے جملہ بیانات پر بہت زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن فیروز کی عام پالیسی کے متعلق اس کے بیان پر یقین نہ کرنے کا کوئی سبب نہیں۔

(۱) دوسرا ضابطہ :- حکم ہوا کہ مطالبہ مالگذاری اور جزیہ (۱) "پیداوار کے قاعدہ" کے مطابق وصول ہونے چاہئیں۔

(۲) "تقسیمیں" اور "اضافۂ مطالبہ" اور "نقصان فصل" اور "اندازہ پر مبنی لمبے لمبے مطالبے" کسانوں سے بالکل ہٹا لیے گئے تھے (۲)،

(۳) اور مالگذاری کے مستاجروں، اور محرّبان (زمین کو خراب کرنے والوں) اور موفرّان (اضافہ پر اصرار کرنے والوں) کی صوبوں میں اور بادشاہت میں کثرت کو منع کیا گیا۔

(۴) اور محصول معمولاتی (کذا!) (۴) میں کمی کی گئی تاکہ کسان خوشی سے اور بغیر دقت یا سختی کے ادا کر سکیں،

(۵) اور کاشت کاروں کے ساتھ جو مسلمانوں کے خزانہ (۵) کے نگراں ہیں کوئی بداخلاقی یا سختی نہیں کی گئی۔

یاداشتیں

(۱) جزیہ کا حوالہ الجھن پیدا کرنے والا ہے۔ بقول عفیف (۳۸۳) دہلی میں یہ محصول فی کس نقد میں واجب الادا، ایک مقررہ رقم تھی۔ یہ ممکن ہے کہ کسانوں پر یہ محصول، مالگذاری کے ساتھ تشخیص اور اس کے ساتھ کم و بیش ہوتا ہو۔ لیکن یہ بھی اسی قدر ممکن ہے کہ یہ لفظ مبہم ہو، کیونکہ "مالگذاری اور جزیہ" کو عمومی انداز میں غیر مسلم رعایا پر واجب الادا بیان کیا گیا ہے۔

(۲) اس فقرہ کے متعلق یہ تصور کرنا چاہیے کہ اس میں کسانوں پر جانے بوجھے ہوئے ناجائز محصولوں کو معین کیا گیا ہے۔ اس کے قبل کی عبارت میں 'قسمت'، اور 'نقصان فصل'

نابود با درج ہے۔ اس میں 'معتدبہا' کو کثیر رقم کے ناجائز محصول تصوّر کیا گیا ہے اور یہاں لفظ 'تصوری' کے اضافہ کے ساتھ یہ مطلب ہوں گے کہ یہ ناجائز محصول من مانے یعنی "قیاس پر مبنی" تھے۔

(۳) یہ فقرہ بھی اس کے قبل کی عبارت کے ایک جز کی ہو بہو نقل ہے۔ اس میں ان بلائے جان افراد کا حوالہ دیا گیا ہے جو نظری طور پر تشخیص مالگذاری کے سلسلہ میں سامنے آتے تھے۔

(۴) 'محصول معاملاتی' مجھے اس کے مماثل کوئی اور عبارت نہیں ملی جس سے اس اصطلاح کے معنی ظاہر ہوں۔ سیاق عبارت سے یہ خراج یا مالگذاری سے مختلف، کسانوں پر کسی کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس کی نوعیت کے متعلق محض قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔

(۵) خزانہ، بیت المال۔ یہ اسلامی قانون کی ایک معین اصطلاح ہے' یہ اس جگہ کو ظاہر کرتا ہے جہاں خراج اور دیگر ذرائع آمدنی جو نظری طور پر عام مسلمانوں کے مفاد کے لیے مخصوص تھے، جمع کیے جاتے تھے، حالانکہ اس وقت تک ہندوستان میں یہ حقیقتاً حکومت کے محاصل میں شامل ہو چکے تھے۔

فیروز شاہ کی تشخیص

(متن عفیف ،۴۹۔ مجھے اس کا کوئی ترجمہ نہ ملا۔ اس کا محض ایک جملہ الیٹ (۳، ۲۸۸) میں درج ہے)

(۱) بادشاہ نے ... بادشاہت کے مطالبہ (۱) کا نئے سرے سے بندوبست کیا اور اس مطالبہ کے بندوبست کے لیے خواجہ حسام الدین جنید مقرر ہوا۔

(۲) شریف خواجہ جس نے بادشاہت کے اندر چھ سال صرف کیے تھے،

(۳) (اور) مطالبہ کا "مشاہدہ کے قاعدہ" (۲) کے مطابق بندوبست کر کے،

(۴) بادشاہت کی "جمع" کو اصول بادشاہی کے مطابق ۶،۵ لاکھ ٹنکوں پر معین کیا۔

(۵) فیروز شاہ کے پینتالیس سالہ عہد حکومت میں دہلی کی "جمع" اسی قدر رہی۔

یادداشتیں

(۱) "مطالبہ": "محصول" عفیف اس لفظ کو کبھی کبھی مطالبہ مالگذاری کے مفہوم میں استعمال کرتا ہے، یعنی خراج کے مرادف کے طور پر اور جہاں تک میں پتہ چلا سکا اس نے

اسے کبھی بھی "زمین کی پیداوار" کے مفہوم میں جیسا کہ بعد کے بعض مصنفوں کے یہاں ملتا ہے استعمال نہیں کیا ہے۔

(۲) "مشاہدہ کا قاعدہ": "حکم مشاہدہ": میرے علم کی حد تک تحریروں میں کہیں اور نہیں ملتا۔ اس کے پہلے کی عبارت میں برنی کی اطلاع ہے کہ فیروز نے تخت پر بیٹھنے کے بعد "پیداوار کا قاعدہ" اختیار کیا۔ عفیف کا بیان اسی عہد کے متعلق ہے، کیونکہ یہ تقرری' بادشاہ کے دہلی پہنچنے کے بعد بہت جلد کی گئی تھی۔ ایسی صورت میں یا تو مصنفین میں سے کسی ایک سے غلطی ہوئی یا پھر دونوں اصطلاحوں کا مفہوم کوئی ایک ہی چیز ہے۔ غلطی کا امکان نہیں پایا جاتا کیونکہ مصنفین کے ایسے پرانے عہدہ داران اصطلاحوں کا غلط استعمال نہیں کیا کرتے۔ عفیف کے الفاظ متعدد مواقع پر برنی کے الفاظ سے مختلف ہیں مثلاً "خوط" اور "پرگنہ" لہذا لفظی انحراف سے کسی غلطی کا ہونا نہ تصور کرنا چاہیے۔ 'مشاہدہ' سے" دیکھنے" یا "ملاحظہ کرنے" کا عام تخیل پیدا ہوتا ہے اور ان دونوں بیانات میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے صرف اس قدر ضرورت ہے کہ اس لفظ کے معنی بٹائی بذریعہ قیاس تصور کیے جائیں۔ یہ ایسے اشخاص سے متعلق ہے جو پیداوار کا اندازہ لگانے کی غرض سے اگتی ہوئی فصل کی حالت کا مشاہدہ یا معائنہ کرتے ہیں۔ پس ہم' یہ کہہ سکتے ہیں کہ' برنی بٹائی کو مقررہ بتاتا ہے، لیکن عفیف کی اطلاع کے مطابق بٹائی واقعی تقسیم کے طور پر نہیں بلکہ تخمینی ہوتی تھی۔ اس تعبیر کی بنیاد پر مشاہدہ کی اصطلاح کی غیر موجودگی کو بہ سہولت سمجھا جا سکتا ہے، لیکن مغلیہ عہد کی سرکاری تحریروں میں زیر بحث عمل کے اظہار کے لیے اس کا ہندی نام کنکوت استعمال کیا گیا ہے۔

اس نظام کے تحت مالگذاری کا مطالبہ فصل فصل پر بوئے ہوئے رقبہ اور کاٹی ہوئی پیداوار کے مطابق تبدیل ہوتا رہتا تھا' لیکن لفظ بندوبست کرنے': "بستن" کا یہ مفہوم نہ سمجھنا چاہیے کہ واجب الادا ٹنکوں کی تعداد کو پہلے سے مقرر کر دیتے تھے۔ میں اس کے یہ معنی سمجھتا ہوں کہ پچھلے عہدِ حکومت کے دوران جو انتشار واقع ہوا تھا اس کے بعد تشخیص کے انتظامات کو دوبارہ منظم کیا گیا۔

۳۔ جیسا کہ ضمیمہ الف میں وضاحت آچکی ہے، بعد کی تحریروں میں "جمع" کے دو بالکل متعین مفہوم پائے جاتے ہیں۔ جمع مال کے طور استعمال ہونے کی صورت میں' یہ مالگذاری کے مجموعی مطالبہ اور جمع ولایت (یا پرگنات) کے طور پر استعمال ہونے کی صورت میں' یہ اس

مالیت کو ظاہر کرتا ہے جس کی بنیاد پر اقطاعوں کی تقسیم ہوتی تھی۔ اس عبارت میں یہ موخرالذکر مفہوم کا متحمل نہیں ہو سکتا، کیونکہ جمع کے تعین کو مالگذاری کے مطالبہ کے بندوبست سے ایک مختلف عمل بیان کیا گیا ہے، جب کہ فصل کے ساتھ تبدیل ہوتا ہوا مطالبہ بیّن طور پر ایک ایسے مطالبہ سے جو چالیس برس کی مدت تک تبدیل نہ ہو ہم آہنگ نہیں۔ متن میں ہمیں جمع مملکت ملتا ہے جسے ہم بجا طور پر بعد کی اصطلاح یعنی جمع ولایت کی ایک مختلف شکل تصور کر سکتے ہیں اور مالیت اس کا ایک بہت ہی معقول مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ باب دو میں گذر چکا ہے کہ اس کے قبل کے عہد میں مالیت کا وجود پایا جاتا تھا اور حقیقتاً کسی بھی جاگیری نظام (ASSIGNMENT SYSTEM) کا لازمی عنصر ہے۔ یہ بات بھی پہلے آچکی ہے کہ مالیت حقیقی صورت حال سے بہت زیادہ منحرف ہو چکی تھی۔ میں اس عبارت کو اس اطلاع کا حامل تصور کرتا ہوں کہ خواجہ حسام الدین نے نظامِ تشخیص کو ترتیب دیا اور چھ سال کے تجربہ کی بنیاد ایک نئی مالیت قائم کی جو پورے عہدِ حکومت کے دوران زیر استعمال رہی۔

ضمیمہ (د)

نسق کے ذریعہ تشخیص

میں نے کتاب کے متن میں عام طور پر اکبر کے طریقۂ تشخیص کے اس بیان کی پیروی کی ہے جو چند سال گذرے مسٹر یوسف علی کی رفاقت میں لکھے ہوئے ایک مضمون میں پیش کیا گیا تھا (جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۱۸ء صفحہ و ما بعد)۔ اس مضمون میں پیش کیے ہوئے نتائج پر میری نظر سے کوئی مطبوعہ تنقید نہیں گذری لیکن بعض علم والوں نے مجھے مطلع کیا ہے کہ نسق کی اصطلاح کو کسی مخصوص طریقۂ تشخیص کے مرادف قرار دیئے جانے پر ہندوستان میں اعتراض کیا گیا ہے۔ لہذا غالباً اس نکتہ پر تھوڑی تفصیل کے ساتھ بحث مناسب ہوگی۔ اعتراض جس کی مجھے اطلاع دی گئی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ اس دور کی عام تحریروں میں نسق کا ایک بالکل متعین مفہوم موجود ہے، لہذا ہمیں اس مفہوم کو اوّل سے آخر تک قبول کرنا چاہیے اور منتشر عبارتوں سے کوئی دوسرا متناقض مفہوم اخذ کرنا واجب نہ ہوگا۔ اس اعتراض پر میرا جواب یہ ہے کہ اس لفظ کا عمومی مفہوم، ماہر عہدہ داروں کی لکھی ہوئی عبارتوں کو مہمل بنا دیتا ہے اور یہ کہ چونکہ ہمیں یہ تصور کرنے کا حق نہیں پہنچتا کہ ان کی لکھی ہوئی عبارتیں مہمل ہوں گی، لہذا ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ ان عبارتوں میں یہ لفظ ایک مخصوص اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جو اس زمانہ میں اس کے عام مفہوم کے ساتھ ساتھ رائج تھا، لیکن بعد میں متروک ہوگیا۔ دو مفہوموں کی ایک ساتھ موجودگی کوئی غیر معمولی صورتِ حال نہیں ہے۔ ہم موجودہ زمانہ میں انگریزی زبان میں کسی غیر قوم کے طور طریقوں اور رواجوں کے لیے کسٹم کا لفظ لکھتے ہیں اور ہم اسی طور پر کسی غیر ملکی

بندرگاہ پر عائد کیے ہوئے درآمدی محصول کے لیے لفظ کسٹم (CUSTOM) کو استعمال کرتے ہیں۔ پہلی صورت میں ہم لفظ "CUSTOM" کو اس کے عمومی مفہوم میں اور دوسری صورت میں ہم اسے حکومت کے طرف سے عائد کیے ہوئے درآمدی محاصل کے خصوصی اصطلاحی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایسے محاصل ہیں جس میں رسم ورواج کا کوئی عنصر شامل نہیں۔ اسی طور پر فارسی کا لفظ "دستور" ہے جس کے زیرِ بحث عہد میں متعدد عمومی معنی تھے جن میں سے ایک معنی "رواج" تھا۔ اس کے اصطلاحی معنی حکومت کا مقرر کیا ہوا تشخیصی شرحوں کا گوشوارہ بھی تھا جو کسی طور پر رواجی نہ تھا۔ لہذا کسی مخصوص لفظ کے عمومی اور خصوصی معنوں کے ساتھ ساتھ موجودگی میں کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی۔

اپنے عمومی مفہوم میں نسق کے معنی "انتظام" ہوتے ہیں اور اس زمانہ میں یہ لفظ کسی علاقہ، صوبہ یا ضلع کی انتظامی سپرداری کو ظاہر کرنے والی اصطلاحوں کے ایک مجموعہ میں سے ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ہم اکثر کسی نائب سلطنت کو اپنے صوبہ کے نظم ونسق، یا ضبط وربط، یا حراست وحکومت، پر مامور ہوتا ہوا سنتے ہیں اور یہیں اس کا متعلقہ فقرہ تنسیق وتنظیم، بھی ان صورتوں میں جب کوئی عہدہ دار کسی نئے حاصل کیے ہوئے علاقہ کے انتظام کی درستگی پر مامور ہوتا ، ملتا ہے۔ اس طور پر عمومی مفہوم واضح ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا اعتراض اس کتاب کے متن میں 'ضبط' کی جس طور پر تعبیر کی گئی ہے اس پر بھی عائد ہوتا ہے، گو اس قسم کے شبہ کا ظاہر کیا جانا میرے علم میں نہیں ہے۔

یہ بات کہ اس کا یہ عام مفہوم بعض مقامات پر عبارت کو مہمل بناتا ہے، مثالوں سے واضح کی جا سکتی ہے۔ آئین کی اطلاع [(۱)، ۶، ۲] ہے کہ شیر شاہ اور سلیم شاہ کے تحت ہندوستان میں غلّہ بخشی کے بجائے ضبط رائج ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، کسی شخص نے غلّہ بخشی کو اس طریقہ تشخیص کے جسے میں بٹائی یعنی پیداوار کی حکومت اور کسان کے درمیان تقسیم کہتا ہوں، ہم معنی ہونے پر اعتراض نہیں کیا ہے اور اس عبارت میں ضبط کو ایک متبادل طریقہ ہونا چاہیے۔ یہ کہنا کہ ہندوستان میں بٹائی کی جگہ ضبط (اپنے عام مفہوم میں) رائج ہوا مہمل ہوگا: ضبط کے معنی بٹائی سے مختلف تشخیص کا کوئی طریقہ ہونا چاہیے اور آئین کی دوسری عبارتیں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس تعبیر کی تائید کرتی ہیں کہ یہ پیمائش کے طریقہ کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ معمولاً شرحیں غلّہ میں نہیں بلکہ

نقد میں مقرر تھیں۔ یہ مفہوم اس عہد کی تحریروں میں شاذ ہی پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ اکبر نامہ کی ایک عبارت [(۲)، ۳۳۳] میں ملتا ہے، جس کی اطلاع کے مطابق ۱۳ء جلوس میں شہاب الدین خاں نے خالصہ کی زمینوں کے انتظام پر مامور ہونے کے بعد "سالانہ ضبط کو ختم کر کے نسق قائم کیا"۔ یہاں پھر ان دونوں الفاظ کے عمومی مفہوم عبارت کو مہمل بناتے ہیں، یا کم از کم اس بیان کا کہ "سالانہ انتظام کو ایک انتظام نے بے دخل کیا" کوئی مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس عبارت کو بامعنی بنانے کے لیے ضروری ہوگا کہ ان دونوں الفاظ کو یہ سمجھا جائے کہ یہ ایک ہی جنس کی مختلف قسموں کو ظاہر کرتے ہیں اور چونکہ ضبط تشخیص کا ایک طریقہ ہے لہٰذا نسق کو کوئی متبادل طریقہ ہونا چاہیے۔ گجرات کے طریقۂ تشخیص کے متعلق اس بیان کو: "بیشتر نسق اور کچھ پیمائش رائج ہے" [آئین (۱) ۴۸۵] بامعنی بنانے کے لیے بھی اسی تعبیر کی ضرورت ہوگی۔ اس بیان میں مذکور دو متبادل طریقوں کے درمیان صریحی امتیاز موجود ہے اور اسی تعبیر سے "آئین دوازدہ صوبہ" میں مندرج زمرہ بندی میں جہاں مثلاً ملتان کو "پورا ضبطی" الہ آباد کو "جزوی ضبطی"، برار کو "زیادہ عرصہ تک نسقی"، اور بنگال میں "مالگذاری نسق کے مطابق طلب کی جاتی ہے" بیان کیا گیا ہے وہاں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ بلاشک یہ آخری فقرہ اس قول کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ نسق ایک مخصوص طریقۂ تشخیص کو ظاہر کرتا ہے۔

پس اس عہد کی سرکاری تحریروں میں نسق کو بٹائی یا پیمائش کے طریقہ سے جن دونوں سے یہ بصراحت ممیز کیا گیا ہے، مختلف ایک مخصوص طریقۂ تشخیص تصوّر کرنا چاہیے۔ مستاجری کے علاوہ، واحد طریقہ جس کا تحریروں سے پتہ چلتا ہے وہ ہے جسے میں نے اجتماعی تشخیص کا نام دیا ہے یعنی کسانوں کے نمائندے کی حیثیت میں چودھریوں کی اتفاق رائے سے موضع (یا کبھی کبھی پرگنوں) پر ایک بالقطع رقم کی تشخیص جس میں منفرد کسان پر تشخیص کی تقسیم چودھریوں کے ہاتھ میں چھوڑ دی جاتی تھی۔ عہدِ اکبری کی تحریروں میں نسق کی کہیں تعریف نہیں کی گئی ہے۔ لیکن اس کے متعلق تحریروں میں مندرج چند واقعات کی بنا پر ہم اسے اجتماعی تشخیص کا جس کے لیے کوئی مخصوص نام نہیں ملتا مرادف تصوّر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ شہاب الدین احمد کی طرف سے طریقہ کی مذکورہ بالا تبدیلی کے سبب کو ان بیانات میں واضح کیا گیا ہے کہ خالصہ کی زمینوں پر تشخیص کرنے کا کام بھاری تھا اور ایماندار عملہ کی بہت کمی تھی اور یہ کہ سالانہ ضبط

بہت زیادہ خرچ طلب اور ناجائز غبن کا باعث تھا: لہٰذا اس طریقہ کو تبدیل کرنے کا مقصد ضابطہ کو مختصر اور کم خرچ بنانا اور عملہ کی بدعنوانیوں کے مواقع کو کم کرنا تھا اور یہ سب کچھ اجتماعی تشخیص سے حاصل ہو سکتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسق واضح طور پر چودھریوں کے ساتھ کیا جا سکتا تھا، کیونکہ اکبر کے محصلین کے لیے قاعدوں [آئین (۱)' ۲۸۶] میں ہدایت تھی کہ خالصہ کے علاقہ میں چودھریوں کے ساتھ نااہلی اور مظالم کے خطرہ کے باعث نسق نہ کریں۔ اس طور پر چودھریوں کے ساتھ کیا ہوا نسق، پیمائش کے طریقہ کی نسبت مختصر اور کم خرچ ہوتا اور اس میں سرکاری عملہ کی بے عنوانی کے لیے مواقع کم رہتے، لیکن چودھریوں کے طاقتور ہونے کی صورت مظالم کا اور کمزور ہونے کی صورت میں، نقصان کا خطرہ رہا کرتا۔ یہ بیان اورنگ زیب کے فرمان (جس پر باب ۵ میں بحث آچکی ہے) اور بالکل شروع کی انگریزی تحریروں (باب ۶) میں مندرج اجتماعی تشخیص کے طریقہ پر ٹھیک ٹھیک پورا اترتا ہے: اور ان میں نسق کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے جو ان دونوں کے ایک ہونے کے خلاف ہو۔ پس، ہمارے سامنے یا تو تشخیص کے دو طریقے ہیں جو کسی تحریری اطلاع کی رو سے ایک دوسرے سے قابلِ امتیاز نہ تھے بلکہ قطعاً ایک دوسرے سے بہت زیادہ مشابہ تھے یا بصورتِ دیگر ہمارے سامنے ایک طریقہ ہے جس کا عہدِ اکبری کے سرکاری کاغذات میں نام تو ملتا ہے مگر تفصیل نہیں اور اورنگ زیب کے فرمان میں اس کی تفصیل ملتی ہے مگر نام نہیں۔ میرا خیال ہے کہ بعد والی صورت ہمارے لیے بجا طور پر کم از کم اس وقت تک کے لیے قابلِ قبول ہونی چاہیے جب تک کہ کوئی ایسی شہادت سامنے نہ آجائے جو واقعی فرق کو ظاہر کر دے۔

بہرحال اب ایک یہ امکان باقی رہتا ہے کہ یہ اصطلاح ایک ایسے وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوتی ہو جو مستاجری اور نیز اجتماعی تشخیص پر حاوی ہو۔ جیسا کہ پہلے کسی اور مقام پر نشاندہی کی جا چکی ہے یہ دونوں طریقے سطحی طور سے دیکھے جانے پر ایک دوسرے سے بہت زیادہ مشابہ معلوم ہوتے ہیں، گو گانوں کے اندر کسان کے لیے ان کے درمیان ایک بیّن اور اہم فرق پایا جا سکتا تھا۔ ہر ایک صورت میں، محصّل کو ایک ایسے منفرد شخص سے معاملہ کرنا ہوتا تھا جس نے کسی موضع یا اس سے بڑے رقبہ پر کسی یکمشت رقم ادا کرنے کی پابندی قبول کی ہو۔ محصّل کے لیے، اس بات سے کہ وہ منفرد شخص موضع کا باشندہ ہے یا

کوئی باہری شخص کوئی فرق نہ پڑتا تھا اور میرے خیال میں یہ سوچا جاسکتا ہے کہ سرکاری نقطۂ نگاہ سے ان دونوں طریقوں پر حاوی، ایک واحد اصطلاح استعمال کی گئی ہو۔ مجھے کوئی ایسی عبارت نہیں مل سکی جو اس خیال کی براہِ راست تائید کرتی ہو کہ نسق اپنے محدود اور مخصوص مفہوم میں مستاجری سے متعلق ہو سکتا تھا: جہاں تک مجھے علم ہے، اس کا یہ محدود مفہوم، محض عہدِ اکبری کی تحریروں میں ملتا ہے اور کسی بات سے یہ سجھاؤ نہیں ملتا کہ وہ مستاجری کو جو مجملہ دوسرے طریقوں کے اس کے تحریروں میں مندرج نصب العین کے سب سے زیادہ خلاف تھا جائز قرار دیتا تھا، بلکہ جو تفصیلات ہمارے پاس موجود ہیں وہ اجتماعی تشخیص کی نشاندہی کرتی ہیں اور موجودہ شہادتوں کی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ میری مذکورہ تعبیر کو قبول کرنا درست ہوگا۔ لیکن اس امکان کو کہ اس میں مستاجری شامل ہے قطعی طور پر خارج نہیں کیا جاسکتا اور مزید شہادت کے دریافت کیے جانے تک اسے ایک فیصلہ طلب مسئلہ کے طور پر چھوڑ دینا چاہیے۔

ضمیمہ (ذ)

آئینِ دہ سالہ

آئین [(۱)، ۳۴۷] میں عنوان بالا کے تحت ایک مختصر سا باب، اکبر کے مالی نظم ونسق کی ارتقار کے لیے ایک بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی تشریح بہت زیادہ دشوار ہے، کیونکہ یہ بیان بہت زیادہ مجمل اور اس کی زبان اصطلاحی ہے اور یہ قرین قیاس ہے کہ اختتامی عبارت میں تحریف ہوئی ہو۔ بلاکمین کا اس باب کا متن قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ اس کی ایک اہم عبارت کی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ یہ اس کے بہترین مخطوطے سے جسے اس نے حرف H سے نامزد کیا ہے اور جس کا اب برٹش میوزیم میں نمبر اورئنیٹل ۲۱۶۹ ہے معنوی اعتبار سے مختلف ہے اور اس کے مختلف نسخے جو واقعتہً پائے جاتے ہیں ان کی نشاندہی کرنے کے لیے حاشیے بھی نہیں ہیں۔ مجھے تحریروں میں اس باب کی مجموعی طور پر کوئی قابلِ اطمینان تشریح نہ مل سکی مختلف گمراہ کن نتائج کو سیاق سے جدا کیے ہوئے فقروں کی بنیاد پر اخذ کیا گیا ہے۔

میں اس وقت جو تشریح پیش کر رہا ہوں اس کے لیے حسب ذیل مخطوطات استعمال کیے گئے ہیں۔ بوڈلین لائبریری کے مخطوطات کی میرے لیے سر رچرڈ برن نے اور بقیہ کی میں نے خود جانچ کی ہے۔

برٹش میوزیم اورئنیٹل ۲۱۶۹، اڈیشنل ۵۶۰۹، ۵۶۴۵، ۶۵۴۶، ۶۵۵۲، ۶۵۲۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۱۶ (مورلے)۔

انڈیا آفس ۲۶۴-۶۸ اور ۲۷۰ (ایتھے)۔

کیمبرج یونیورسٹی لائبریری، این این، ۳، ۵۷، ۱۵۔

بوڈلین لائبریری ۲۱۴ - ۱۶ -

ان مخطوطات کا فی الجملہ تنقیدی مطالعہ نہیں کیا گیا ہے، لہذا ان کی اضافی قدر غیر یقینی ہے۔ تلمیخوں کی بنیاد پر، جہاں تک یہ معلوم ہیں، اورئینٹل ۲۱۶۹ سب سے زیادہ بہتر ہے لیکن جیسا کہ بلاکمین نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے "یہ کسی طور پر بھی نفیس نہیں ہے" اور زیر جائزہ باب میں چند بیّن غلطیاں موجود ہیں۔ لیکن پھر بھی زمانی اعتبار سے یہ فہرست میں مندرج کسی دوسرے مخطوطہ کے مقابلہ میں اصل سے بہت زیادہ قریب ہے۔ بجملہ دوسروں کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی نمبر ۱۱۶ استرہویں صدی کی درمیانی مدّت سے متعلق ہے اور یہ بات غالباً اڈیشنل ۶۵۵۲ کے لیے بھی درست ہے۔ بقیہ بظاہر ان کے بعد کے ہیں۔

اس باب کا متن پانچ پیراگرافوں پر تقسیم ہے، جنھیں میں نے بڑے حروف سے نامزد کیا ہے اور میں ان پر ترتیب وار بحث کرتا ہوں۔ کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ بالکل لفظی ہو، بجز اس کے کہ توصیفی کلمات حذف یا مختصر کر دیئے گئے ہیں۔ مبہم فقروں کو اصل میں لکھ کر تشریح میں ان پر بحث آئی ہے۔

الف

ترجمہ: عہد حکومت کے شروع سے[1] (یا، میں) ہر سال ماہرین (کاردانان شناسندگان: اصل متن) نرخوں کے رجحانات کا تعین کیا کرتے اور اسے شاہی دربار[2] (والا درگاہ: اصل متن) میں پیش کرتے۔

اور فصل کی پیداوار اور ان کی نرخوں (ربع جنس وارج: اصل متن) کے لحاظ سے نقدی شرحوں کا گوشوارہ (دستور: اصل متن) معین کرتے اور بڑے مصائب پیش آیا کرتے۔

یادداشتیں۔ (۱) مخطوطات میں حسب معمول کہیں حرف ربط 'از' اور کہیں 'در' استعمال کیا گیا ہے۔

(۲) الفاظ 'والا درگاہ' سے واضح ہوتا ہے کہ جنسی شرحوں کی نقد میں تبدیلی کے لیے بادشاہ کی منظوری ضروری تھی۔ یہ تفصیل قدرے اہم ہے، کیونکہ اس سے نقد میں تبدیلی کے بالآخر ناکام ہونے کے سبب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

تشریح۔ اس پیرا میں، اس کے قبل کے ایک باب [(۱)، ۲۹۰] میں مندرج اس

اطلاع کو دہرایا گیا ہے کہ پہلے اکبر نے شیر شاہ کی منظور کی ہوئی جنسی شرحوں (ربع) کو اختیار کیا جس میں ان شرحوں کی بنیاد پر جنسی مطالبہ کو مروجہ قیمتوں کے اعتبار سے نقدی شرحوں (دستور) میں تبدیل کیا گیا تھا۔

ب

ترجمہ :- جب خواجہ عبدالمجید آصف خاں وزیر تھا، تو جمع ولایت رقمی تھی اور "وہ لوگ جو چاہتے قلم سے تنخواہ[1] بڑھا کر دکھاتے تھے۔"[2]

یہ دیکھتے ہوئے کہ بادشاہت وسیع نہ تھی اور یہ کہ عہدہ داروں کی ترقی بار بار ہوتی، رشوت ستانی اور ذاتی مفاد میں زیادتی اور کمی ہوا کرتی،

یادداشتیں :- (۱) 'افزود تن' لغات میں نہیں ہے۔ میں 'تن' کو "تنخواہ" کے مستقل دفتری مفہوم میں لیتا ہوں۔ اس لفظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت جو کچھ بھی کیا جاتا اس کا مقصد بڑھتی ہوئی تنخواہ کی فہرست تھی۔

(۲) اس فعل کا کوئی فاعل نہیں ہے، جیسے روزمرہ کے فقرہ کے طور پر صیغہ غائب کا فعلِ مجہول تصوّر کرنا چاہیے۔ میں نے اس فقرہ کو الٹے کاما کے اندر لکھا ہے۔

تشریح :- عبدالمجید کی وزارت سنہ جلوس میں جب اس نے "قلم کو چھوڑ کر تلوار اختیار کی" [اکبر نامہ (۲)، ۱۸۲] ختم ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی اس عہدہ پر تقرری کی تاریخ کا پتہ نہیں چلایا ہے، لیکن ذیل میں قلم بند کی ہوئی ایک عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشارہ پانچویں یا اس کے قبل کے سال کے طرف ہے۔

جیسا کہ ضمیمہ الف میں گذر چکا ہے 'جمع' بذات خود ایک مبہم لفظ ہے اور اس کے معنی مطالبہ یا مالیت ہو سکتے ہیں۔ اوّل الذکر مفہوم کے اعتبار سے مذکورہ بالا عبارت کے صرف یہ معنی ہو سکتے تھے کہ اس وقت کسانوں پر مطالبہ بڑھتی ہوئی تنخواہ کی رقم کو پورا کرنے کی غرض سے من مانی طور پر مقرر کیا جاتا اور یہ کہ بدعنوانیاں بیچ میں حائل ہوا کرتیں۔ لفظ رقمی کے جو بذات خود " لکھے ہوئے" کے علاوہ کوئی اور مفہوم نہیں رکھتا، اس تعبیر کی رو سے محض قلم سے کی گئی ایک تشخیص کی نشاندہی کرنے والے ماخوذ معنی ہوں گی، یعنی ایک ایسی تشخیص جو پیداوار پر مبنی نہیں، بلکہ ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے قائم کی گئی ہو۔

اس تشریح پر حسب ذیل اعتراضات عائد ہوتے ہیں:

(۱) فقرہ 'جمع ولایت' کی قسم ایسی ہے جو دوسری عبارتوں میں مطالبہ کو نہیں بلکہ مالیت کی نشاندہی کرتی ہے۔

(۲) اس وقت تنخواہیں معمولاً جاگیروں کے ذریعہ ادا کی جاتی تھیں۔ لہذا تبدیلی کے ذریعہ جس ہنگامی صورتِ حال کی نشاندہی کی گئی ہے، اس سے نپٹا نہ جا سکتا تھا: من مانی بڑھائی ہوئی تشخیص کے ذریعہ خالصہ کی زمینوں سے خزانہ میں زیادہ روپیہ آ سکتا ہے، لیکن عام طور پر خزانہ سے تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں (۳) یہ من مانی تشخیصیں پیرا الف میں بیان کیے ہوئے طریقوں کو بے دخل کر دیتی تھیں اور تفصیلی تشخیصی شرحیں غیر ضروری ہو جاتی تھیں: لہذا ہمیں چھٹے سال اور اس کے بعد کی تشخیصی شرحوں کو جو آئین نوزدہ سالہ میں مرتب کی گئی ہیں، واقعی تشخیصوں سے غیر متعلق تصور کرنا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں، ایک ساتھ دو قسم کے عمل جاری تھے، یعنی ایسی تشخیصی شرحوں کا ہر فصل پر حساب لگانا جو استعمال کیے جانے کے مقصد سے نہ تھیں اور اس کے ساتھ ہی بلا شرحوں کا لحاظ کیے ہوئے من مانی طور پر مطالبہ کا تعین کیا جانا تھا (۴) یکمشت مقرر کی گئی تشخیصوں کا خیال اس عہد کے لیے صحیح نہیں ہے: اس زمانہ کے تمام مباحث ایسی شرحوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو رقبۂ پیداوار سے غیر متعلق رقموں پر نہیں بلکہ تبدیل ہوتے ہوئے رقبۂ فصل پر مبنی تھیں (۵) ہمیں اکبر نامہ [(۲)، ۳۳۳] سے اطلاع ملتی ہے کہ پیرا 'الف' میں بیان کیا ہوا طریقہ یعنی ناپے ہوئے رقبہ پر عائد کی ہوئی شرحوں کے مطابق تشخیص، بارہویں برس میں خالصہ کی زمینوں پر رائج تھا، کیونکہ تیرہویں برس میں اس کی موقوفی تحریروں میں درج ہے۔ پس، ہمیں یہ نتیجہ نکالنا ہوگا کہ پیمائش کی دو مدتوں کے درمیان، من مانی تشخیصوں کا یہ زمانہ پیش آیا، گو کہ پیمائش کے دوبارہ جاری ہونے کا کہیں ذکر نہیں آیا ہے۔

اگر جمع ولایت کے معنی مالیت لیے جائیں تو یہ تمام دقتیں رفع ہو جاتی ہیں۔ اس تعبیر کی بنیاد پر لفظ رقمی کے معنی یا تو جیسا کہ اوپر تجویز کیا گیا ہے "من مانی" ہو سکتے ہیں یا جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں زیادہ امکانی صورت یہ ہے کہ یہ زیرِ بحث تحریر کا دفتری نام ہو جسے کسی دوسری مالیت سے ممیز کرنے کے لیے جس کو اس نے بے دخل کیا تھا استعمال کیا جاتا ہو۔ آخر الذکر صورت میں اس کے معنی صرف "لکھے ہوئے" ہوئے یا جیسا کہ مسٹر بیوریج

نے اکبر نامہ کی اس عبارت پر جس پر ذیل میں بحث آئی ہے اپنی یادداشت میں تجویز کیا ہے، یہ اس بات کو ظاہر کر سکتی ہے کہ یہ تحریر رقمی رسم الخط میں تھی۔ بہرحال اس کی اصل جو بھی رہی ہو، یہ حقیقتاً ایک نام تھا۔

اس تعبیر کے تحت، پہلے جملے سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ تشخیص تو پیرا 'الف' میں مندرج خطوط پر چلتی رہی، لیکن زیرِ استعمال مالیت جیسا بھی قیاس کیا جائے اس کے مطابق "من مانی" یا "رقمی" تھی اور ہمیں مزید یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس کے اعداد کو اس وقت کی ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے تبدیل کیا گیا تھا جس کے نتیجہ میں بدعنوانیاں پیش آئیں۔ تنخواہوں کا خرچ بار بار ترقیوں کے باعث بہت بڑھ گیا اور مملکت اس بار کو برداشت کرنے کے لیے بہت چھوٹی تھی۔ لہٰذا وزارت مال نے واقعات سے بے نیاز ہو کر مالیت کو بڑھا کر مرتب کیا۔ اس طور پر عہدہ داروں کو اس قدر جاگیریں مل جاتیں جو کاغذی اعتبار سے تو ان کے استحقاق کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوتیں، لیکن ان سے واقعتاً اس قدر آمدنی حاصل نہ ہوتی جن کا ان پر بار ہوتا۔ اس طریق کار کے ہوتے ہوئے، بدعنوانیوں کا پیش آنا بیّن طور پر لازم تھا۔

چنانچہ اگر صرف اسی پیرا کی عبارت پیش نظر ہو تو "مطالبہ" کے مقابلہ میں "مالیت" بہت زیادہ قرینِ قیاس تعبیر ہوگی۔ دو متماثل عبارتیں اس خیال کی تائید کرتی ہیں۔

(الف) اکبر نامہ [(۲)، ۲۷۰] کی اطلاع کے مطابق گیارہویں برس اکبر "جمع پرگنات کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے احکام کی تعمیل میں مظفر خاں نے جمعِ رقمی قلمی کو جو بیرم خاں کے زمانہ میں، لوگوں کی تعداد اور ملک کے چھوٹے ہونے کے باعث، محض دکھاوے کے طور پر برائے نام بڑھائی گئی تھی ختم کر دیا اور یہ کہ سرکاری کاغذات میں [اس اضافہ] کا اندراج برابر قائم رہا اور بدعنوانی کا ذریعہ ثابت ہوا۔"

اس عبارت میں قلمی کا مفہوم مشتبہ ہے۔ میرے دوست مسٹر پیجٹ ڈیو ہرسٹ نے مجھ سے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ محض لفظ 'رقمی' کی تکرار ہے اور ان دونوں الفاظ کے مل کر معنی " لکھے ہوئے" ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ فقرہ " اہل قلم" سے متعلق ہو سکتا ہے جسے سرکاری دفاتر کے محرروں (کارکنان) کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس طور پر یہ "رقمی جمع کے سرکاری نام" کے لکھنے کے لیے ایک طرح کے جواز کا درجہ رکھتا ہے۔ بیرم خاں کا " زمانہ" ۵ سنہ جلوس پر ختم ہوا۔ اس طور پر ہم اس کارروائی کی مدت کو اس کی بادشاہ کی قائم مقامی

کے زمانہ کے اندر اور عبدالمجید کی وزارت میں پانچویں برس تک رکھ سکتے ہیں۔

میرے لیے یہ سمجھنا بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبارت کسی ایسے نظام تشخیص کے متعلق ہے جو پیرا 'الف' میں بیان کیے ہوئے نظام کی ناکامی کے بعد جاری کیا گیا۔ اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے بعض اعداد کو دکھاوے کے طور پر برائے نام بڑھادیا گیا تھا۔ یہ بیان جمع کیے جانے والے مطالبہ سے متعلق نہیں ہوسکتا۔ مثل آئین کے، اس کی بھی یہی اطلاع ہے کہ ایک چھوٹی مملکت میں تنخواہ پر زیادہ اخراجات کا اصل مسئلہ تھا۔ اور اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں برس یا اس کے قبل کیے گئے برائے نام اضافے گیارہویں برس تک کاغذات میں موجود رہے اور بدعنوانیوں کی غرض سے استعمال کیے گئے۔ یہاں واضح طور پر مطالبہ کی کسی سالانہ تشخیص کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم پہلے فقرہ کو اس طور پر سمجھیں، جیسا کہ میں نے اسے سمجھا ہے اور مالیت کو احکام کا فاعل تصور کریں تو معنی واضح ہوجاتے ہیں۔ ابتدائی برسوں میں، تنخواہ کا خرچ موجود وسائل سے زائد تھا اور زیر استعمال مالیت دکھاوے کے لیے بڑھاکر مرتب کی گئی تھی، تاکہ عہدہ داران کو اس قدر جاگیریں مل جائیں جن کی واقعی نہیں بلکہ کاغذی مالیت ان کی منظور شدہ آمدنی کے مساوی ہو اور یہ غلط اندراجات مالیت میں اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ اکبر نے ایک نئی مالیت کا حکم نہ دیا۔

(ب) اسی کارروائی کا ایک دوسرا تذکرہ اقبالنامہ (ص ۲۱۳) میں آیا ہے۔ اس میں واضح طور پر اکبر نامہ کی عبارت کا مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ لیکن مختلف الفاظ کے استعمال سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ بعد کے مصنف نے اپنے پیشرو کی عبارت کو کیوں کر سمجھا ہے۔

" عہد حکومت کے شروع میں، بیرم خاں کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں، مال کے عملہ نے مملکت (ممالک محروسہ) کی جمع کو سرسری حساب اور تخمینہ پر مقرر کرکے (اور) فوج کی زیادہ تعداد اور مملکت کی تنگی کے باعث 'برف کا ایک ستون تیار کرکے' بہ طور تنخواہ کے لوگوں کو پیش کیا۔"

فقرہ "برف کا ستون" تقریباً خود ہی اپنی وضاحت کرتا ہے، لیکن خوانی خاں کی بیان کی ہوئی ایک حکایت (۱، ۳۵) سے اس کی تشریح کی جاسکتی ہے۔ محاسبین نے ایک موقع پر کسی محصل کے خلاف وصولی مطالبہ کی ایک لمبی اور خیالی فہرست تیار کی تھی؛ اسے دیکھ کر وزیر نے کہا کہ " اس برف کے ستون کو سورج کی روشنی دکھاؤ اور گرم

موسم کے بعد اس میں سے جو کچھ بچ رہے اسے وصول کرو۔" اس طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ "ملکت کی ایک جمع" کو جو اس قدر بڑھا کر دکھائی گئی تھی کہ اسے ایسے حقارت آمیز فقرہ سے بیان کیا جا سکتا تھا، تنخواہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ کسی مطالبہ کو جس کا مقصد وصول کیا جاتا ہو، ایسے الفاظ میں بیان کیا جانا ممکن نہ تھا اور تینوں عبارتوں سے مجموعی طور پر ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ جمع ولایت یا پرگنات یا ممالک محروسہ اس مالیت کو ظاہر کرتی ہے جس کی بنیاد پر جاگیروں کی تقسیم ہوتی تھی۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پیرا 'الف' اور 'ب' کو ایک ہی زمانے سے منسوب کیا جانا چاہیے۔ یہ ہمیں ترتیب وار دو تشخیصی نظام سے نہیں، بلکہ اکبر کے مالی نظم و نسق کے پہلے مرحلے سے متعارف کرتے ہیں۔ اس کی دو خاص شقیں تھیں، مطالبہ کی تشخیص اور جاگیروں کی تقسیم۔ ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ پہلی کیوں کر ناکام ہوئی اور دوسری کیوں کر نقلی اعداد سے متاثر ہوئی۔ لہٰذا، ان دونوں شقوں میں اصلاح کی اشد ضرورت تھی اور اگلے پیرا میں یہ دکھایا گیا ہے کہ دوسرے مرحلہ میں کیا کیا گیا۔

ج

ترجمہ :- اور جب یہ اونچا عہدہ (یعنی وزارت) مظفر خاں اور راجہ ٹوڈرمل کو پہنچا، "انھوں" نے ۱۵ سنہ الٰہی میں قانون گوؤں سے تعینات 'ملک' کا کام لے لیا (اور) تخمینہ و حساب (قیاس و تخمین: اصل متن) کے ذریعہ حصول مکمل کرنے کے بعد ایک نئی (تازہ: اصل متن) جمع جاری ہوئی، دس قانون گو مقرر کیے گئے، جنھوں نے مقامی قانون گوؤں (قانون گویانِ جزو: اصل متن) سے شرح نامے (نسخہ: اصل متن) حاصل کر کے اسے محافظ خانہ (دفتر خانہ: اصل متن) میں داخل کرنا جاری رکھا۔

گو کہ یہ (یعنی نئی جمع) اوّل الذکر سے تھوڑی بہت کم کی گئی پھر بھی اس (یعنی اوّل الذکر) سے حاصل کا فاصلہ بہت زیادہ تھا۔

تشریح :- ان فقروں میں ترتیب وار (الف) کی گئی کارروائی (ب) کام کا طریقہ اور (ج) نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ کارروائی تین مرحلوں میں کی گئی: تعلیمات ملک،

'محصول' اور 'جمع' پہلی اصطلاح کی کوئی نظیر نہیں اور دوسری و تیسری مبہم ہیں' لہذا مفہوم کے تعین کے لیے مماثل عبارتوں کا جائزہ ضروری ہوگا۔

پہلے گذر چکا ہے کہ اکبر نامہ کی اطلاع کے مطابق، گیارہویں برس مظفر خاں نے ابتدائی مالیت کو جسے رقمی کہا گیا ہے، ہٹا دیا تھا۔ آگے عبارت کا سلسلہ یوں چلتا ہے "پوری سلطنت کے قانون گوؤں اور ماہروں نے اپنے اپنے خیالات کے مطابق ملک کی واقعی حاصل (حال حاصل) کو لکھنے کے بعد ایک دوسری جمع مقرر کی۔ حالانکہ واقعاتی اعتبار سے یہ (نئی جمع) کوئی صحیح حاصل نہ تھی، لیکن سابقہ جمع کے مقابلہ میں اسے ایک صحیح حاصل کہنا (حقیقت سے) زیادہ بعید نہ ہوگا۔"

یہ تصور کرتے ہوئے کہ اکبر نامہ کی اس عبارت کا موضوع تشخیص نہیں بلکہ مالیت ہے، اس عبارت کا مفہوم خود ہی واضح ہو جاتا ہے۔ ماہرین نے صحیح حاصل متعین کی اور بعینہ اس کی بنیاد پر نہیں' بلکہ اس کے قریب رکھتے ہوئے' ایک نئی مالیت مقرر کی۔

جیسا کہ ضمیمہ الف میں وضاحت آچکی ہے 'حاصل' کے سب سے زیادہ عام معنی جاگیردار کی حاصل کی ہوئی آمدنی ہے جو اس کی جاگیر کی مالیت سے مختلف ہوا کرتی۔ لیکن یہ لفظ محصول (بہ معنی مطالبہ) کے محض ایک مرادف کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور ہم اسے آئین کے طرز بیان سے ایک مشتبہ بدل کے طور پر یہاں اس معنی میں لے سکتے ہیں۔ اس طور پر یہ عبارت پیرا 'ج' میں جمع اور 'محصول' کے مفہوم کو تو متعین کرتی ہے، لیکن تقسیمات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔

اقبالنامہ کی متوازی عبارت میں' جس کا ایک جز پہلے قلم بند کیا گیا ہے' آگے چل کر کہا گیا ہے کہ اکبر نے مظفر خاں کو حکم دیا کہ "قانون گوؤں اور پرگنوں کے چودھریوں کو دربار میں طلب کیا جائے اور واقعات کے اعتبار سے ایک صحیح حاصل (حال حاصل) کے تعین کے بعد' ملک کی جمع' ذہانت' انصاف اور صحت کے ساتھ مقرر کی جائے۔" یہ عبارت اکبر نامہ سے بہت زیادہ مطابقت رکھتی ہے جس پر یہ واضح طور پر مبنی ہے۔

اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ 'تقسیمات ملک' کو کیا معنی دیئے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی مجھے تحریروں میں کوئی مثل نہ مل سکی۔ اس کے مادہ 'قسم' سے پیداوار کے تقسیم کیے جانے کے تخیل کی نشاندہی ہوتی ہے' جیسا کہ 'قسمت غلہ' یا 'خراج مقاسمہ' کے فقروں سے۔ میرے خیال میں واحد معقول تعبیر یہ ہے کہ 'تقسیمات ملک' ان شرح ناموں کا

ایک دفتری نام تھا، جو ایک بعد کے فقرہ کی اطلاع کے مطابق مقامی قانون گوؤں سے حاصل کرکے محافظ خانہ میں داخل کیے گئے تھے: ہر شرح نامہ کا عنوان " فلاں پرگنہ کی تقسیم " ہوا کرتا اور پوری مسل کو " مملکت کی تقسیمات " کہتے۔ اس تعبیر سے اسم ماخوذ کے ناموزوں صیغۂ جمع کی وضاحت ہو جاتی ہے اور بالکل ٹھیک مفہوم بھی نکل آتا ہے۔ اس تعبیر سے اس اصطلاح کے انوکھے پن کی بھی تشریح ہو جاتی ہے۔ ایسا کوئی اور موقع میرے علم میں نہیں، جہاں اس طریق کار پر عمل کیا گیا ہو اور نہ ہی اس مخصوص شرح ناموں کا جو چند برسوں بعد متروک ہو گئے کوئی دوسرا حوالہ ملتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آئین کے اس سے پہلے کے پیراگرافوں میں مالی نظم ونسق کی دونوں شاخوں میں اصطلاح کی ضرورت کو بیان کرنے کے بعد یہاں ان کی اصلاحات کو ایک جملہ میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم اس عمل کو اس وجہ سے جائز تصور کرتے ہیں کہ یہ دونوں شاخیں گو علیحدہ علیحدہ تھیں، مگر ان کے درمیان ایک گہرا تعلق پایا جاتا تھا۔ کارروائی کے مرحلے اس طور پر تھے :-

(۱) قانون گوؤں نے شیرشاہ کے شرح نامے کے خطوط پر، پیداوار کی تقسیمات پر مشتمل نئے شرح نامے تیار کیے۔ مگر یہ پوری مملکت کے لیے بجائے ایک ہونے کے ہر پرگنہ کے لیے علیحدہ علیحدہ تھے۔ تنہا ان شرح ناموں سے تشخیص کی ضروری اصلاح تو ہو جاتی تھی، لیکن ان سے ایک نئی مالیت کے لیے جملہ مواد فراہم نہ ہوتا۔

(۲) ان شرح ناموں سے مملکت کے مطالبہ (محصول) یا واقعی حاصل (حال حاصل) کا حساب یا تخمینہ لگایا گیا۔ یہ آسانی کے ساتھ نئے شرح نامہ میں مندرج شرحوں کو واقعی یا تخمینی رقبۂ فصل پر عائد کرکے کیا جاسکتا تھا۔ خالصہ کی زمینوں کے لیے صحیح رقبوں کے اندراجات تو موجود تھے، مگر جاگیروں کے لیے، اگر رقبہ کے اندراجات اطمینان بخش نہ تصور کیے جاتے یا اگر یہ قابلِ حصول نہ ہوتے تو ان کا تخمینہ لگانا ضروری ہوتا۔

(۳) ان حسابات کی بنیاد پر، ایک نئی مالیت مرتب کی گئی جو ہماری اطلاع کے مطابق حساب لگائے ہوئے مطالبہ کے مثل نہیں بلکہ اس کے قریب قریب تھی۔ اس طور پر یہ پچھلی مالیت سے جو حقیقت سے بالکل غیر متعلق ہو چکی تھی بہت زیادہ بہتر تھی۔

اس طور پر دوہری اصلاح ہوئی جس کے تحت تشخیصی شرحوں کے نئے شرح نامے اور نیز ایک نئی مالیت فراہم ہوئی اور انھیں دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ آئین میں ان دونوں کا

ذکر آیا ہے۔ اکبرنامہ میں محض مالیت کا ذکر آتا ہے۔ اس میں تشخیصی شرحوں کے بارہ میں کوئی بیان نہیں ملتا۔

آئین اکبری میں یہ شرح نامے نہ تو بیان کیے گئے ہیں اور نہ ہی اس کے متن میں شامل ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت کو اخذ کرنا ممکن ہے۔ ہمیں آئین کے ایک دوسرے باب سے [۲۹۷، (۱)] یہ اطلاع ملتی ہے کہ اوسط پیداوار کے ایک تہائی کا بنیادی اصول جس سے ابتدائی مطالبہ کی شرحیں نکلتی تھیں سنہ ۲۴ جلوس تک قائم رہا۔ اور ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں گے کہ تقسیمات ان کے مطابق تھیں۔ ہمیں یہ مزید اطلاع ملتی ہے کہ تقسیمات، ابتدائی شرحوں کے مثل مطالبہ کو بمقدار پیداوار دکھاتی تھیں، کیونکہ جیسا کہ اگلے پیرا کے متن سے ظاہر ہوتا ہے نقدی متبدل کی اب بھی ضرورت باقی تھی۔ اس بات سے کہ اس کام کو قانون گو جو مقامی زرعی معلومات کے مخزن تھے کیا کرتے، یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ شرح نامے مقامی تھے۔ ہر پرگنہ کے لیے ایک علیحدہ شرح نامہ مرتب کر کے اسے ویسا ہی محافظ خانہ میں جمع کر دیا جاتا تھا: اس کا محض یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ تشخیص اب مملکت کی اوسط پیداواری پر نہیں بلکہ مقامی پیداواری پر مبنی ہو گئی تھیں۔ آئین نوزدہ سالہ میں مندرج واقعی عائد کی گئی شرحوں کے تجزیہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ پندرہویں برس تشخیص عام طور پر تبدیل ہوئی۔ اب شرح ناموں میں نئی فصلیں شامل ہوتی ہیں، صوبوں کے درمیان فرق زیادہ ہو جاتا ہے اور ہر صوبہ کے اندر زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم شرحوں کے درمیان تفاوت بڑھ جاتا ہے۔ ایک عام شرح نامہ کی جگہ مقامی شرح ناموں کے آجانے پر ایسا ہونا لازم تھا، کیونکہ اب بجائے ایک کے صوبہ کے اندر دو تبدیل ہونے والے شرح نامے اور محض قیمتوں کے بجائے شرحیں اور قیمتیں ملنے لگتی ہیں۔

مجھے امور مذکورہ بالا، مجموعی طور پر 'تقسیمات ملک' کی نوعیت کو متعین کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے آئین میں شامل نہ کیے جانے کا سبب ان کی جسامت ہو سکتا ہے۔ ابتدائی شرح نامہ جو ایک تاریخی دستاویز کے طور پر دیا گیا ہے، بلاکمین کے متن کے تقریباً تین صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس باب کا تعلق جس علاقہ سے ہے یعنی ملتان سے الہ آباد تک اس میں تین ہزار سے زائد پرگنے تھے۔ اس طور پر ہر پرگنہ کے لیے ایک ہی طریقہ پر مرتب کی ہوئی 'تقسیمات' کو درج کرنے کے لیے تقریباً تین ہزار صفحات کی ضرورت ہوتی۔

اب سال کے متعلق ایک کھلا ہوا اختلاف رہ جاتا ہے۔ آئین پندرہویں برس کا ذکر کرتی ہے، اکبرنامہ اور اقبال نامہ میں اس کی متوازی عبارت گیارہویں برس کے تحت دکھائی گئی ہیں۔ مسٹر بیورج نے اکبرنامہ کے اپنے ترجمہ کی ایک یادداشت میں تجویز کیا تھا کہ ان دونوں الفاظ کے درمیان جو رسم الخط میں تقریباً یکساں لکھے جاتے ہیں، کہیں غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ واقعی میں فرق صرف حروف 'پ' اور 'ی' کے درمیان کا ہے جو تین کے بجائے دو لفظوں کا معاملہ ہے۔ لیکن اس تجویز سے کچھ دقتیں سامنے آتی ہیں۔ جہاں تک اکبرنامہ کا تعلق ہے، کسی نقل کرنے والے کی غلطی کا سوال نہیں پیدا ہوتا کیونکہ اس تصنیف میں تاریخی ترتیب کی پوری پابندی کی گئی ہے اور اس صورت میں ہمیں یہ فرض کرنا ہوگا کہ ابوالفضل نے جس کی تاریخی ترتیب عام طور پر صحیح ہے، اس واقعہ کو چار برس قبل کا لکھ دیا۔ یہ غلطی قابلِ قبول تو ہو سکتی ہے، لیکن اس کا سرزد ہونا بیّن طور نا ممکن ہے۔ آئین کے متن میں پندرہ کو گیارہ سے تبدیل کرنا آسان ہوگا، لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا۔ منجملہ بارہ قلمی نسخوں کی جن کی میں نے خود جانچ کی ہے، دس میں پہلا حرف 'پ' واضح طور پر درج ہے اور بقیہ دو' بمقابلہ 'ی' کے 'پ' کے زیادہ قریب ہیں۔ نقل کرنے والے اس خطرہ سے بخوبی واقف رہے ہوں گے اور 'پ' کو صاف کرنے کی واضح کوششوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے[1]

اس کے علاوہ شرحوں کا جدول جو پندرہویں برس تشخیص میں ایک عام تبدیلی کو ظاہر کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ دسویں اور بارہویں برس کے درمیان کسی تبدیلی کی غیر موجودگی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ پھر اکبرنامہ [(۲)، ۳۳۳] کی اطلاع کے مطابق خالصہ کی زمینوں کا بذریعہ پیمائش، تشخیص کیا جانا تیرہویں برس ترک کر کے، اس کی جگہ اجتماعی تشخیص لائی گئی تھی۔ یہ بات بہت بعید از قیاس ہے کہ گیارہویں برس نظر ثانی کی ہوئی منظور شدہ شرحوں کو تیرہویں برس مسترد کر دیا گیا ہو، لیکن یہ بہت زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ جو شرحیں مکمل طور پر ہو گئی ہوں انھیں نظرانداز کر کے، نئی شرحوں کے منظور کیے جانے تک عارضی انتظامات کیے گئے ہوں۔

میری تعبیر اس طور پر ہے کہ اکبر اس مسئلہ کی طرف گیارہویں برس متوجہ ہوا، جیسا کہ اکبرنامہ اور اس کے بعد اقبال نامہ میں درج ہے اور اس نے ایک نئی مالیت کی

تیاری کا حکم دیا۔ اور یہ کہ ضروری تحقیقات اور حساب لگانے پر تین برس صرف ہوئے اور یہ کہ جیسا کہ آئین میں درج ہے، نئی مالیت کا اجرار پندرہویں برس ہوا جب کہ نئی تشخیصی شرحوں پر بھی عمل درآمد ہوا۔ ان امور کے پیش نظر کہ ایک ہزار سے زائد قانون گوؤں کا اس کام سے تعلق تھا اور ان کی نگرانی کرنے والوں کی تعداد محض دس یعنی ایک سو یا اس سے زائد پر ایک آدمی کی تھی اور یہ کہ نواحی پرگنوں کے شرح ناموں کے لیے موازنہ اور مطابقت کی بھی ضرورت تھی، جس کے نتیجہ میں ایک شخص کی بیماری یا سستی سے بہت سے پرگنوں کے کام میں تاخیر ہو جایا کرتی تھی، ہم مذکورہ مدت کو بہت زیادہ تصور نہیں کر سکتے۔ اس عمل کا تدریجی ہونا زمانہ ماضی استمراری کے استعمال سے واضح ہوتا ہے اور امکانات یہ ہیں کہ یہ عمل ایک طویل مدت تک جاری رہا ہو۔

پیرا 'ج' کی میری تعبیر میں دوسری متعلقہ عبارتوں کو شامل کرنے پر جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ اس طور پر ہے کہ 'الف' اور 'ب' میں مندرج خرابیوں کو محسوس کر کے گیارہویں برس اصلاح کا حکم دیا گیا اور یہ کہ اصلاحات کرنے میں وقت صرف ہوا اور ان کے مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر، خالصہ کی زمینوں کے طریقۂ تشخیص کو تیرہویں برس عارضی طور پر تبدیل کر دیا گیا، لیکن یہ کہ پندرہویں برس نئے تشخیصی شرح نامے اور ایک نئی لیت کا اجرار ہوا۔ بہر حال، ہمارے مآخذ بمقابلہ شرح ناموں کے نئی مالیت میں زیادہ چسپی رکھتے تھے۔ وہ نئے شرح ناموں کے جاری کیے جانے کے متعلق واضح طور پر نہیں ناتے، لیکن آئین انھیں 'تقسیمات ملک' کے غیر واضح فقرہ سے بیان کرتا ہے اور اس کے قبل کے باب میں مندرج اعداد سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حقیقتاً جاری کیے گئے۔

اس مقام پر آئین میں ایک اہم فروگذاشت یہ ہے کہ اس دوسری مالیت کے انجام کے متعلق اس میں کچھ نہیں ملتا۔ ہم اس خلار کو اکبر نامہ [۳، ۱۱۷] کے اس بیان سے پورا کر سکتے ہیں کہ انیسویں برس کے قبل مرکزی عملہ مالیت کو من مانی طور پر بڑھا دیا کرتا اور گھٹانے اور بڑھانے کے سلسلہ میں ناجائز رقمیں طلب کرتا جس سے بادشاہ کے عہدہ داران غیر مطمئن اور ناشکر گذار ہو رہے تھے۔ اس خرابی کو رفع کرنے کے خیال سے، اکبر نے اپنے عہدہ داروں کی بیشتر نقدی تنخواہیں مقرر کیں اور مملکت کے بیشتر حصّہ کو براہ راست شاہی انتظام کے تحت کر دیا (اس طور پر فی الحال مالیت کی ضرورت رفع ہو گئی)۔ اس

اہم تبدیلی کے سلسلہ میں آئین کے سکوت کی وجہ پر قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ ہم اسے عبارت کا نقص تصور کر سکتے ہیں یا یہ ایک محکمہ جاتی خود بینی خیال کی جاسکتی ہے، کیونکہ کسی مالیت کے جرار کے چند برسوں کے اندر اندر جعلسازی کی بنا پر اس کا مسترد کر دیا جانا، وزارت کے لیے واضح طور پر بدنامی کا باعث تھا۔ لیکن ہم بس اس قدر جانتے ہیں کہ یہ بیان نامکمل ہے اور یہ کہ یہاں اور بعد کے برسوں میں بھی، اکبر نامہ میں ایسے واقعات درج ہیں جنھیں آئین میں ہونا چاہیے تھا۔

اگلے فقرہ 'د' میں نقدی تبدل کے ناکام ہونے کا بیان آتا ہے۔

د

ترجمہ:- اور جب بادشاہ کی فراست سے مملکت کی بہت توسیع ہوئی، ہر برس، قیمتوں کے تعین میں بڑے مصائب پیش آیا کرتے، اور دیر ہونے سے مختلف دقتیں واقع ہوا کرتیں،
بعض اوقات کسانوں کو بہت زیادہ مطالبہ کی شکایت کرنا [؟] پڑتی اور بعض اوقات جاگیر داراں کو بقایوں پر رونا آتا تھا۔
اعلیٰ حضرت نے ایک علاج تجویز کیا اور جمع دوسالہ قائم کی (جس سے عمومی تشفی حاصل ہوئی)۔

تعبیر:- پریشانی کی صورت واضح ہے۔ مملکت کی توسیع کے ساتھ نقدی تبدل کی قیمتوں کے تعین میں تاخیر نے شدت اختیار کی اور بڑی پریشانیاں پیش آئیں۔ ظاہر ہے کہ اگر واقعی وصولیاں کرنا مقصود ہو تو انھیں وقت کے ساتھ شروع کر دینی چاہیے اور قیمتوں کا شاہی منظوری پر موقوف ہونے کی صورت میں، جیسا کہ واقعی صورت حال تھی۔ مقامی افسران کو بعض اوقات منظوری کے قبل ہی وصولیاں شروع کرنی ہوتی تھیں۔ احکام کے موصول ہونے پر، اگر منظور شدہ شرحیں اختیار کی ہوئی شرحوں سے مختلف ہوتیں تو دقتیں پیش آتیں۔ مجھے 'افروز' خواہی' کے صحیح مفہوم کے متعلق اطمینان نہیں ہے۔ اگر میرے ترجمہ کے مطابق اس کا مفہوم "زائد مطالبہ" ہے تو دقت یہ ہوتی ہے کہ کسانوں کی ادائیگی بہت زیادہ ہوجاتی اور اگر اس کے معنی "مطالبہ مزید" تھا تو ایسی صورت میں ان کی ادائیگیوں

یں بڑی کمی آتی۔ لیکن ہر دو صورت میں کسانوں اور نیز جاگیرداروں کی پریشانیاں واضح ہیں۔
اس طور پر جو پریشانی کی صورت پیش آئی وہ واضح اور اس کا حل غیر واضح رہا۔ آئین کے اس باب میں 'جمع' کے معنی ابھی تک مالیت کے تھے، لیکن کسی نئی مالیت سے مذکورہ بالا خرابی کا ازالہ نہ ہو سکتا تھا۔ یہاں اس لفظ کے معنی اس کا دوسرا اصطلاحی مفہوم یعنی مطالبہ ہونے کی صورت میں، ہمیں یہ تصور کرنا ہوگا کہ اکبر نے، مثلاً ان دنوں کے نقدی مطالبوں کو یکمشت رقموں میں مقرر کیا۔ لیکن دوسری اہم عبارتوں خصوصاً اکبر نامہ [۳، ۲۸۱] اور آئین عمل گذار' سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس طور پر مطالبات مقرر نہ کیے گئے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ جنسی شرحوں کی جگہ عائد کیے جانے والے دستور یا نقدی مطالبہ کے شرح نامے جاری کیے گئے۔ اس طور پر نقدی تبدّل کی ضرورت رفع ہو گئی۔ میرے علم میں کوئی ایسی عبارت نہیں ہے جہاں 'جمع' کے معنی شرح نامے یا اس قسم کی کسی اور چیز کا ہونا ممکن ہو۔ اس کے دونوں صطلاحی مفہوموں میں 'جمع' کا بنیادی تصور واضح طور پر موجود ہے۔
اکبر نامہ میں اس کی متوازی عبارت [۳، ۲۸۲] بھی اہم ہے۔ اسی میں چوبیسویں برس کے واقعات میں سے ایک "جمع دہ سالہ کا مقرر کیا جانا" درج ہے۔ اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ مقامی قیمتوں کی اطلاع نقدی تبدّل میں استعمال کیے جانے کی غرض سے پابندی کے ساتھ بھیجی جاتی تھیں اور جب مملکت میں توسیع ہوئی تو اس اطلاع کے دیر میں پہنچنے سے بے اطمینانی پیدا ہوئی اور ساتھ ساتھ بعض اطلاع بھیجنے والوں پر راست بازی سے منحرف ہونے کا "شبہ تھا۔ اس طور پر پریشانی بدستور قائم رہی: یہ بھی کہا گیا ہے کہ سرکاری عملہ بے بس تھا، لیکن یہ کہ خود اکبر، نے اس مسئلہ کو حل کیا۔
پس ان دونوں تحریروں میں جن کے علاوہ مجھے اور کوئی تذکرہ نہ مل سکا 'جمع' دہ سالہ کو نقدی تبدّل کے ایک بدل کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور چونکہ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ اس کا واقعی بدل کیا تھا، لہذا ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ اس معلوم بدل کو سرکاری طور پر اس نام سے بیان کیا جا سکتا تھا۔ یہ نام کیوں کر استعمال میں آ سکتا تھا، یہ ایک ایسا سوال ہے جسے جب تک بقیہ پیراگرافوں پر بحث مکمل نہ ہو جائے، ملتوی رہنا چاہیے۔

ذ

ترجمہ:۔ پندرہویں سے چوبیسویں برس تک "انھوں" نے محصول دہ سالہ کو جوڑ کر اس کے

$\frac{1}{10}$ حصہ کو ہر سال' تصور کیا'

لیکن "انھوں" نے بیس سے چو بیسویں برس تک کی مدت کو متعین تصور کیا اور اس کے پانچ پہلے کو راست باز لوگوں کے بیانات سے اخذ کیا۔

اور [اعداد موسومہ] 'مال جنس کامل' کا لحاظ رکھتے ہوئے، "انھوں" نے سب سے بڑے برس کو لے لیا، جیسا کہ جدول سے ظاہر ہوتا ہے۔

تعبیر:۔ اس سیاق میں محصول کے معنی، واضح طور پر "پیداوار" کے نہیں ہو سکتے اور ہمیں یہ مطالبہ تصور کرنا چاہیے۔ پہلے دو فقرے صاف ہیں۔ دس برسوں کے مطالبہ کا اوسط نکالا گیا۔ آخری پانچ برسوں کے واقعی اعداد موجود تھے، کیونکہ ہمارے علم میں آچکا ہے کہ بیشتر صوبے انیسویں برس جاری کیے گئے احکام کے تحت براہِ راست شاہی انتظام میں لائے جا چکے تھے۔ اس کے قبل کے برسوں کے لیے مطالبہ کے مکمل اعداد نہ تھے۔ کیونکہ اس وقت بیشتر علاقہ جاگیر میں دبا ہوا تھا، لہذا جو بھی اعداد موجود تھے انھیں غالباً قانون گوؤں اور جاگیرداروں کے رکھے ہوئے سربراہ کاروں سے حاصل کرنا ضروری تھا۔ لہذا، آئین میں واضح طور پر شرح مطالبہ کا نہیں بلکہ مطالبہ کے اوسط نکالنے کا ذکر آتا ہے، کیوں کہ پورے عہد کے لیے شرحیں (آئین نوزدہ سالہ میں) درج تحریر تھیں اور ان کے لیے ثانوی معلومات کا جمع کیا جانا ضروری نہ تھا۔

تیسرے فقرہ کی تعبیر کا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے کس طرح پڑھا جاتا ہے۔ یہاں بلاکمین کے متن کے کسی قلمی نسخہ سے جسے میں نے استعمال کیا ہے تائید نہیں ملتی اور اورینٹل ۲۱۶۹ جو اس کا بہترین ماخذ تھا اس کی تردید کرتا ہے۔ میں نے جن قلمی نسخوں کو دیکھا ہے وہ دو زمروں کے تحت آتے ہیں۔ ایک زمرہ میں فقرہ کے دو حصوں کو ایک میں اس طور پر درج کیا گیا ہے: "دہر سال جنس کامل افزوں بود" (رائل ایشیاٹک سوسائٹی '۱۱۶ اور انڈیا آفس ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۷۰)۔ جنس کامل کے معینہ معنی، اعلیٰ قسم کی فصلیں، مثلاً گنا یا پوستہ تھا۔ چونکہ ان فصلوں کا فی بیگھہ سرکاری مطالبہ زیادہ ہوا کرتا، لہذا مالی منفعت کے خیال سے وزارت مال ان کی ہمت افزائی کرتی تھی۔ لہذا متن کی یہ تعبیر اس بات کو پورے وثوق کے ساتھ بطور ایک امرِ واقعہ کے پیش کرتی ہے کہ فصلوں کی قسم مسلسل بہتر ہوئی۔ یہ دعویٰ کلیتہً بے محل نہ ہوگا کیونکہ اس سے نئے انتظامات کی کامیابی تحریر میں آتی ہے۔ لیکن

بظاہر یہ بات بھونڈے پن کے ساتھ رکھی گئی ہے اور اختتامی الفاظ سے ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ حقیقتاً اس قسم کا اضافہ کرنے والا جدول موجود نہیں ہے میرے پاس اس تعبیر کو مسترد کرنے کا یہ جواز ہے کہ اگر یہ اصل عبارت ہوتی تو میں نہیں سمجھتا کہ حاشیہ یا سہو سے اس کے بجائے دوسری عبارتیں پڑھنا کیوں کر ممکن ہو سکتا تھا۔ دوسری، کوئی نقل کرنے والا کاتب جس کے سامنے اس کی متبادل خواندگیوں میں بعض رہی ہوں گی، ان الفاظ کو جو بظاہر فاضل تھے، حذف کرتے ہوئے، ہمت ہار کر بقدر ایک بامعنی جملہ کے کافی مواد منتخب کر سکتا تھا یا ممکن ہے کہ اصل مخطوط میں اشاعت کے وقت اس مقام پر تبدیلی کر دی گئی ہو اور تبدیلیاں غیر واضح رہی ہوں۔

بقیہ قلمی نسخوں کے متن فی الجملہ، دوسرے و تیسرے الفاظ اور چند اتفاقی اختلافات جنھیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے کو چھوڑ کر ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔ دوسرے اور تیسرے الفاظ اس طور پر درج ہیں:۔

ہر سال	مطبوعہ متن۔
ہر مال	انڈیا آفس ۲۶۴، اڈیشنل ۶۵۴۶، ۷۶۵۲۔
پرتال	انڈیا آفس ۲۶۵۔
ہر سال بر سال	اڈیشنل ۵۶۴۵۔
ترمال	اڈیشنل ۵۶۰۹۔
ہر حال	کیمبرج۔
نیز مال	اورینٹل ۲۱۶۹، اڈیشنل ۶۵۵۲۔

اس قسم کا تنوع معمول کے بہت خلاف ہے اور میں اس کی توجیہہ صرف اس طور پر کر سکتا ہوں کہ اصل میں کوئی انتہائی فنی اصطلاحی فقرہ تھا جسے وزارتِ مال کے باہر کے کاتبین سمجھنے سے قاصر تھے اور یہ کہ تقریباً شروع ہی سے اس کی شکل بگاڑ دی گئی اور اس کے بعد اسے بامعنی بنانے کی مختلف کوششیں کی گئیں۔ اورینٹل ۲۱۶۹ قدیم ترین مخطوطہ ہے اور اڈیشنل ۶۵۵۲ بھی ابتدائی "غالباً سترہویں صدی" کا قلمی نسخہ ہے۔ ان کی خواندگی سے ایک اصطلاحی مفہوم نکلتا ہے جو بقیہ مخطوطوں میں سے کسی ایک کے بھی جو معنی لیے جا سکتے ہیں۔ اس سے بہت بہتر ہے۔ دوسری طرف، اس غیر واضح فقرہ 'مال جنس کامل'، کے لاپرواہی

سے لکھے جانے یا غلط سمجھے جانے کی صورت میں، یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ بگاڑ کر کیوں کر پیدا ہوا۔ لہذا میں اس خواندگی کو تسلیم کرتا ہوں۔

جہاں تک شکل کے بگاڑ کا تعلق ہے 'م' کا حلقہ کھلا ہوا چھوڑ دینے کی صورت میں جیسا کہ بعض اوقات پیش آتا ہے، آسانی کے ساتھ مال کو غلط طور پر 'سال' پڑھا جاسکتا ہے اور 'سال' کو صحیح تصور کرتے ہوئے 'بزر' کو 'ہر' میں تبدیل کر دینا آسان اور فطری ہوگا۔ 'ہرمال' 'ترمال' اور 'برتال' کسی حیران نقل کرنے والے کے "عقلی گدے" ہوں گی اور 'ہرسال' 'برمال' ایک ایسے شخص کا کام ہوگا جس کے رو بر و متصادم قلمی نسخے رہے ہوں۔ بہرحال 'سال' کے مقابلہ میں 'مال' کی سند بہت بہتر ہے۔

معنی کے اعتبار سے 'مال جنس کامل' اعلیٰ قسم کی فصلوں پر مطالبہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ چودھویں سے سترہویں صدی تک' اعلیٰ قسم کی فصلوں کو ترقی دینا' وزارت مال کی پالیسی کے دو خاص طریق کار میں سے ایک تھا اور دوسرا کاشت کاری کا بڑھانا تھا کمترین تخمینہ کے مطابق اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ وزارت 'سال بہ سال' اسی سمت میں ہونے والی ترقی کے اعداد و شمار مرتب کیا کرتی تھی اور میں متن میں یہ لکھا ہوا تصور کرتا ہوں کہ مطالبہ کا اوسط نکالنے کے بعد' سرکاری عملہ' اعلیٰ قسم کی فصلوں پر مطالبہ کے سلسلہ میں بھی ان اعداد کا لحاظ رکھتا تھا اور ان کے لیے بجائے اوسط کے سب سے بڑی عدد لے لیا کرتا تھا۔

اب مطالبہ کے اوسط نکالنے کا عمل جس کے متعلق متن واضح ہے' مطالبہ کی نئی شرحوں کے جنھیں اس وقت جاری کیے جانے کا ہمیں علم ہے' حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتا تھا، بلکہ یہ ایک کارآمد مالیت کے لیے بیّن طور پر مناسب بنیاد کا کام دے سکتا تھا۔ میرے خیال میں اس قابلِ لحاظ امر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ میرا 'ذ' میں مطالبہ کی نئی شرحوں کا نہیں، بلکہ ایک نئی مالیت کی تیاری کا بیان آیا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ پچھلے دس برسوں کا مطالبہ کا اوسط نکالا گیا تھا۔ کیا یہ اوسط بذات خود ایک معقول مالیت ہوگی ؟ یا اسے کم و بیش کرنا ہوگا؟ یاد رہے کہ یہ کام شاہ منصور کے سپرد تھا جو اپنی باریک بین حساب دانی کے لیے مشہور تھا۔ ہم اسے تقریباً اس بات پر اقرار کرتا ہوا سنتے ہیں کہ اس قسم کا اوسط حکومت کے لیے غیر منصفانہ ہوگا کیونکہ اس سے ان مواضعات کی مالیت جہاں اعلیٰ قسم کی فصلیں ترقی کر رہی تھیں کم ہو جائے گی۔ اس کی دلیل یہ ہوا کرتی کہ "بارش پر منحصر فصلوں کے لیے ہمیں اوسط کو قبول کرنا چاہیے۔ لیکن

جہاں حکومت نے کنویں کھدوائے ہیں یا قرضے منظور کیے ہیں جس کے نتیجہ میں گنّے اور پوستہ کی کاشت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے، وہاں ہم منافع کے کسی جُز کو جاگیردار کے کیوں سپرد کردیں؟ فرض کیا کہ اس دہائی کی مدّت میں گنّے کی کاشت ۲ سے مسلسل بڑھ کر ۱۰ پر پہنچ گئی ہے، تو ایسی صورت میں مالیت صرف ۶ کے عدد پر کیوں لگائی جائے؟ کنویں اب بھی موجود ہیں لہٰذا جاگیردار مناسب انتظام کے ذریعہ دس کی عدد کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ وہ اگر ایسا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اسے نقصان برداشت کرنا چاہیے۔ مالیت کو حکومت کے لیے منصفانہ بنانے کے لیے ہمیں ان اعلیٰ قسم کی فصلوں پر اوسط کے بجائے سب سے بڑی عدد رکھ کر نکالے ہوئے اوسط مطالبہ کو بڑھانا چاہیے۔" میں نے جو خواندگی اختیار کی ہے اس کی رو سے آئین کی اطلاع ہے کہ ایسا ہی عمل کیا گیا۔

پس ہماری اختیار کی ہوئی خواندگی کی رو سے آئین کی اطلاع ہے کہ جو عمل کیا گیا وہ یا تو مطالبہ کا اوسط نکالنا تھا، یا پھر ایک اوسط نکالنے کے بعد اسے ضرورت کے مطابق بنانا تھا۔ یہ ہر دو عمل، نقدی تبدّل کے نتیجہ میں پیش آنے والی پریشانی سے غیر متعلق لیکن دونوں ہی مساوی طور پر ایک نئی مالیت کی تیاری کے لیے برمحل ہیں۔ اس طور پر پیرا 'د' اور 'ذ' بظاہر غیر منطقی ہیں پریشانی یہ تھی کہ نقدی تبدل ناکام ثابت ہوچکا تھا۔ اس کا حل ایک نئی جمع میں تھا جو مندرج تفصیلات کی رو سے واضح طور پر ایک مالیت تھی۔ پیرا کے آخری الفاظ ایک مزید نامعقولیت فراہم کرتے ہیں۔ ان میں " ایک جدول " کا حوالہ آتا ہے، لیکن متن میں جو جدول ان کے بعد آتا ہے وہ اپنی موجودہ حالت میں مطالبہ کی شرحوں کا ہے جن کے متعلق ہمیں علم ہے کہ یہ نقدی تبدّل کی پریشانی کے ازالہ کی غرض سے اس وقت جاری کی گئی تھیں۔

ایک اور نکتہ قابلِ ذکر ہے۔ جیسا کہ باب چار میں گذر چکا ہے، اکبر نامہ میں متعدد مفصل حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جاگیرداری کا طریقہ حقیقتاً پرانے صوبوں میں چوبیسویں برس یا اس کے فوراً بعد دوبارہ جاری کیا گیا تھا۔ ایسا ضرور ارادی طور پر کیا گیا ہوگا، گو کسی حکم کی تحریر نہیں ملتی ہے۔ نتیجتاً اس وقت ایک نئی مالیت ضرور تیاری کی گئی ہوگی، کیوں کہ بغیر مالیت کے جاگیریں نہ دی جاسکتی تھیں۔ زیرِ بحث پیرا کے متعلق یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ اس میں اس تیسری مالیت کی تیاری کا بیان آیا ہے۔ لہٰذا تحریروں میں مندرج واقعات سے یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ دو علیٰحدہ علیٰحدہ مگر ایک دوسرے سے متعلق عمل اس وقت اختیار کیے گئے

یعنی نقدی مطالبہ کے شرح ناموں اور تیسری مالیت کی تیاری۔ آئین کا بیان ان دونوں عمل کی نشاندہی کرتا ہے، لیکن اس قدر مبہم طور پر کہ ہمیں اسے انداز بیان کی نارسائی یا اس امر سے منسوب کرنا ہوگا کہ تقسیم کے وقت اسے مسخ کر دیا گیا تھا۔

ہمیں اب اکبر نامہ میں دی گئی اس عبارت (۳)، ۲۸۲ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جو آئین کے متذکرہ بالا بیان کے متوازی ہے۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، اس کی اطلاع ہے کہ اکبر نے نقدی تبدل کی ناکامی کے حل کے طور پر جمع دہ سالہ کو ترتیب دیا۔ اس کے بعد اس میں یہ آتا ہے کہ: "اس ترکیب کی حقیقت یہ ہے کہ کاشت کاری کے اختلافات اور قیمتوں کے حدود کے پیشِ نظر، ہر پرگنہ کے 'حال دہ سالہ' کو متعین کرنے کے بعد اس نے اس کے ۱/۱۰ کو بطور 'مال ہر سالہ' کے قائم کیا جیسا کہ اس تصنیف کی آخری جلد میں مفصلاً واضح کیا گیا ہے۔" آئین، اکبر نامہ کی آخری جلد ہے، لہٰذا ہمیں اس جملہ کو زیرِ بحث عبارت کا ایک مختصر کیا ہوا لفظی ترجمہ تصور کرنا چاہیے۔ اس صورت میں 'حال دہ سالہ' کا مفہوم 'محصول دہ سالہ' اور 'مال ہر سالہ' کا مفہوم 'ہر سالہ' ہوگا۔ 'ہر سالہ' کو ایک زیادہ شستہ زبان میں 'مال ہر سالہ' کے مرادف کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ منجملہ مالی اصطلاحوں کے 'مال' ایک وسیع تر مفہوم رکھنے والی اصطلاح ہے اور باوجودیکہ اس کا محدود مفہوم اکثر 'مطالبہ' ہوتا ہے، لیکن اسے مطالبہ کے واقعی اعداد سے نکالا ہوا ایک اوسط تصور کرنے میں کوئی قباحت نہ ہونی چاہیے۔ مجھے 'حال دہ سالہ' کی کوئی نظیر نہ مل سکی، لیکن 'حال' ایک بہت ہی وسیع لفظ ہے اور ہم بغیر کسی کھینچ تان کے اس کا ترجمہ "ایک دس سالہ حالت" کر سکتے ہیں۔ مطالبہ کے اعداد پر کاشت کاری اور قیمتوں کے اختلافات اور تبدیلیاں اثر پذیر ہوا کرتی تھیں، کیونکہ یہ اعداد ہر فصل کی واقعی کاشت اور قیمتوں کے ساتھ تبدیل ہوتی ہوئی شرحوں پر تشخیص کی گئی تھیں۔ اس طور پر اس عبارت کو آئین میں جو کچھ درج ہے اس کا ایک نفیس لیکن نامکمل خلاصہ تصور کیا جا سکتا ہے، لیکن اسے آئین میں جو کچھ حذف کر دیا گیا ہے اسے پورا کرنے والی امدادی عبارت تصور نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ اکبر نامہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جو آئین کی کھلی ہوئی غیر منطقی باتوں کا ازالہ کرتی ہو۔ اگر ہم یہ تصور کر لیں کہ "جدول ظاہر کرتا ہے" کے الفاظ کے بعد، مسودہ میں تیسری مالیت کا گوشوارہ اور اس کے بعد مطالبہ کے گوشواروں کی وضاحت رہی ہوگی، اور یہ کہ تیسری مالیت

کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے مسترد کر دیا گیا تھا کیونکہ آئین دوازدہ صوبہ' میں مالیت کو تاریخ جاری تک پورا کرنے کے بعد شامل کیا جاتا تھا اور یہ کہ آخرالذکر، نظرِ ثانی کے دوران غیر ارادی طور پر حذف ہو گئے اور اس طور پر ان سے مالیت کے بیان کے بعد براہِ راست مطالبہ کی شرحوں کا ذکر آ گیا تو ایسی صورت میں آئین کی آخری غیر معقولیت کا ازالہ ہو جائے گا۔ ایسا ممکن ہو سکتا ہے، کیونکہ عاجلانہ تصحیح کی اور بھی علامات موجود ہیں، لیکن اس نکتہ پر کوئی شہادت نہیں ہے۔

آئین میں پائی جانے والی اس غیر معقولیت کی دو توجیہیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اول تو، چونکہ مدّون نے اس کے پہلے اور مکمل مسودہ کو بہت زیادہ کاٹ چھانٹ دیا تھا، لہذا ممکن ہے کہ باب متعلقہ کے اس حصّہ کو معتد بہ طور پر تبدیل کر دیا گیا ہو۔ جیسا کہ باب ۴ میں بیان کیا جا چکا ہے، اکبر نامہ کی مختلف عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شاہ منصور جو وہاں مسلسل موجود تھا اور ٹوڈر مل کے درمیان جو وقتاً فوقتاً اپنی فوجی خدمات سے وہاں واپس آ جایا کرتا تھا، کشمکش چل رہی تھی۔ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ مسودہ میں ان پرانے مناقشوں کا زیادہ ذکر تھا جسے مدّون نے غیر ضروری یا ناخوشگوار تصور کرتے ہوئے قلم زد کر دیا ہو۔ شاہ منصور کا بیان حقیقتاً ایک ناپسندیدہ موضوع تھا، کیونکہ اس بات پر کہ اس کا بغاوت کے الزام میں پھانسی دیا جانا جائز تھا یا نہیں شبہ کیا جاتا تھا۔ ابوالفضل اس کا اکبر نامہ میں محتاط طریقہ پر ذکر کرتا ہے اور یہ ایک قابلِ توجہ بات ہے کہ اس کا نام پیرا 'د' اور 'ذ' میں نہیں آتا، حالانکہ جن کارروائیوں کا ان میں ذکر آتا ہے ان پر عمل درآمد کرنے کا سہرا تنہا اسی کے سر ہے اور اس کے قبل کے پیراگرافوں میں ذمّہ دار عہدہ داروں کے نام باقاعدہ آتے ہیں۔ ایک طویل مسوّدہ کی ناقص تلخیص کے نتیجہ میں، متن میں جیسا کہ یہ ہے غیر معقولیت پیدا ہو سکتی ہے، لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اس کی متبادل صورت یہ ہے کہ 'جمع دہ سالہ' کے فقرہ کو ایک ایسا محاورہ تصوّر کیا جائے جو وزارت میں عارضی طور پر استعمال ہونے لگا تھا اور صرف زیرِ بحث عبارتوں میں نہ تو مجموعی مطالبہ کے اور نہ مالیت کے مفہوم میں بلکہ وزارت میں چوبیسویں برس کی جملہ خصوصی کارروائیوں کے مفہوم میں باقی رہ گیا تھا۔ ان کارروائیوں سے مطالبہ کے نئے گوشوارے اور نئی مالیت دونوں ہی وجود میں آئے اور چونکہ ان میں سے ہر ایک اس

دہائی" پر مبنی تھے، لہٰذا ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے تھے، گو ان کے حساب الگ الگ لگائے گئے ہوں گے۔ اس فقرہ کو اس قسم کا ایک دفتری نام تصور کرنے سے غیر معقولیت رفع ہوجاتی ہے کیونکہ یہ جن خصوصی کارروائیوں کو ظاہر کرتا ہے وہ حقیقتاً پیش آمدہ دقت کا ایک حل پیش کرتی تھیں۔ بیان میں کمی باقی رہتی ہے، کیونکہ اس میں دو کے بجائے صرف ایک کارروائی کا بیان آیا ہے، لیکن یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ آئین اکثر مواقع پر نامکمّل ہے۔ انیسویں برس کی تبدیلی کے سلسلہ میں خلا کو جیسا کہ پہلے آچکا ہے اکبرنامہ سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ صورت میں، اکبرنامہ آئین کی محض تلخیص کرتا ہے، لیکن ہم ابوالفضل کو جزوی تفصیلات کا پابند قرار دینے میں حق بجانب نہ ہوں گے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس نے ایک خالصتہً فنیّ دلچسپی کے معاملہ میں اپنے مواد کے خلاصہ پر قناعت کی۔ دفتری اصلاحات بسااوقات علمِ صرف کے اصولوں سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ ایک ایسے نام کو جس کا بجا طور پر محض ایک جزٗ پر اطلاق ہوسکتا ہے کُل کے لیے استعمال کرنا ناقابلِ قیاس نہیں ہے خاص طور پر ایسی صورت میں کہ وہ جز اس نام کے استعمال کرنے والوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ اہم تھا۔

چنانچہ مجھے یہ متبادل صورت بالکل معقول معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کی تائیدی شہادتیں نہیں ہیں۔ مسلّمہ امور اس طور پر ہیں:- (۱) مطالبہ کی شرحوں کے نئے گوشوارے اس وقت جاری کیے گئے جو آئین میں درج ہیں (۲) اس وقت ایک نئی مالیت کی ضرورت تھی کیونکہ جاگیرداری کا طریقہ دوبارہ زندہ کیا جارہا تھا (۳) پیرا 'ذ' میں بیان کی ہوئی کارروائی سے قابلِ اطمینان مالیت مرتب ہوسکتی تھی لیکن اس سے تحریروں میں مندرج مطالبہ کے گوشوارے، جن کے اس کے بعد سے تشخیصوں میں استعمال کیے جانے کا ہمیں علم ہے، حاصل نہ ہوسکتے تھے۔ ہمیں اس پیرا کو نئی مالیت کی تیاری کا ایک بیان تصور کرنا چاہیے، کیونکہ اسے کسی اور مفہوم میں جو مسلّمہ واقعات سے ہم آہنگ ہو تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ اب جو بات غیر یقینی رہ جاتی ہے وہ محض یہ ہے کہ اس نے یہ شکل کیوں اختیار کی۔

حوالہ جات ضمیمہ ذ

لہ سر جرٹ مجھے بتاتے ہیں کہ بوڈلین کے قلمی نسخوں میں نمبر ۲۱۴ میں پندرھواں بالکل واضح ہے لیکن نمبر ۲۱۵ میں گیارھواں ہے۔ لہ ملاحظہ ہو وی۔ اسمتھ 'اکبر دی گریٹ مغل' ۱۹۱۴، و صفحات مابعد۔

ضمیمہ (ر)

ٹوڈرمل کے متعلق روایات

میں نے باب ۴ میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ٹوڈرمل کے کام کو بیان کرتے وقت میں نے ہم عصر تحریروں کی پیروی کی ہے اور خوافی خاں کی اٹھارہویں صدی کی سرگذشت میں مندرج اس کے بیان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ میں نے جن وجوہ سے اسے نظر انداز کیا ہے، وہ اس ضمیمہ میں بیان کیے گئے ہیں۔

خوافی خاں کے بیان کو اس بات سے شروع کیا گیا ہے کہ ٹوڈرمل کا کام پورے ہندوستان میں ضرب المثل تھا، لہذا اس کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہوگا۔ وہ پھر ترتیب وار نظام سکہ کے متعلق اس کی کاروائیوں، اس کے تشخیص کے طریقوں، اور کسانوں کے قرض دیئے جانے کے متعلق اس کے نظام کو درج کرنے کے بعد قطع کلام کرتے ہوئے مصنف کے زمانہ کے انحطاط پر جب کہ کوئی شخص بھی کسانوں پر ذرا توجہ نہیں دیتا، زمینیں دوبارہ جنگل ہو رہی تھیں اور ایماندار سرکاری ملازم عام طور پر ایک ناکارہ احمق تصور کیا جاتا تھا، ایک طویل مرثیہ خوانی کرتا ہے۔

نظام سکہ کے متعلق اس تذکرہ میں پورے وثوق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ٹوڈرمل نے ۱۱ (کذا) ماشوں کا چاندی کا روپیہ رائج کیا جس نے "سیاہ" ٹنکے کو جو اس کے زمانہ تک واحد چلنے والا سکہ تھا بے دخل کر دیا۔ چاندی کے سکے بلاشبہ ڈھالے گئے تھے، لیکن وہ غیر ملکی سفیروں اور فن کاروں کو بعض انعام دیئے جاتے تھے اور ان کا عام چلن نہ تھا۔ یہ بطور بیش قیمت دھات کے فروخت ہوتے تھے۔ پھر، آئین [۱، ۲۶] میں درج ہے کہ

$11\frac{1}{4}$ ماشوں کا چاندی کا روپیہ شیر شاہ کے زمانہ میں جاری کیا گیا تھا۔ اکبر کی نظم و نسق سے متعلق سرکاری تحریر کا شیر شاہ کو اس اصلاح کے لیے تعریف سے، اگر وہ اس کا مستحق تھا، محروم کر دینا' بالکل ناقابلِ یقین ہے۔ دوسری طرف شیر شاہ اور اسلام شاہ کے چاندی کے سکوں کے موجود نمونوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے چلن کے متعلق کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا اس معاملہ میں، اس تذکرہ کے مصنّف نے ایک سابقہ مصلح کی کارگذاری کا سہرا واضح طور پر اپنے ہیرو ٹوڈرمل کے سر باندھا ہے جس کے نتیجہ میں یہ تذکرہ مجموعی طور پر شبہ سے خالی نہیں۔

ٹوڈرمل کے تشخیص کے طریقوں کو حسب ذیل طور پر بیان کیا گیا ہے :۔

دونوں فصلوں کے غلّہ کی ان پیداواروں کے متعلق جو بارش کے پانی پر منحصر تھیں، ٹوڈرمل کا فیصلہ تھا کہ ان پر پیداوار کا آدھا بطور مالگذاری وصول کرنا چاہیے۔ آبپاشی کی ہوئی فصلوں (غلّہ، دال، گنّا، افیون، ہلدی وغیرہ) پر اخراجات کے لیے چوتھائی منہا کرنے کے بعد، غلّہ پر ایک تہائی اور گنّے وغیرہ کے ایسی اونچی قسم کی فصلوں پر، شرحیں، پیداوار کے اعتبار سے $\frac{1}{4}$، $\frac{1}{5}$، $\frac{1}{4}$ یا $\frac{1}{2}$ تک تبدیل ہوتی تھیں۔

حسب خواہش، ہر فصل کے ایک بیگھہ پر ایک نقد رقم مقرر کی جا سکتی تھی جسے رلبہ ٹوڈرمل کا دستور العمل یا دھارا کہتے تھے۔

اس تذکرہ سے تشخیص کے دو متبادل طریقوں کی نشاندہی ہوتی ہے، تفریقی بٹائی اور نقدی شرحوں پر پیمائش۔ جن ہم عصر تحریروں کے متن کا میں نے مطالعہ کیا ہے وہ تفریقی بٹائی کی نشاندہی نہیں کرتے، اور ان سے یہ واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ٹوڈرمل کی پیمائشی شرحیں نقد میں نہیں بلکہ غلّہ میں مقرر کی گئی تھیں۔ لہٰذا یہ ایک سنگین اختلاف ہے۔

اس بیان کی قدر و قیمت کے تعین کے سلسلہ میں، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سرگذشت کا متن بہت ہی مشتبہ ہے۔ ایلیٹ کی تاریخ [(۷)، ۲۱۰] میں کرنل ڈبلو۔ این۔ لیز[۴] کی یہ تحریر قلم بند کی گئی ہے :۔

"میری نگاہ سے جو نسخے گذرے ہیں اور میں نے بظاہر بہت ہی اچھے قلمی نسخوں کا

---

۴. W.N. LEES

موازنہ کیا ہے، ان میں سے کوئی بھی دو، بجنسہ ایک سے نہیں ہیں اور ان میں سے بعض میں تو ایسے اختلافات موجود ہیں جو اس مفروضہ کی تائید کرتے ہیں کہ یہ جدا جدا تصانیف ہیں۔"
میرے علم کی حد تک، متن کو متعین کرنے کی ابھی تک کوشش نہیں کی گئی ہے۔ ببلیوتھیکا انڈیکا سے شائع کی ہوئی پہلی جلد میں ایک تنقیدی دیباچہ کا وعدہ کیا گیا تھا، لیکن یہ وعدہ ابھی تک پورا نہیں کیا گیا اور مدوّن کے استعمال کیے ہوئے قلمی نسخوں کی کوئی نشاندہی اس وقت موجود نہیں۔ بہرحال اس معاملہ میں یہ واضح ہے کہ یہ بیان اصل سرگذشت کا ایک جز نہ تھا بلکہ اس میں بعد کو شامل کیا گیا۔ مطبوعہ متن میں یہ دو مقامات پر آتا ہے۔ متن کی یادداشتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو قلمی نسخوں میں یہ عہدِ اکبری کے چھٹے برس کے تحت شامل کیا گیا ہے (ص ۱۵۵) اور تیسرے میں (ص ۱۹۵) یہ چونتیسویں برس کے تحت درج ہے۔ یہ مشکل ہی سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اصل سرگذشت کا ایک اہم جز اس طور پر اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہوگا۔ واقعات بیّن طور پر بعد میں شامل کیے جانے کی نشاندہی کرتے ہیں، جو دو نسخوں میں اس مقام پر جہاں ٹوڈرمل کا پہلی بار ذکر آتا ہے اور تیسرے میں اس کی وفات کی تحریر کے سلسلہ میں کیا گیا تھا۔ میں اس مسئلہ پر کہ یہ بعد کا اندراج خود خوانی خان کا کیا ہوا ہے یا کسی اور کا، کوئی قطعی رائے ظاہر کرنے سے قاصر ہوں۔ سرگذشت کا اسلوبِ بیان یکساں نہیں ہے۔ یہ بیان اس کے کچھ حصوں کے مشابہ ہے اور کچھ کے نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ حصے بھی جن سے یہ مشابہ ہے، اُسی ہاتھ کے لکھے ہوئے مزید اندراجات ہوں۔

پس یہ بیان، اس کا لکھنے والا خواہ کوئی ہو، واقعات سے ۱۵۰ برس یا اس سے زیادہ بعد کا ہے۔ اسی طور اس کے اور واقعات کے درمیان فاصلہ کی دوری بھی حائل ہے، کیونکہ سرگذشت کا تعلق ہندوستانی نہیں بلکہ دکنی تحریروں سے ہے۔ لفظ "دھارا" جو دستور العمل کے ایک مرادف کے طور پر دیا گیا ہے وہ اس کے ماخذ کے علاقہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہندی میں اس کے بنیادی طور پر پانی کے ایک بہاؤ کے ہوتے ہیں اور فوربس اور پلاٹس کی لغات اس کا کوئی اصطلاحی استعمال ظاہر نہیں کرتیں لیکن مولس ورتھ

MOLESWORTH * * * PLATTS * * FORBES *

کی مرہٹی لغت میں اس کے معنی "دلگان' قیمتوں وغیرہ کی معمول کی شرح" بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی کسی مسلم تحریر کو اس بات کی محتاجی نہ تھی کہ وہ 'دستورالعمل' ایسے عام لفظ کے مرادف کے لیے کسی ایسے لفظ کا استعمال کرے؛ لیکن دکن میں اس کے مرادف کا استعمال ایک فطری عمل ہے۔ اس طور پر ہمارے پیشِ نظر دکن میں ترتیب دیا ہوا ایک بعد کا بیان ہے۔

اب' اس میں بیان کیے ہوئے تشخیص کے طریقے بیشتر وہی ہیں جو جیسا کہ باب ۷ میں ذکر آچکا ہے مرشد قلی خاں نے تقریباً ۱۶۵۵ء میں دکن میں رائج کیے تھے اور جس نے واضح طور پر اس علاقہ میں ایک گہری چھاپ چھوڑی تھی۔ یہ تصور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مرشد قلی خاں' ٹوڈرمل کے کام ("لفظ": کذا) سے عملاً واقف تھا، لیکن یہ یقین کرنے میں بحیثیت ایک اجنبی کے کام شروع کرتے وقت اس نے اپنے نئے کاموں کے لیے ٹوڈرمل کی روایتی سند سے سہارا حاصل کیا ہو' کوئی دقت نہیں۔ جہاں تک پیمائش کو رائج کرنے کا تعلق ہے وہ حقیقتاً ٹوڈرمل کے طریقہ کی تقلید کر رہا تھا اور دکن کے لوگ جو ٹوڈرمل سے براہِ راست واقف نہ تھے بہت آسانی کے ساتھ مرشد قلی خاں کے پورے کام کو اس سے منسوب کر سکتے تھے' حالانکہ وہ محض اس کے کچھ حصوں ہی کے لیے تعریف کا مستحق تھا اس حد تک کہ مرشد قلی نے پیمائش کو رواج دیا' وہ ٹوڈرمل کی بغیر سوچے سمجھے نقل نہیں بلکہ محض تقلید کر رہا تھا۔ اگر اس کا تعریفی بٹائی کا طریقہ ہندوستان کے لیے کوئی نئی چیز تھی' جیسا کہ میرے خیال کے مطابق تھی' تو ٹوڈرمل کی روائتی شہرت اس قدر زیادہ اور ساتھ ہی ساتھ اس قدر مبہم تھی کہ اس طریقہ کو بھی اس سے منسوب کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال' مرشد قلی کے کام کی روئداد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دکن میں اسے ٹوڈرمل کے کام پر مبنی تصور کیا جاتا تھا۔ خوافی خاں [(۱)' ۷۳۲] اور مآثر الامرا [(۳)' ۴۹۷] اس بات پر متفق ہیں' حالانکہ دوسری باتوں پر نہیں۔ بلاشک یہی دکھنی روایت تھی جسے جیمس گرانٹ نے اسی صدی کے بعد کی مدت میں قبول کر کے یہ تحریر کیا کہ مرشد قلی خاں کا کام ٹوڈرمل کے کام کی ایک بغیر سوچی سمجھی ہوئی نقل تھی۔

یاد رہے کہ ٹوڈرمل کے کام کا یہ دکنی بیان' مآثر الامرا سے جو خود بھی دکن میں اٹھارہویں صدی کے دوران مرتب کی گئی تھی' مطابقت نہیں رکھتا۔ مآثر الامرا [(۱)' ۱۲۷]

میں مندرج بیان واضح طور پر آئین اور اکبر نامہ سے ایک ماخوذ تلخیص ہے اور اس کا مصنف اس خیال کی تائید نہیں کرتا کہ راجہ (ٹوڈرمل) کے طریقوں میں تفریقی بٹائی شامل تھی۔ مجھے اس موضوع پر تحریروں میں کوئی اور عبارت نہیں ملی، لہٰذا خوافی خاں کی سرگذشت میں مندرج تذکرہ تنہا باقی رہتا ہے اور اس کے سن و مقام تحریر کے پیش نظر، اسے ان اہم عصر شہادتوں کی تردید کے طور پر نہیں قبول کیا جا سکتا جن پر میں نے باب ۴ میں اعتماد کیا ہے۔

لہٰذا میرا خیال ہے کہ اس بیان کو کہ مرشد قلی نے ٹوڈرمل کی بغیر سوچے سمجھے ہوئے نقل کی بجا طور پر ایک قصّہ کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ ایک اور قصّہ جو بعض ابتدائی انگریزی مصنفوں کے یہاں ملتا ہے اس طور پر ملتا ہے کہ ٹوڈرمل خود ایک نقّال تھا اور یہ کہ آئینِ اکبری تیمور کے بنیادی ضابطوں سے براہِ راست ماخوذ ہے۔ ان ضابطوں کے اصل نسخہ کی موجودگی کا علم نہیں، لیکن اس کا ایک فارسی نسخہ جس کی تیاری عہدِ شاہ جہانی سے منسوب کی جاتی ہے ۱۷۸۳ء میں میجر ڈیوی * کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ، جوزف وہائٹ * کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ اس کی سند پر شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے ایک بعد کی جعلسازی ہونے کی صورت میں، یہ خیال کہ ٹوڈرمل نے اس کی نقل کی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ اسے اصلی تصوّر کرتے ہوئے، اس کے آئین سے موازنہ کرنے کے بعد اس رائے کی کہ آئین اس سے براہ راست ماخوذ تھی قطعی طور پر نفی ہوتی ہے۔ تیمور کے بعض ادارے خصوصاً فوجی شعبے فطری طور پر اکبر کے وقت تک قائم رہے، لہٰذا ان دونوں تصانیف کی تفصیلات میں کچھ مشابہت پائی جاتی ہے، لیکن (۱) نظامِ تشخیص اور (۲) جاگیرداری کا طریقہ اہم اختلافات کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۱) تیمور کا تشخیصی نظام، جیسا کہ یہ وہائٹ کے ایڈیشن ص ۳۶۶ و مابعد پر بیان کیا گیا ہے۔ خالص اسلامی طرز کا ہے اور یہ پانی کی فراہمی کے فرق پر مبنی ہے، جب کہ آئین میں کسی جگہ بھی ایسے اختلافات کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۲) تیمور کا جاگیروں کے متعلق طریقہ یہ تھا کہ (ص ۲۳۶ و مابعد) یہ قرعہ کے ذریعہ تقسیم

JOSEPH WHITE ** MAJOR DAVY *

کی جاتی تھیں۔ اور ایک جاگیر پر تین برس تک قبضہ رہا کرتا، اس کے بعد اس کا معائنہ کیا جاتا اور اگر یہ معلوم ہوتا کہ جاگیردار نے کسانوں پر مظالم کیے ہیں تو اگلے تین برسوں تک اسے تنخواہ نہ ملتی۔ مغلیہ ہندوستان میں جاگیروں کی تقسیم بذریعہ قرعہ نہیں، بلکہ دیوان کی مہربانی پر موقوف رہا کرتی تھی۔ قبضہ کی میعاد غیر معین ہوتی اور معائنہ کے عمل کا یا مظالم کے لیے کسی مقررہ جرمانہ کا کوئی اندراج تحریروں میں نہیں آتا ہے۔

آئین میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ اکبر کی وزارتِ مال نے تیمور کے بنیادی ضابطوں کو سند کے طور پر تسلیم کر لیا تھا یا اس کے بارے میں سنا بھی تھا۔ ان ضابطوں کا محصولوں کے بیان کے سلسلہ میں [۱، ۲۸۹] جہاں اس کی موجودگی کی توقع کی جا سکتی تھی، کوئی ذکر نہیں آتا۔ دوسری طرف اس واقعہ سے (اگر یہ ایک واقعہ تھا) کہ عہد شاہجہانی میں اس کا ترجمہ کرنا پڑا، یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ اس قسم کی کوئی چیز پہلے سے موجود نہ تھی۔ لہٰذا اس خیال کی کوئی بنیاد نہیں ملتی کہ ٹوڈرمل نے ان ضابطوں سے رہنمائی حاصل کی اور صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ ان کی موجودگی سے واقف تھا، تو اس نے ان کے قاعدوں سے بہت زیادہ مختلف طریقہ اختیار کیا۔

ضمیمہ (ز)

آئین اکبری کے زرعی شماریات

میں نے اس ضمیمہ میں "آئین دوازدہ صوبہ" جس کا بیان باب ۳ کی فصل ۶ میں آیا ہے کے شماریاتی مسائل کے بعض پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ ہر صوبہ کے تذکرہ کے خاتمہ پر صوبجاتی اعداد پر مشتمل ایک پیرا درج ہے۔ اس کے بعد ہر سرکار پر اس ترتیب سے بحث آتی ہے: پہلے ایک جملہ میں ضلعی اعداد اور اس کے بعد ایک جدول میں ہر ذیلی ضلع (پرگنہ یا محال) کے اعداد دیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، قلعوں، دھاتوں یا چند صورتوں میں قدرتی عجائبات کی موجودگی پر کہیں کہیں یادداشتیں درج ہیں۔ صوبہ آگرہ کے متعلق پیراگراف [(۱)، ۴۴۲] کو عام ترتیب کی ایک مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

"اس میں سولہ سرکاریں اور ۲۰۳ ذیلی ضلعے ہیں۔ پیمائش کی ہوئی زمین: ۲۷۸۶۲۱۸۹ بیگھے اور ۱۸ بسوے۔ 'جمع': ۵۴۶۲۵۰۳۰۴ دام۔ منجملہ اس کے معانیاں ۱۲۱۰۵۷۰۳½ دام۔ مقامی فوج: ۵۰۶۸۱ سوار اور ۵۷۷۵۷۰ پیادے، ۲۲۱ ہاتھی۔"

دوسرے صوبوں کا بیان عام طور پر اسی ترتیب پر ہے۔ اہم ترین اختلافات، بعض صوبوں میں پیمائش کی ہوئی زمینوں کے حوالہ کی غیر موجودگی ہے۔

ہم انھیں خاص طور پر آئین میں درج کیے جانے کے لیے جمع کی ہوئی شماریات تصوّر کرسکتے ہیں یا زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ ان اندراجات کی نقل ہوں جو وزارتِ مال میں پہلے سے موجود تھے۔ لیکن ہر صورت میں ہمیں ان پر مجموعی طور پر غور کرنا چاہیے اور ہمیں یہی تسلیم کرنا چاہیے کہ ان کے جمع کرنے والوں کی نگاہ میں غالبًا اس کے مختلف

مذات کے درمیان کوئی ربط پایا جاتا تھا جس کی بنا پر انھیں مثلاً جمع اور معافیوں کے برابر برابر مقامی فوج کی تعداد درج کرنے کا جواز حاصل ہوا۔

پہلے پیمائش کی ہوئی زمین کے اعداد کے طرف متوجہ ہوتے ہوئے، ہم صوبوں کے مسلم یا بیشتر حصّہ کے رقبوں کے اندراج کو پاتے ہیں: ملتان، لاہور، دہلی، آگرہ، اودھ، الہ آباد، مالوہ، اجمیر، بہار اور گجرات۔ ان میں کے پہلے آٹھ وہ صوبے ہیں جنھیں اکبر نے انیسویں برس براہِ راست انتظام میں منتقل کیا تھا۔ لہذا ہم یہ جانتے ہیں کہ ان میں (بلکہ ان کے بیشتر حصّوں میں) متعدد برسوں کے دوران، تشخیص کی غرض سے، مزروعہ زمین کی واقعتاً پیمائش کی گئی تھی۔ دوسری طرف، بنگال (بشمول اڑیسہ)، خاندیش، برار، سندھ، کشمیر اور کابل کے کسی حصّہ کے رقبوں کے اندراج نہیں ہیں۔ یہ وہ صوبے ہیں جن کے متعلق یہ سوچنے کے لیے کوئی سبب نہیں کہ یہاں کبھی بھی پیمائش کے ذریعہ تشخیص رائج کی گئی تھی۔ ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا واجب ہوگا کہ رقبہ کے اندراجات ان علاقوں تک محدود ہیں جہاں کسی نہ کسی وقت بذریعہ پیمائش تشخیص کی گئی تھی اور اس بات کی یوں تائید ہوتی ہے کہ بعض صوبوں کے چند حصّوں کا رقبہ درج نہیں ہے۔ پیمائش کیے ہوئے دس صوبوں کی ان سرکاروں میں رقبوں کے اندراج نہیں ملتے: دہلی میں کمایوں، الہ آباد میں بتھگھورا، مالوہ میں گرڈھا اور مرومور، اجمیر میں جودھپور، سروہی اور بیکانیر، بہار میں مونگیر اور گجرات میں سورٹھ۔ ان تمام ضلعوں کے متعلق ہمارے پاس یہ اطلاع یا یہ یقین کرنے کے معقول اسباب ہیں کہ ان میں یا تو مغل انتظامِ حکومت مؤثر طریقہ پر نافذ نہ تھا یا اگر تھا بھی تو مقامی سرداروں کے ذریعہ۔

لہذا جہاں تک صوبوں اور ضلعوں کا تعلق ہے، ہم رقبوں کے اندراج اور کسی دور میں بذریعہ پیمائش کی جانے والی تشخیص کے درمیان ایک تعلق کی موجودگی اخذ کر سکتے ہیں بہار اور گجرات کے سلسلہ میں، ہمیں یہ تصوّر کرنا ہوگا کہ یہاں، انیسویں برس نہیں بلکہ غالباً کسی بعد کی مدّت میں پیمائش کو تھوڑے عرصہ کے لیے رائج کیا گیا تھا۔

مسلّم پیمائش کیے ہوئے سرکاروں کے متعدد ذیلی علاقوں میں رقبہ کے اعداد نہیں ملتے۔ ان تمام صورتوں میں یا ان میں سے بعض کے متعلق یہ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ ان کے اعداد ضائع ہو گئے ہوں گے۔ لیکن مجھے یہ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے

کم از کم بعض صورتوں میں یہ ذیلی تقسیمیں پیمائش کیے جانے سے واقعتاً رہ گئیں اور یہ کہ ان کے اندر مقامی اقتدار سرداروں کے ہاتھ میں قائم رہا۔

اب داموں میں مندرج جمع کے اعداد پر نگاہ ڈالتے ہوئے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ کسانوں پر کسی مخصوص برس یا متعدد برسوں کے دوران عائد کیا ہوا مطالبہ تھا یا یہ مالیت تھی جسے وزارت، انتظامی مقاصد کے لیے استعمال کیا کرتی۔ میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر پچھلے تمام مصنفین بشمول میرے، اوّل الذکر رائے کے حامی ہیں اور یہ ان دو میں سے کسی ایک مفروضہ کی بنیاد پر ایک معقول یا کم از کم قرین قیاس رائے تھی۔ اوّل نقد میں مقرر کی ہوئی تشخیص کا مفروضہ، دوسرے براہِ راست انتظام کے سلسلہ کو جاری رکھنے کا مفروضہ۔ لیکن اگر یہ دونوں مفروضے مسترد کر دیے جاتے ہیں تو پھر ہم مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ اعداد مطالبہ کے نہیں بلکہ مالیت کے تھے۔

پہلے مفروضہ کو انیسویں صدی میں ان مختلف مصنفوں نے تسلیم کیا جن کا خیال تھا کہ چوبیسویں برس کی کارروائی جس طور پر برطانوی عہد میں مطالبہ معمولاً معین کیا جاتا، بالکل اسی طور پر نقدی مطالبہ کے مقرر کیے جانے پر مشتمل تھی جسے ہر موضع کو سال بہ سال ادا کرنا ہوتا تھا۔ برطانوی عہدہ داران، فطری طور پر ایسا سوچتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ایک سہوِ زمانی ہے اور عہدِ اکبری کی تحریریں اس کی قطعاً تردید کرتی ہیں۔ چنانچہ ستائیسویں برس منظور کیے گئے ٹوڈرمل کے ترمیمی ضابطوں [اکبرنامہ (۳)، ۳۵۱] میں سے پہلے میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ تشخیص کو دستور العمل یا نقدی شرح نامہ کا سختی سے پابند ہونا چاہیے اور اسے ہر پیداوار کا زیرِ کاشت رقبہ پر عائد کرنی چاہیے اور بعد کے ضابطوں میں ہر فصل کی پیداوار کے رقبوں کی پیمائش کا ذکر آیا ہے۔ اسی طور پر محصّلین اور ان کے محرروں (کارکنوں) [آئین (۱)، ۲۸۶ - ۲۸۸] کے لیے ضابطوں میں تشخیص کا طریق کار مفصلاً درج ہے۔ موقع پر موجود فصلوں کی پیمائش کی جاتی، فصلوں کے نقصان کے رقبوں کو منہا کرتے، اس طرح جو رقبہ باقی بچتا اس کے حساب سے ہر کسان پر مطالبہ کا حساب لگاتے اور پھر پورے موضع کے لیے ان اعداد کی میزان لگاتے۔ اس طور پر تشخیص کا ایک گوشوارہ تیار ہوتا جن کی بنیاد پر فصل کی مالگذاری کو وصول کرنا ہوتا۔ اگر ان دستاویزات کا کچھ بھی مفہوم ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ ستائیسویں اور چالیسویں برس میں تشخیص کا مقررہ طریقہ پیمائش تھا۔

کسی موضع کا مطالبہ کوئی پہلے سے مقرر کی ہوئی یکمشت رقم نہ ہوتی بلکہ اسے مقررہ مطالبہ کی شرحوں کو ہر فصل کے زیرِ کاشت رقبہ پر عائد کر کے، شمار کرتے۔

جہاں تک دوسرے مفروضہ کا تعلق ہے، جب تک براہِ راست انتظام کا سلسلہ قائم رہتا، مطالبہ کی بذریعہ پیمائش تشخیص سے، مجموعی اعداد کو فراہم کرنا ممکن رہتا ہوگا۔ محصلین اور ان کے محرّروں کے لیے ضابطوں سے واضح ہوتا ہے کہ ہر موضع کے تشخیصی گوشوارے فصل بہ فصل صدر دفتر کو روانہ کیے جاتے اور جب تک اس طریق کار پر عمل ہوتا رہا، اس وقت تک ذیلی ضلعوں، سرکاروں اور صوبوں کے مجموعی مطالبہ کے اعداد کو جمع کرنے میں کوئی دقت نہ پیش آتی۔ حقیقتاً ہم یہ بلاخوفِ تردید تصوّر کر سکتے ہیں کہ ان اعداد کو پابندی کے ساتھ انتظامی مقاصد کے لیے جمع کیا جاتا تھا۔ لہٰذا آئین دوازدہ صوبہ کا مسوّدہ مرتّب کرنے والے عملہ کے لیے یہ اعداد قابلِ حصول رہے ہوں گے۔

لیکن اگر ہم اس نتیجہ کو قبول کرلیں جس پر ہم باب ۳ میں پہنچ چکے ہیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہادتیں اس کی پوری طور پر تصدیق کرتی ہیں، یعنی یہ کہ براہ راست انتظام محض پانچ برسوں تک قائم رہا جس کے بعد جاگیرداری کے نظام کو دوبارہ جاری کیا گیا تو ایسی صورت میں یہ مشکل ہی ممکن ہوسکتا ہے کہ زیرِ بحث اعداد، آئین کی تدوین کے زمانہ میں موجود مطالبہ کے کسی اندراج کو ظاہر کرتے ہوں۔ قاعدوں میں یا کسی جگہ اور یہ نشانی نہیں ملتی کہ جاگیرداروں سے تشخیص کے فصلی گوشوارے طلب کیے جاتے تھے، لہٰذا صدر دفتر میں رواں مطالبہ کے موجود اعداد، مملکت کے نسبتاً اس چھوٹے حصّہ تک جو اس وقت خالصہ میں تھے محدود رہے ہوں گے۔ دوسری طرف، چوبیسویں برس اور اس کے بعد سے جاگیروں کے رواج کی موجودگی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اسی دوران مملکت کی مالیت کا کوئی ایک تخمینہ، وزارتِ مال کے استعمال میں تھا۔ لہٰذا ہمیں ان دو متبادل صورتوں میں سے ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ 'آئین دوازدہ صوبہ' کے مرتّبین نے یا تو اس وقت کی مروّجہ مالیت کو اس میں شامل کیا یا پھر انھوں نے جاگیرداروں کی ایک کثیر تعداد کے جانب سے کسانوں پر عائد کیے ہوئے رواں مطالبہ کے متعلق ایسی کثیر معلومات جو ابھی تک درجِ تحریر نہ تھیں فراہم کر کے انھیں خالصہ کے علاقوں کے مطالبہ کے لیے وزارت کے اعداد کے ساتھ، اس میں شامل کیا۔ اوّل الذکر راہ واضح، فطری اور آسان اور آخر الذکر بہت زیادہ زحمت طلب ہوگی اور مجھے

اس میں شک معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے حالات کے تحت مرتبین کو آخر الذکر طریق کار کا خیال بھی ہوگا۔ مجھے اس مسئلہ پر کوئی بلاواسطہ شہادت نہ مل سکی، لہذا یہ امر کہ شماریات کس متبادل صورت کی تائید کرتی ہیں، ایک تحقیق طلب مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔

ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ جاگیرداروں سے مطالبہ کے اعداد کو حاصل کرنا گو دشوار مگر ممکن رہا ہوگا۔ اور یہ کہ ان صوبوں میں جہاں پیمائش کا طریق کار رائج تھا، تشخیص کیے ہوئے رقبے، چند مستثنیات کو چھوڑ کر جنھیں شماریات میں بعض ذیلی تقسیموں کے سامنے خالی جگہ کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے، اسی ذریعہ سے حاصل کیے جا سکتے تھے۔ ہم مزید یہ بھی تسلیم کر سکتے ہیں کہ زمینداری کے علاقوں کے لیے اعداد حاصل کرنا ممکن ہو سکتا تھا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اعداد ان کے جانب سے ادا کیے جانے والے خراج یا ان کے اپنے کسانوں پر عائد کیے ہوئے مطالبہ میں سے کس کے ہوتے۔ ایک اور دقت جو مجھے ناقابل حل معلوم ہوتی ہے اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے یعنی مملکت کے باہر کے علاقوں کے اعداد کا حساب۔ یہ اعداد خاص طور پر صوبۂ بنگال کے تحت ملتے ہیں۔ مثلاً ہم ضلع چٹاگانگ [۱۱، ۴۰۶] جو کبھی بھی اکبر کے براہ راست یا جاگیرداروں کی وساطت سے زیر انتظام نہ تھا کی تفصیلی اعداد کی وضاحت کیوں کر کر سکتے ہیں؟ مجھے مطالبہ کے ساتھ ساتھ مقامی افواج کی تعداد شماریات میں مندرج دوسری مختلف تفصیلات کے لکھے جانے میں کوئی تک دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن یہ معاملات زیادہ اہم نہیں ہیں: میرے خیال میں مملکت کے باہر کے رقبہ کے اعداد، اس مفروضہ کے قبول کیے جانے میں کہ ہم مطالبہ کے ان گوشواروں پر بحث کر رہے ہیں جو آئین دوازدہ صوبہ، کے لیے خاص طور پر جمع کیے گئے تھے، ایک بڑی رکاوٹ پیش کرتے ہیں۔

اس کا متبادل نظریہ کہ یہاں ہمارے سامنے رواں مالیت ہے کوئی دقت نہیں پیش کرتا۔ پرانے صوبوں کے لیے یہ چوبیسویں برس قائم کی گئی مگر سن رواں تک مکمل کی ہوئی مالیت ہوگی، جب کہ نسبتاً نئے صوبوں کے لیے یہ اس مالیت کے اعداد ہوں گے جو انھیں فتح کیے جانے کے وقت قائم کی گئی تھی۔ نسبتاً پرانے صوبوں کی مثال کے طور پر، آگرہ کے متعلق اس پیرا میں جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے، ہمیں پہلے مجموعی مالیت ملتی ہے۔ اس میں ہمیں معافیوں کو بلاشک خارج کرنا ہوگا کیوں کہ جہاں معافی موجود ہوتیں، وہاں اس علاقہ کے جاگیردار کو اس کی آمدنی نہ ملا کرتی۔ یہ توقع کی جاتی تھی کہ مالیت کے کاغذات

میں وہ تفصیلات موجود ہوں گی جنھیں جاگیردار کو دیئے جانے والے دستاویزوں میں درج کرنا ضروری ہوتا اور اسے' اس کی جاگیر کے حدود میں جو معافیاں پہلے سے موجود ہوتیں' ان کی اطلاع ہونا ضروری تھی۔ اسی طور پر مقامی افواج کی تعداد سے بھی اسے مطلع ہونا ضروری تھا۔ آئین میں ان افواج کی تشکیل اور ان کی نگرانی کے متعلق کوئی ضابطے نہیں ملتے۔ اس میں بس اس قدر اطلاع ہے کہ [۱۷۵، (۱۱)] انھیں زمیندار فراہم کیا کرتے۔ انھیں طلب کرنا مقامی انتظامیہ' محصّل یا جاگیردار کا جیسی بھی صورت ہوتی کام ہوتا اور جاگیردار کے لیے اسی سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کے حدود سے واقفیت ضروری ہوا کرتی۔ ہمیں یہ تصوّر کرنا چاہیے کہ اصل کاغذات میں ہر ذیلی ضلع کے ایک ایک موضع کی نشاندہی کی گئی تھی اور یہ کہ ہمارے پاس جو اعداد ہیں وہ اصل کاغذات میں دی ہوئی پہلے ذیلی ضلع کی پھر سرکار کی' اس کے بعد صوبہ کی میزان ہے۔ ایک ایسی تحریر جس شکل میں وہ ہمارے پاس ہے ضروری تھی اور یہ ساتھ ساتھ جاگیردار کو خواہ اسے صرف موضع ملا ہو یا ایک پورا ضلع، اس کے حقوق اور ذمہ داریوں کا ایک صحیح گوشوارہ فراہم کرنے کے لیے بھی کافی تھی۔

بعد میں حاصل کیے ہوئے علاقوں کا جہاں تک تعلق ہے' 'ضمیمہ الف' میں گذر چکا ہے کہ ان صورتوں میں جہاں طریق کار تحریروں میں درج ہے' فتح کے بعد پہلا کام جاگیرداروں کے درمیان علاقوں کی تقسیم ہوا کرتی' جنھیں وہاں کے نظم و نسق کو منظم کرنا ہوتا اور یہ کہ سرسری طور پر ایک مالیت قائم کر دی جاتی تاکہ وزارتِ مال جاگیرداروں کے حسابات کو ضابطہ میں لا سکے۔ گجرات کے سلسلہ میں' ٹوڈرمل کے وہاں قیام کی مدّت' کسی تفصیلی تحقیقات کے قسم کے کسی کام کے لیے بہت مختصر تھی اور سب سے زیادہ امکانی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے پچھلی حکومت کے کاغذات کو حاصل کر کے ان کی بنیاد پر مالیت قائم کی۔ اس کا امکان ہے کہ گجرات کے لیے دیئے ہوئے اعداد' اسی ابتدائی مالیت کے رہے ہوں جسے ٹوڈرمل نے تیئیسویں برس میں ترمیم کیا تھا۔ اس صورت میں رقبہ کے اعداد' اس کی فتح کے قبل کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ رقبہ کے اعداد یہ ظاہر کرتے ہوں کہ فتح کے بعد تھوڑے عرصہ کے لیے بذریعہ پیمائش تشخیص کے طریقہ کو رائج کیا گیا تھا، گو یہ بات سرگذشتوں سے ظاہر نہیں ہوتی۔

بنگال کے جو اعداد ہمارے پاس ہیں۔ ان کی تشریح اس نظریہ پر کی جا سکتی ہے کہ

یہ بھی انھیں خطوط پر قائم کی ہوئی ایک سرسری مالیت تھی، یعنی یہ کہ وہ پچھلی حکومت کے کاغذات پر مبنی تھی جنھیں چٹاگانگ اور دوسرے وہ علاقے جن پر حال ہی اراکان کا قبضہ ہو گیا تھا، شامل تھے۔ ان اعداد کے گوشوارے میں پائی جانے والی چند انوکھی باتیں مثلاً متفرق محاصل کی بطور ایک "ذیلی تقسیم" کے شمولیت اور معافیوں کے حوالہ کی مکمل غیر موجودگی اور ذیلی تقسیموں کے ذریعہ فوجوں کی کسی تفصیل کی عدم شمولیت کی تاویل بھی اسی نظریہ کے تحت کی جا سکتی ہے۔ میرے لیے اس کا کوئی متبادل نظریہ، جس سے ان تمام خصوصی پہلوؤں کی توجیہہ ہو سکے، پیش کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اگر اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ یہ گوشوارے اپنی موجودہ حالت میں، پچھلی حکومت کے مرتب کیے ہوئے کاغذات پر مبنی تھے اور نتیجتہً اس میں وہ انوکھی باتیں نقل کی گئی ہیں جن میں مقامی رواج، نسبتاً پرانے مغل صوبوں کے رواج سے مختلف تھے، تو ان کی فطری طور پر توجیہہ ہو جاتی ہے۔ اسے ایک اس قسم کی ابتدائی مالیت تصور کرتے ہوئے، ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اسے غیر اطمینان بخش پایا گیا تھا، کیونکہ جہانگیر کے سب سے شروع کے کاموں میں سے جن کا ذکر تحریروں میں آیا ہے (تزک، ۹) ایک یہ تھا کہ اس نے مالیت پر نظرِ ثانی کی غرض سے ایک دیوان مقرر کیا۔ لیکن اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا، اس بات کا تحریروں میں ذکر نہیں ہے اور باب ۷ کی بحث سے ظاہر ہوتا ہے آئین میں مندرج اعداد میں سترہویں صدی کے وسط تک کوئی اہم تبدیلی نہ ہوئی تھی۔

خاندیش کے متعلق جیسے آئین میں 'دان دیس' کہا گیا ہے، ہم "جمع" کو (۲۴ داموں کے) برابر ٹنکوں میں پاتے ہیں [۱۱، ۴، ۷۴] اور ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ اکبر نے اسیر (گڈھ) کے قلعہ پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد ابتدائی اعداد میں ۵۰ فیصدی کا اضافہ کیا تھا۔ یہ کاروائی اس علاقہ کی تسخیر کا ایک علامتی نشان تھا۔ اس طور پر ہمارے سامنے پرانی اور نئی جمع ہے اور یہاں جو کاروائی عمل میں لائی گئی وہ واضح طور پر وہی تھی جس پر بنگال میں عمل کیے جانے کی میں نشاندہی کر چکا ہوں، یعنی یہ کہ موجودہ اعداد کو بطور بنیاد کے اختیار کیا گیا۔ یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ اکبر نے اپنی فتح کو کسانوں پر اس قدر زیادہ تناسب میں مطالبہ کو بڑھا کر شہرت دی ہوگی۔ یہ عمل، لازمتہً اس کی حکومت کے قیام میں دشواریاں پیدا کرنے والا تھا۔ لیکن اگر "جمع" کے یہاں معنی مالیت لیے جائیں تو اکبر نے جو کاروائی کی وہ یہ تھی کہ چونکہ اکبر کے پاس یہ یقین کرنے کے وجوہ تھے کہ پرانی مالیت حقیقتِ حال کو کم کر کے دکھانے والی تھی، لہذا اس نے

اس اضافہ کا حکم دیا تاکہ نئی مالیت اس آمدنی کے زیادہ قریب ہو سکے جسے اس کے جاگیردار ان وصول کرنے کی توقع رکھتے تھے۔ مثل بنگال کے، یہاں بھی معافیوں کا کوئی بھی اندراج نہیں اور گو مقامی فوجوں کی موجودگی کا ذکر آتا ہے مگر ان کا شمار نہیں دیا گیا ہے۔

"دکنیوں" یعنی پچھلے حکمرانوں نے برار کی ۳ ½ کروڑ مقامی ٹنکوں کے جمع میں اضافہ کیا تھا [آئین (۱)، ۴۰۰، ۴۰۰] اور مغلوں کی فتح کے بعد اس میں مزید اضافہ کیا گیا۔ یہاں ہمیں پچھلے عہدِ حکومت سے اعداد کے لیے جانے اور نئی حکومت کے اسے بڑھانے کی ایک اور مثال ملتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فتح کے وقت مطالبہ کے بڑھائے جانے کا عدم امکان بھی پایا جاتا ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف موجود مالیت کی درستگی ایک فطری عمل معلوم ہوتا ہے ٹٹہ (ٹھٹھہ) یا سندھ کے نچلے حصے جو خود بعد کا ایک فتح ہوا علاقہ تھا کے اعداد اس بحث پر کوئی قابلِ توجہ روشنی نہیں ڈالتے۔ لیکن بنگال، خاندیش اور برار کے متعلق فی الجملہ یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے پاس جو اعداد ہیں وہ اس مالیت کو ظاہر کرتے ہیں جو فتح کے وقت یا اس کے فوراً ہی بعد قائم کی گئی تھی اور جو پچھلی حکومتوں کے کاغذات پر مبنی تھی۔ بنگال کے متعلق ہمیں علم نہیں کہ آیا پچھلے اعداد جس طور پر تھے ویسے ہی قبول کر لیے گئے یا اسے کم و بیش کیا گیا۔ دوسرے دو صوبوں کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ شروع کے مغل حکمرانوں نے پچھلے اعداد میں اضافہ کیا تھا۔ دوسری طرف، بنگال کے اعداد کو صحیح مطالبہ کا ایک گوشوارہ نہیں تصور کیا جاسکتا اور نہ ہی خاندیش اور برار کے اعداد کو ایسا تصور کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی اسباب ہیں۔

امورِ مذکورہ بالا کی حیثیت باضابطہ ثبوت کی نہیں، لیکن میرے خیال میں ان سے اس امر کا ایک قطعی امکان پیدا ہوتا ہے کہ "آئینِ دوازدہ صوبہ" کے شماریات اس مالیت کی نقل ہے جسے وزارتِ مال اسے مرتب کیے جانے کے وقت استعمال کرتی تھی۔ اس تعبیر کے تحت کسی مؤرخ کے لیے ان کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جیسا کہ میں نے پہلے خیال کیا تھا۔ اگر انھیں کسی ایک واحد غیر متعین برس کا مطالبہ تصور کیا جائے، تو یہ دریافت کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ آیا یہ اس عہد کا ایک مثالی برس تھا یا استثنائی، لیکن اس سوال کا پورے وثوق کے ساتھ جواب نہیں دیا جاسکا ہے اور اگر انھیں مالیت تصور کیا جائے تو ان کی حیثیت ایسی اعداد کی ہوگی جن پر وزارت، نظم و نسق کے ایک بہت ہی

اہم کام کے سلسلے میں بھروسہ کرتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کے اعداد عہدِ حکومت کے شروع کی مدّت میں دو بار منسوخ کیے جا چکے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر اکبر نے صورتِ حال کی اصلاح کی غرض سے مداخلت کی تھی۔ یہ بجا طور پر تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ جو بیسویں برس نسبتاً پرانے صوبوں کے لیے قائم کی گئی تیسری مالیت کو ایمانداری سے قائم رکھے جانے کے سلسلے میں اس نے اقدامات کیے تھے۔ اور اس کے بعد کی کسی تحریر میں کسی عمومی مالیت کے دوبارہ درج نہ ہونے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اس پر موثر طریقہ سے عمل کیا گیا۔ پس نسبتاً پرانے صوبوں کے لیے مذکورہ نظریہ کے تحت، یہ اعداد اس بنا پر کہ اس سے متوقع آمدنی کی نشاندہی ہوتی تھی، انتظامیہ کے لیے کافی مفید مطلب تھے۔ بعد میں فتح کیے ہوئے صوبوں کے اعداد، کم تجربہ پر مبنی ہونے کے باعث کم قدر و قیمت کی حامل ہوں گے۔

پس میری تجویز یہ ہے کہ نسبتاً پرانے صوبوں کے لیے جو اعداد ہمارے پاس ہیں وہ اغلباً تشخیص شدہ رقبہ کے دس سالہ اوسط اور مطالبہ پر مبنی مالیت کے ہیں جو چوبیسویں برس شمار کیا گیا تھا۔ مگر اس میں اگلے برسوں کے دوران حاصل کیے گئے تجربہ کی بنا پر تفصیلی ترمیمات کی گئی تھیں، جس کے نتیجے میں وہ آئین میں شامل کیے جانے کے وقت تا تاریخ تقریباً مکمل تھا۔ مجھے صرف ایک ایسی عبارت مل سکی، جس سے یہ واضح ہو سکتا ہے کہ ترمیمات واقعتاً کی گئی تھیں، لیکن اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ طریقہ معمولات میں تھا۔ یہ بایزید کا اپنی پنشن کے سلسلے میں جھگڑے کا بیان ہے۔ جس کا حوالہ باب چار کے حاشیہ میں آچکا ہے۔ بایزید کے کام کرنے سے معذور ہو جانے پر، اکبر نے اُسے بطور پنشن، ایک پرگنہ کی معافی منظور کی جو ۱۴½ لاکھ دام کی مالیت پر درج تھا۔ وہ جب اس معاملے کو طے کرنے کی غرض سے وزارت کے دفتر پہنچا تو ٹوڈرمل نے یہ اعتراض کیا کہ اس کا ایک دوسرا طالب اس پرگنہ کے لیے سولہ لاکھ دام کی رقم قبول کر چکا ہے۔ اور اُس نے اسے بھی ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ میں اس کا مفہوم یہ سمجھتا ہوں کہ ایسی صورت میں بایزید کو درمیانی فرق خزانہ میں داخل کرنا ہوتا۔ بایزید کے انکار پر ٹوڈرمل کو غصہ آیا اور جب ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے موقف سے ہٹنے پر تیار نہ ہوا تو فتح اللہ شیرازی نے جو اس وقت امین الملک تھا مداخلت کر کے اس معاملے کو اکبر کے سامنے پیش کیا۔ اکبر نے بایزید کو یہ پرگنہ پرانی مالیت پر دیئے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ حکایت اس بات کی

جو بجائے خود قرین قیاس ہے نشاندہی کرتی ہے کہ وزارت مال کا جو بنیادی طور پر مالیات کی ذمہ دار تھی یہ طریقہ تھا کہ وہ ہر اس صورت میں جہاں موجود مالیت کے حقیقت سے کم ہونے کے اسباب پائے جاتے، اضافہ کیا کرتی تھی۔ عام طور پر ہم وزارت کے معمول کے تحت اس طریقہ کے درج تحریر ہونے کی توقع نہیں کر سکتے اور ہمیں اس واحد اندراج کے لیے اس بوڑھے محصل (بلا یزید) کے باتونی پن کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے ذاتی واقعہ کو ایک ایسی تحریر میں شامل کر دیا جو اس دور کی ایک سرگذشت کی حیثیت رکھتی تھی۔

اس مفروضہ سے کہ مالیت میں تفصیلی ترمیمات کی جاتی تھیں، شماریات کے ایک خصوصی پہلو، یعنی تحریری میزانوں اور مختلف مدوں کے جوڑ میں اختلاف کی جس پر بار بار تبصرہ کیا جا چکا ہے، توجیہہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ بعض صورتوں میں یہ کھلے ہوئے اختلافات غالباً نقل کرنے والے کی سہو کا اور بعض میں طباعت کی غلطی کا نتیجہ ہیں۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ یہ باقساط ترمیموں کا نتیجہ ہو سکتے تھے۔ ہر بار کسی موضع کے اعداد ترمیم کیے جانے پر، پرگنہ، سرکار، صوبہ، اور مملکت کی ترتیب وار میزان کو درست کرنا ایک زحمت طلب کام رہا ہوگا۔ اور کسی عہدہ دار کے ایک پوری سرکار کو بڑھی ہوئی مالیت پر قبول کرنے کی صورت میں بڑھی ہوئی رقم کو پرگنوں اور مواضعات پر تقسیم کرنا اس سے زیادہ زحمت طلب کام رہا ہوگا۔ لہذا یہ بہت ممکن ہے کہ بعض اختلافات فی الواقعی ان اصل کاغذات میں موجود رہے ہوں جن سے یہ شماریات نقل کی گئی تھیں۔

ان شماریات سے پیدا ہونے والے دلچسپ ترین مسائل میں سے ایک زمینداروں کے زیر قبضہ علاقے کے اعداد کی تشریح کا مسئلہ ہے۔ مثال کے طور پر ہم صوبہ اجمیر میں "سرکار" بیکانیر [آئین (۱)، ۵۱۲] پر غور کر سکتے ہیں۔ اس میں ۱۱ پرگنے جن کی جمع ۴۷،۵۰۰۰ دام اور یہاں کی مقامی فوج میں ۱۲،۰۰۰ سوار اور ۵۰،۰۰۰ پیادے تھے۔ پرگنوں کے نام دیئے ہوئے ہیں، لیکن ان کے اعداد نہیں، کیوں کہ سرکار دل کو واضح طور پر بطور ایک اکائی کے تصور کیا گیا ہے۔ اور فطری طور پر رقبہ کے اعداد درج نہیں ہیں میرا خیال ہے کہ ہم ان اندراجات سے بلا تردد اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ "سرکار" حقیقتاً راجہ رائے سنگھ کا جو اکبر کے اونچے عہدہ داروں میں تھا، علاقہ تھا۔ اور مقامی فوج کا اندراج اس فوج کو ظاہر کرتا تھا جسے اس نے طلب کیے جانے پر فراہم کرنے کی پابندی قبول

کی تھی۔ جمع گویا تو خراج یا ایک فرضی رقم تصور کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے بعض زمانوں میں زمیندار سالانہ خراج ادا کرتے تھے جس کی تشخیص سال کے اعتبار سے نہ ہوتی تھی بلکہ یہ باہمی قرار کے تحت پیشگی مقرر کرلی جاتی تھی اور مالیاتی نقطۂ نگاہ سے ایسے خراج کو ہم بجا طور پر مالیت تصور کر سکتے تھے کیوں کہ اس سے مستقبل کی امکانی آمدنی کا پتہ چلتا تھا۔ حالانکہ معاملہ کی نوعیت کے اعتبار سے یہ مخصوص آمدنی معمولاً سوائے زمیندار کے اور کسی کو منظور نہ کی جا سکتی تھی۔ بہرحال، مجھے کوئی ایسی چیز نہیں ملی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہو کہ اکبر واقعی میں بیکانیر یا اجمیر کے دوسرے زمینداروں سے خراج طلب کرتا تھا اور یہ ممکن ہے کہ یہ ایک بالکل فرضی عدد ہو۔

ہمیں ایسے فرضی اعداد کے مالیت ہونے کی ایک مثال، بادشاہ نامہ (۲)، ۳۶۰ میں مندرج پلاموکے زمیندار کے اطاعت قبول کرنے کے واقعے سے فراہم ہوتی ہے۔ بہار کے نائب مملکت کو اس زمیندار کو مطیع کرنے کا حکم دیا گیا اور وہ اپنی فوج کے ساتھ اس کے علاقے پر حملہ آور ہوا، بالآخر زمیندار بطور پیشکش یہ نذرانہ کے ایک لاکھ روپیہ ادا کرنے پر تیار ہو گیا اور وہ باضابطہ شاہی ملازمت پر مامور ہوکر، اس کے علاقہ کو ایک کروڑ دام مالیت پر مقرر کرکے اسے فوراً ہی جاگیر میں دے دیا گیا۔ یہاں ہم مالیت کو محض ایک برائے نام عدد تصور کر سکتے ہیں۔ زمیندار کے پاس اس کا علاقہ برقرار رہا، لیکن بجائے خود ایک مختار حکمراں کے اس کی حیثیت اب بادشاہ کے ایک جاگیردار کی ہو گئی اور رسمی پیشکش کے علاوہ اب کسی خراج کے ادا کرنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ ایک ایسا انتظام واضح طور پر اس قدر آسان تھا کہ اسے ایک عام قاعدہ تصور کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی اور کسی مثبت شہادت کی غیر موجودگی میں یہ بات بطور ایک فیصلہ طلب مسئلہ کے قائم رہتی ہے کہ آیا کسی زمیندار کے علاقے کی تحریری مالیت واقعی ادا کیا جانے والا خراج ہوا کرتا یا رسمی اطاعت قبول کرنے کی گفت وشنید کے دوران طے کی ہوئی محض ایک برائے نام رقم۔ میرا اپنا قیاس یہ ہے کہ رواج مختلف تھے اور یہ کہ بعض زمیندار خراج ادا کیا کرتے اور بعض نہیں لیکن جہاں تک عہدِ اکبری کا تعلق ہے میں اس کی سند میں واقعات پیش کرنے سے قاصر ہوں۔

زمینداروں کے علاقے ... اندراجات کی ایک اور مثال صوبۂ دہلی کے کمایوں ضلع

سے لی جا سکتی ہے۔ [آئین (۱) ۲۱، ۵] یہاں منجملہ ۲۱ پرگنوں کے پانچ کی مالیت" غیرمتعین" تھی یا بہ الفاظ دیگر زمینداروں سے کوئی بند وبست عمل میں نہ آیا تھا۔ بقیہ ۱۶ کے لیے بغیر کسی مزید تفصیل کے مالیت درج ہے۔ اور بیکانیر کی طرح یہاں بھی یہ بات ایک فیصلہ طلب مسئلہ کی حیثیت میں قائم رہتی ہے کہ آیا خراج واقعتہً ادا یا طلب کیا جاتا تھا۔ دوسرے صوبوں میں بھی اسی قسم کی اور مثالیں مل سکتی ہیں۔ لیکن مجھے ایسی صورت کا پتہ نہ چل سکا جس میں یہ تعین کے ساتھ کہا جا سکے کہ اکبر خراج وصول کرتا تھا یا نہیں۔ اور وہ واحد مسئلہ جس پر ایک معقول درجہ میں یقین کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ مندرج اعداد اس آمدنی کو ظاہر نہ کرتے جو زمینداران علاقوں سے وصول کر سکتے تھے یا بہ الفاظ دیگر یہ اس مطالبہ کی نشاندہی نہیں کرتے جو زمینداران علاقوں کے کسانوں پر عاید کیا کرتے۔

لہذا جہاں تک زیادہ اہم زمینداروں کا تعلق ہے، خراج کی ادائیگی کے مسئلہ پر عدم تیقن کے ساتھ، ہم ان شماریات کی، اس عہد کے متعلق اپنی معلومات کی روشنی میں تعبیر کر سکتے ہیں۔ بہرحال یہ مسئلہ باقی رہتا ہے کہ کیا چھوٹے زمینداروں کا سراغ لگانا جو اس زمانے میں قطعًا پائے جاتے تھے، ممکن ہے شماریات میں پرگنہ کو بطور ایک اکائی کے تصور لیا گیا ہے لہذا زمینداروں کے پتہ لگانے کی کوشش جو ایک پورے پرگنہ سے کم پر قابض ہوں کارِعبث ہوگا، لیکن مختلف قدروقیمت کی حامل کچھ ایسی علامات پائی جاتی ہیں جو اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ بعض مسلّم پرگنے زمینداروں کے قبضے میں تھے۔ اور ان علامات کی وضاحت مقامی تاریخ کے طالب علموں کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

(الف) کسی پیمائش کی ہوئی سرکار میں کسی پرگنہ کے رقبہ کے اعداد کی غیر موجودگی سے نشاندہی ہوتی ہے کہ اسے کسی سردار کے قبضے میں چھوڑ دیا گیا ہوگا لہذا اُسے بذریعہ پیمائش تشخیص کے عمل کے تحت نہ لایا گیا۔

(ب) مالیت کے کسی سالم رقم ہونے کی صورت میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس علاقے میں واقع مواضعات کے اعداد کی میزان نہیں۔ بلکہ بالمقطع قائم کی ہوئی کوئی رقم ہو سکتی ہے۔

(ج) معافیوں کے کسی اندراج کا غیر موجود ہونا بھی غیر قطعی طور پر ایسی سمت کی نشاندہی کرتا ہے یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ کسی معافی کا اندراج اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہاں کوئی زمیندار نہ تھا۔ کیوں کہ یہ مشکل ہی سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ کسی

زمیندار کے علاقہ میں معافیاں منظور کی گئی ہوں گی۔

(د) کبھی کبھی مقامی فوجوں کی ترتیب میں، دوسرے اشارے بھی پائے جاتے ہیں اور کسی قلعہ کی موجودگی کا اندراج معنی خیز ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ بغیر قلعہ کے کسی زمیندار کا تصور مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ علامات جس طور پر مفید ہو سکتی ہیں اس کی مثال کے طور پر ہم سرکار کالنجر کے پرگنہ اجے گڑھ کو لے سکتے ہیں آئین (۱)، ۴۳۰ - اس سرکار کا یہ واحد پرگنہ ہے جس کے رقبہ کے اعداد غیر موجود ہیں۔ اس کی مالیت کی ایک سالم رقم (دو لاکھ دام) ہے۔ ایسا اس سرکار میں تنہا نہیں پایا جاتا ہے۔ یہاں کوئی معافیاں نہیں ہیں اور یہاں " ایک پہاڑی پر پتھر کا قلعہ " درج ہے۔ ان واقعات سے یہ بجا طور پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں جنگلی علاقہ کا یہ ٹکڑا ایک زمیندار کے قبضے میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ جو یا تو بطور خراج کے ایک مختصر سی رقم ادا کیا کرتا تھا۔ یا اسے محض اس رقم کی مالیت کے برابر درج کر دیا گیا تھا۔ مقامی تاریخ کے طالب علم کے لیے ان اشارات میں کچھ ایسا مواد مل سکتا ہے جس کی مدد سے وہ مقامی تحریروں یا روایات کی جن کی سند بجائے خود مشتبہ ہوا کرتی ہے وضاحت یا تائید کر سکتا ہے۔

ضمیمہ س

فرہنگ

نوٹ:۔ جن الفاظ کی وضاحت اس فرہنگ میں آئی ہے انھیں یہاں اس مختصر کی ہوئی املا کے ساتھ جو متن میں استعمال کی گئی ہے درج کیا گیا ہے۔ انھیں جہاں ضرورت محسوس کی گئی ہے زیادہ صحت کے ساتھ قوسین کے اندر انگریزی زبان میں نقل کیا گیا ہے۔ جن اعداد کے بعد حرف 'C' لکھا ہے وہ مدّت کو صدیوں میں ظاہر کرتے ہیں۔

آبادی۔ یہ آباد اور کاشت کیے ہوئے علاقہ کا عام مفہوم رکھتا ہے۔ آبادی اور کاشتکاری لازم و ملزوم ہوتی ہیں اسے ایک حالت بیان کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کا بہترین ترجمہ "خوشحالی" ہوگا۔ کسی عمل پر منطبق کیے جانے پر یہ "ترقی" کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا جدید مفہوم "گاؤں کی جگہ" تحریروں میں نہیں ملتا۔ اس کا قریبی لفظ آبادانی، "ترقی" کا مفہوم رکھتا ہے۔

التمغا۔ (آلتمغا) مہر لگی ہوئی معافی۔ جہانگیر کی جاری کی ہوئی ایک خصوصی قبضہ داری (ملاحظہ ہو باب ۵، فصل ایک)

عامل۔ (عامل) ۱۳ — ۱۵ ویں صدی میں، عام طور پر ایک انتظامی عہدہ دار۔ اکبر کے بعد کے عمل گزار کی ایک بدلی ہوئی شکل میں، خالصہ کے مالگذاری کے محصل کا خصوصی مفہوم بھی رکھتا ہے۔ اس مفہوم میں کروڑی کا مرادف ہے۔ اٹھارہویں صدی میں اسے صوبہ دار یعنی انتظام عامہ کے ذمہ دار عہدہ دار کے مفہوم میں

بھی استعمال کرتے تھے۔

امین۔ ایک سرکاری عہدہ کا نام۔ شیر شاہ کے تحت غالباً پرگنہ کے دو اہم عہدہ داروں میں سے ایک (لیکن امیر کے تحت ملاحظہ ہو)۔ اکبر کے تحت، نائب مملکت کے عملہ کا ایک عہدہ دار، جس کے فرائض منصبی کی ٹھیک ٹھیک وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ سترہویں صدی میں، صوبجاتی دیوان کی ماتحتی میں مالگذاری کا ایک تشخیص کرنے والا۔ اسے بظاہر کسی عہدہ دار کے " نائب " یا " معاون " کے وسیع تر مفہوم میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

امین الملک۔ فتح اللہ شیرازی کا لقب، اسے جب اکبر نے ٹوڈرمل کی نگرانی میں مقرر کیا۔ اس کا ترجمہ " امپیریل کمشنر " کیا جا سکتا ہے۔

امیر۔ ۱۳-۱۴ ویں صدی میں امیروں کا ایک طبقہ جو 'خان' سے چھوٹا اور 'ملک' سے بڑا ہوتا تھا۔ پندرہویں صدی میں ایک صوبہ دار بھی۔ 'تاریخ شیر شاہی' کے بیلی* کے نسخہ [ایلیٹ (۴)] میں اسے پرگنہ کے ایک عہدہ دار کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لیکن جس قدر قلمی نسخے میری نظر سے گذرے ہیں ان میں میں نے 'امین' پایا ہے۔ اور میں اسے صحیح خواندگی تصور کرتا ہوں۔

بلاہر۔ ایک ہندی لفظ جو گانوں کے ادنیٰ خدمت گار کا مفہوم رکھتا ہے اس پر ضمیمہ 'ج' میں بحث آئی ہے۔

بھارا۔ غلہ کا گشتی بیوپاری۔ مرادف کارآوآنی۔

بٹائی۔ پیداوار میں شراکت بذریعہ تقسیم۔

بیگھہ۔ رقبہ کی عام اکائی۔ اس کی جسامت میں جگہ اور زمانہ دونوں اعتبار سے بہت زیادہ فرق پایا جاتا تھا۔

بسوہ۔ ایک بیگھہ کا بیسواں حصہ۔

چکلہ۔ (چکلہ)، سترہویں صدی میں، خالصہ کی زمین کے رقبہ کو جس عہدہ دار کے تحت رکھتے تھے اسے چکلہ دار کہتے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں بنگال کا ایک انتظامی رقبہ۔

---

* BAYLEY

چودھری۔ (چودھری) کسی پرگنہ کا مکھیا۔

چوتھ (چوتھ) مرہٹوں کا اس علاقہ پر مطالبہ جس میں وہ لوٹ مار کرتے مگر اپنے انتظام کے تحت نہ لاتے جو عموماً مالگذاری کا ایک چوتھائی ہوا کرتا۔

دفتر۔ کوئی تحریر۔ دفترخانہ بہ معنی محافظ خانہ۔

دام۔ اکبر کے تحت تانبہ کا ایک سکہ قیمتی تقریباً ۱/۴۰ روپیہ۔ لیکن تانبہ کی بمقدار چاندی قیمت کے اعتبار سے، اس کی قوت تبادلہ تبدیل ہوتی رہتی۔ ۱۷-۱۸ ویں صدی کی ایک اکائی کا نام (جس کی ۴۰ برابر ایک روپیہ) جس میں مالیت درج کی جاتی تھی۔ اور جس کے بمقدار تنخواہیں مقرر کی جاتیں۔ اور جاگیریں دی جاتیں۔

دستور۔ متعدد عمومی مفہوم رکھتا ہے۔ "رواج"، "اجازت"، "ایک وزیر"۔ اکبر کے تحت اور اس کے بعد تشخیصی شرحوں کا بمقدار نقد گوشوارہ۔ دستورالعمل کا مخفف۔

دیہہ۔ ایک گاؤں اپنے ہندوستانی مفہوم میں جس کا مفہوم
کے مفہوم کے قریب ہوتا ہے۔ یعنی ایک چھوٹا رقبہ جسے بطور ایک انتظامی اکائی کے تسلیم کرتے تھے جو ضروری نہیں کہ آباد ہو۔ مرادفات: موضع، قریات۔

دھارا۔ ایک مرہٹی لفظ جس کا اٹھارہویں صدی میں اطلاق مرشد قلی کی تشخیصی شرحوں پر ہوتا تھا۔

دھرم۔ ہندوؤں کا مقدس قانون۔ جو بہ شمول بادشاہ ہر طبقے کے فرائض متعین کرتا تھا اور جو نظری طور پر تبدیل نہ کیا جا سکتا تھا۔

دیوان۔ دیوانی۔ ان پر تمہید میں بحث آ چکی ہے۔ ۱۳-۱۴ ویں صدی میں دیوان کے معنی وزارت۔ سولھویں صدی میں (۱) وزیر مال (۲) کسی امیر کا داروغہ۔ سترہویں صدی میں (۱) وزارت مال کا کوئی اونچا عہدہ دار۔ اور (۲) صوبہ جاتی عہدہ دار مال۔ سولھویں صدی میں دیوانی کے معنی وزارتِ مال، سترہویں صدی میں اور اس کے بعد مالگذاری اور مالیات کا پورا نظم و نسق۔ اور انیسویں صدی میں دیوانی کی عدالتیں۔

دوآب۔ دو دریاؤں خصوصاً گنگا اور جمنا کے درمیان واقع علاقہ (ملاحظہ ہو باب ۲ فصل ایک)

فرمان۔ شہنشاہ یا بادشاہ کا جاری کیا ہوا کوئی باضابطہ حکم۔

فوتوٰی۔ اسلامی فقہ کے کسی مسئلے پر کسی ماہر قانون کی ظاہر کی ہوئی رائے۔

فوجدار۔ چودھویں صدی میں ایک فوجی افسر، جو کسی فوجی جماعت کے سپہ سالار کے تقریباً مماثل اور سپہ سالار اعظم کا براہِ راست ماتحت ہوتا ہے۔ ۱۶-۱۸ ویں صدی کے دوران کسی صوبہ کے ایک جزو کے نظم و نسق کا ذمہ دار عہدہ دار۔ اس کا معمولاً مالی نظم و نسق سے تعلق نہ ہوتا۔ لیکن اٹھارہویں صدی میں کبھی کبھی ایک ہی افسر دیوان اور فوجدار دونوں ہوا کرتا۔

فوجداری۔ کسی فوجدار کا عہدہ یا منصب۔ سترہویں صدی سے مالی نظم و نسق سے علیحدہ انتظام عامہ بھی۔ لہٰذا بعد کے زمانے میں دیوانی سے علیحدہ فوجداری کے حدودِ اختیار۔

فواضل۔ (فواَزل) ۱۳-۱۴ ویں صدی کے دوران، مالگذاری کی وہ فاضل رقم جسے صوبیدار کو منظور شدہ اخراجات کی منہائی کے بعد خزانہ میں داخل کرنا ہوتا تھا۔

گریم۔ پرتگالی لفظ گراؤ کی انگریزی بنائی ہوئی ایک شکل، ایک دال (CICER ARIETINUM)

گماشتہ۔ ایک مددگار یا ماتحت۔ آئین میں اس کا ان ماتحتوں پر اطلاق کیا گیا ہے۔ جنھیں خالصہ زمینوں کے محصلین ملازم رکھتے تھے۔

گنجائش۔ "حجم"، "سمائی"۔ اس کا اصطلاحی مفہوم غیر واضح ہے اس پر باب ۵ فصل ۲ میں بحث آئی ہے۔

حاکم۔ یہ کسی معین عہدے کا نام نہیں ہے بلکہ اسے کسی اونچے انتظامی عہدے دار مثلاً کسی صوبے کے نائب مملکت یا اس سے چھوٹے علاقے کے صوبے دار کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔

حق۔ ۱۳-۱۴ ویں صدی کے دوران اس کے عام مفہوموں حق، انصاف، سچائی وغیرہ کے علاوہ وہ دستوریاں جو سرداروں کو مالگذاری سے مستثنیٰ زمینوں کی شکل میں منظور کی جاتی تھیں۔

حق شرب۔ اسلامی قانون کی ایک اصطلاح جس سے مراد اس شخص کا حق ہوتا جو آبپاشی کے لیے پانی فراہم کرتا۔

حاصل۔ اس پر ضمیمہ 'الف' میں بحث آچکی ہے۔ بعض اوقات، سیاق کے اعتبار سے

بہ معنی پیداوار یا مطالبہ کے محصول کے مرادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ سولہویں صدی سے اس کے معنی معمولاً مالیت کے بالمقابل آمدنی کے ہوتے ہیں۔

حوالی۔ مضافات۔ لیکن ۱۳-۱۴ ویں صدی میں حوالی دہلی سے جمنا کے مغرب کا ایک متعین انتظامی علاقہ کا مفہوم تھا۔

ہندو۔ معمولاً یہ ایک عام مفہوم رکھتا ہے۔ لیکن برنی (۱۴ صدی) میں یہ ہندوؤں کے دیہی اشراف طبقہ یا عام کسانوں سے بالاتر طبقہ کے محدود مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

ہندوستان۔ ۱۳-۱۴ ویں صدی کے دوران مسلم طاقت کے مرکز کے مشرق یا جنوب میں واقع علاقہ۔ چودھویں صدی میں معمولاً گنگا کے دوسرے سمت کا علاقہ، سولہویں صدی میں دریائے نربدا کے شمال کا ہندوستان۔

اجارہ۔ ۱۶-۱۸ ویں صدی کے دوران مالگذاری کا ٹھیکہ۔ 'فارمر'، کو معمولاً اجارہ دار کہتے ہیں اور مستاجر بھی۔

انعام۔ صلہ۔ اس کا اطلاق خاص طور پر بادشاہ کے دیئے ہوئے عطیات پر ہوتا ہے۔ خواہ یہ ایک رقم کی، یا ایک نقدی وظیفہ کی، یا مالگذاری کی معافی کی شکل میں ہو۔ سترہویں صدی میں عام طور پر کسی اونچے عہدہ دار کو اس کی جاگیر میں اضافہ کے طور پر دی ہوئی مالگذاری کی معافی۔

اقطاع۔ مالگذاری کا عطیہ، مرادفات، 'جاگیر' 'یتول'، ۱۳-۱۴ صدی میں ایک صوبہ بھی۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ 'ب'۔

اقطاع دار۔ جاگیردار، (صوبہ دار جسے مقطی کہتے تھے، کے مفہوم میں نہ استعمال ہوتا تھا۔

جاگیر۔ مالگذاری کا عطیہ، مرادفات، 'اقطاع'، 'یتول'۔

جمع۔ (عربی میں جَمعُ، اردو میں جَمَع) AGGREGATE ضمیمہ 'الف' میں بحث آچکی ہے (۱) حسابات میں آمد کا خانہ (۲) مالگذاری میں مطالبہ یا مالیت سیاق کے اعتبار سے۔ 'فقرہ جمع دہ سالہ' پر ضمیمہ 'ذ' میں بحث آئی ہے۔

جریب۔ زمین کا ایک ناپ اور پیمائش کرنے کا آلہ بھی۔ سولہویں صدی میں ناپ کے

ء FARMER

ذریعہ تشخیص کے مفہوم میں پیمائش کے مرادف کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

جزیہ۔ اسلامی قانون کے تحت غیر مسلم رعایا پر عائد کیا ہوا شخصی محصول۔

جوار۔ ایک قسم کا ملٹ (MILLET) (ANDROPOGN SORGHUM)

کاروانیان۔ برنی کے گشتی تاجران کے مفہوم میں استعمال کیا ہے عام طور پر بنجارے پکارے جاتے تھے۔

کارکن۔ لفظاً گماشتہ یا نمائندہ، سولہویں صدی سے اس کے معنی معمولاً 'محرر' 'کاتب' تھے۔ بعض ۱۳-۱۴ ویں صدی کی عبارتوں میں بھی یہی مفہوم ملتا ہے، لیکن ان کا استعمال اس قدر کم ہوا ہے کہ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لفظ اس زمانہ تک اس مفہوم میں مخصوص ہو چکا تھا۔

خالصہ۔ (خالصہ) افراد کو جاگیر یا معافی میں دی ہوئی زمین کے بالمقابل حکومت کے لیے مخصوص کی ہوئی زمین۔

خراج۔ (خراج، ضمیمہ 'الف' میں بحث آچکی ہے۔ اسلامی قانون کا ان غیر مسلموں پر عائد کیا ہوا 'باج'، جنھیں فتح کیے ہوئے علاقہ پر قابض رہنے دیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں مالگذاری کا مطالبہ، خراجی۔ بمقابلہ عشر (دسواں حصہ) ادا کرنے والے علاقے کے وہ علاقہ جو خراج کی ادائیگی کا مستوجب ہو۔

خریف۔ برسات کا موسم اور اس میں اگائی ہوئی فصل۔

خدمتی۔ کسی چھوٹے کا بڑے کو دیا ہوا تحفہ۔

خوط۔ اس پر ضمیمہ 'ج' میں بحث آچکی ہے۔ اسے صرف برنی نے زمینداروں کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

خواجہ۔ معمولاً ایک اعزازی لقب، تیرہویں صدی میں کسی صوبے کے عملہ کا عہدہ دار جن کے فرائض منصبی وضاحت سے درج نہیں ہیں۔

کروہ۔ فاصلہ کا ایک ناپ تقریباً ۱½ میل کے برابر۔

کرور۔ دس ملین (۱۰۰ لاکھ)۔

کروری۔ سولہویں صدی میں خالصہ کی مالگذاری کے محصل کا معروف لقب جسے سرکاری طور پر عمل گزار کہتے تھے۔ سترہویں صدی میں سرکاری طور پر اس کے اور نیسز

جاگیردار کے اپنے رکھے ہوئے محصل کے مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔

لاکھ۔ ایک سو ہزار۔

مددمعاش۔ گذر اوقات کے لیے زمین کی معافی۔

محال۔ اکبر کے تحت سرکار کی ایک مالی تقسیم جو ہمیشہ تو نہیں مگر معمولاً پرگنہ کے مطابق ہوتی تھی اور اس کا کبھی کبھی متفرق محاصل کی ایک مکر پر بھی اطلاق ہوتا تھا۔ اس کی موجودہ شکل 'محال'، اٹھارہویں صدی کے قبل نہیں ملتی۔

محصول۔ اس پر ضمیمہ 'الف'، میں بحث آئی ہے۔ اس کے معنی سیاق کے اعتبار سے پیداوار یا مطالبہ کے ہو سکتے ہیں۔ سولہویں صدی میں سرکاری دستاویزات اور نیز بغرض تشخیص نکالی ہوئی اوسط پیداوار۔

مال۔ اس پر ضمیمہ 'الف'، میں بحث آئی ہے۔ اس کا عام مفہوم 'جائداد'، یا 'مقبوضات' ہوتا ہے۔ زرعی معاملوں میں اس کے معنی معمولاً مطالبہ کے ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات اس کا مالی نظم و نسق کا وسیع تر مفہوم ہوتا ہے۔ فوج میں اس سے مراد جنگ میں حاصل کیا ہوا مالِ غنیمت۔

مَلِک۔ ۱۳-۱۴ ویں صدی میں اشراف کا ایک طبقہ جو امیر سے کمتر ہوا کرتا۔ اس کے بعد زیادہ غیر واضح طور پر استعمال کیا جانے والا ایک اعزازی لقب تھا۔

مالِک۔ شہنشاہیت یا مملکت کا عمومی مفہوم رکھتا ہے۔ اسلامی قانون میں اس کا اطلاق زمین کے قابض پر ہوتا تھا۔ اورنگ زیب کے ایک فرمان میں کسان کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

مالکانہ۔ برطانوی عہد میں کسی بے دخل کیے ہوئے زمیندار یا حق دار کو دیا ہوا گذارہ۔

مساحت۔ پیمائش، سروے*۔ چودھویں صدی میں اس سے مراد پیمائش کے ذریعے تشخیص کا عمل تھا جسے بعد کے زمانہ میں 'جریب'، یا پیمائش کہنے لگے۔

ماشہ۔ ۱۵ گرین کا ایک ہندوستانی وزن۔

مانڈ ** من کی انگریزی بنائی ہوئی ایک شکل۔ ۴۰ سیر کے برابر وزن کی ایک اکائی۔

MAUND ** SURVEY *

اس وزن کی جسامت وقت اور جگہ کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہتی۔

موضع۔ (موضع) تیرہویں صدی میں عموماً کسی جگہ یا مقام کے وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا تھا اس کے بعد سے ایک گانوں (ہندوستانی مفہوم میں) مراد ہوا۔ دیہہ کا مرادف،

ملک۔ معاش کی معافی جو دینے والے کی مرضی پر ختم کی جاسکتی ہو۔

موٹھ۔ (موٹھ) ایک قسم کی دال۔ (PHASEOLUS ACONITIFOLIUS)

محاسبہ۔ کسی سرکاری ملازم کے حسابات کی جانچ۔

محصل۔ (محصّل) اشتقاقاً 'جمع کرنے والا': چودھویں صدی میں کسی زمیندار کے علاقہ میں بادشاہ کی جانب سے مقرر کیا ہوا عہدہ دار جس کے فرائض غیر متعین ہوتے۔

مقدم۔ ۱۳-۱۴ ویں صدی میں بعض اوقات ایک سربرآوردہ یا ممتاز شخص۔ بعض اوقات مخصوص طور پر موضع کا مکھیا۔ سولہویں صدی سے آخرالذکر استعمال کا غلبہ ہے۔

مقاسمہ۔ اسلامی قانون میں قبضہ کے بالمقابل پیداوار پر تشخیص (آخرالذکر کو موظف کہتے ہیں ملاحظہ ہو ظیفہ)۔

مقطی۔ اس پر ضمیمہ 'ب' میں بحث آئی ہے۔ ۱۳-۱۴ ویں صدی میں ایک صوبے دار۔ یہ مفہوم سولہویں صدی تک متروک ہوگیا۔

مقطعی۔ (مقطعیئ) یہ لفظ صرف ایک عبارت [آیئن (۱)، ۲۹۶] میں ملتا ہے۔ اور اس کے معنی غیر یقینی ہیں۔ اس سے اجارہ یا جاگیر کی نشاندہی ہوسکتی ہے۔

مشاہدہ۔ اس پر ضمیمہ 'ج' میں بحث آئی ہے۔ جہاں میں نے اس لفظ کی تعبیر بٹائی بذریعہ تخمینہ کے طور پر کی ہے۔ جس کا ہندی مرادف کنکوت ہے۔ چودھویں صدی کے بعد نہیں ملتا۔

مطالبہ۔ اس پر ضمیمہ 'الف' میں بحث آئی ہے۔ اسے شروع میں طلب کرنے یا وصول کرنے کے عمل کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے۔ سترہویں صدی سے اس کا مفہوم مطالبۂ مالگذاری کی مقدار ہوسکتا ہے۔

متصرّف۔ ادنیٰ ملازمین سرکار۔ مجھے اس میں شک ہے کہ آیا اس سے مراد کوئی مخصوص سرکاری ملازم ہے یا سرکاری ملازموں کا ایک طبقہ۔

نائب۔ نمائندہ۔ ۱۳-۱۴ ویں صدی میں اس سے مراد وہ عہدہ دار ہوا کرتا جو کسی صوبہ میں

صوبے دار کے فرائض کو انجام دینے کے لیے اس صورت میں بھیجا جاتا جب صوبے دار کے پاس کوئی درباری عہدہ بھی ہوتا یا وہ کسی دوسرے کام پر معمور ہوتا۔

نسق۔ ضمیمہ 'د' میں بحث آئی ہے۔ عام مفہوم 'ضابطہ' یا 'انتظام حکومت' ہے۔ اکبر کے تحت اس کا اطلاق مالی انتظام کی ایک خاص شکل پر ہوتا تھا۔ جسے میں اجتماعی تشخیص کہتا ہوں حالانکہ اس میں اجارہ داری بھی شامل ہوسکتی تھی۔

پیمائش۔ ناپنا، سولھویں صدی میں اس سے بذریعہ پیمائش تشخیص کرنے کا عمل بطور جریب کے مرادف کے مراد تھا۔

پرگنہ۔ مواضعات کے ایک مجموعہ کا ہندوستانی نام۔ یہ چودھویں صدی میں قصبہ کو جزوی طور پر بے دخل کرنے کے بعد مسلمانوں کے یہاں سرکاری طور پر استعمال ہونا شروع ہوا۔

پٹہ۔ (پٹا) (LEASE) کی مالگذاری ادا کرنے والے کو دیا ہوا دستاویز جس میں اس پر واجب الادا رقم درج ہوتی۔

پٹواری۔ (پٹوآری) گانوں کا محاسب۔ ایک ہندی لفظ جسے مسلمانوں نے اپنے نظم ونسق میں شروع ہی سے اختیار کر لیا۔

قبولیت۔ ادائے مالگذاری کے لیے دیا ہوا تحریری اقرار۔ پٹہ کا جواب۔

قانون گو۔ پرگنہ کا محاسب اور رجسٹرار۔ یہ عہدہ ہندو عہد میں قطعاً موجود تھا۔ لیکن اس کا ہندی نام سرگذشتوں میں کہیں نہیں ملتا۔ ۱۳-۱۴ ویں صدی میں لفظ قانون نے "ضابطہ" کا موجودہ مفہوم حاصل نہ کیا تھا۔ بلکہ اس سے "دستور" یا 'رواج' مراد تھا۔ ہمیں قانون گو سے قانون کی تشریح کرنے والا نہیں بلکہ رسم ورواج کا تشریح کرنے والا "سمجھنا چاہیے۔ یعنی اس سے وہ شخص مراد تھا جس سے مسلم انتظامی عہدہ داران اپنی ہندو رعایا کے رسم ورواج کے متعلق معلومات حاصل کرتے تھے۔

قریات۔ گانوں۔ دیہہ کا مرادف۔

قصبہ۔ قصبہ اس کا "ٹاؤن" کا موجودہ مفہوم سرگذشتوں میں نہیں ملتا۔ بالکل شروع

TOWN *

کے مصنفین، قصبہ کو پرگنہ کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے۔ عفیف اور اس کے بعد سے پرگنہ کو ایک فارسی لفظ کے طور پر اختیار کر لیا گیا۔ لیکن قصبہ کبھی کبھی اس کے مرادف کے طور پر برقرار رہا۔

قاضی۔ (قاضی) اسلامی نظام میں ایک عہدہ دار جس کے خاص فرائض عدالتی لیکن (کبھی کبھی) انتظامی بھی ہوا کرتے، اس کا کوئی انگریزی مرادف نہیں ہے۔ لیکن مغلیہ عہد میں قاضی کو صوبے دار کا عدالتی مددگار کہا جا سکتا تھا۔

قسمت غلّہ۔ (... غلہ) غلہ کی تقسیم سولہویں صدی میں تشخیص بذریعہ بٹائی کا ایک نام۔

ربیع۔ ہندوستان میں موسمِ سرما میں بوئی ہوئی اور موسم بہار میں کاٹی ہوئی فصل۔

رائے۔ راجہ، رانا، راؤ۔ بادشاہ یا زمیندار کے لیے خواہ وہ خود مختار ہو، خواہ مسلم بادشاہ کو خراج یا مالگذاری ادا کرنے والا، ہندی اصطلاحیں۔

رقمی۔ اکبر کی قائم کی ہوئی پہلی مالیت کا نام جیسا کہ ضمیمہ 'ذ' میں گذر چکا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم غیر واضح ہے۔

ریع۔ سولہویں صدی میں تشخیص کے مقصد سے پیداواری شرحوں کا تیار کیا ہوا گوشوارہ جس میں مطالبہ کو بمقدار پیداوار دکھاتے تھے۔ یہ نقد تشخیصی شرحوں کے مفہوم میں اب بھی مقامی طور پر بنارس میں باقی ہیں۔

۔ (رعیت کی انگریزی بنائی شکل) اشخاص کا گروہ، کسانوں کی جماعت۔ اسے سرگذشتوں میں ایک منفرد کسان کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہوا نہیں پایا جاتا اس کا ایک مخصوص شکل کی قبضہ داری (رعیت واڑی) کے مفہوم میں استعمال' کلیتہً برطانوی عہد سے متعلق ہے۔

صدر۔ (صدر) عہد مغلیہ میں ایک اونچے عہدہ دار کا لقب جس کے فرائض میں معافیوں کی نگرانی شامل تھی (ملاحظہ ہو بلاکمین کے اپنے آئین (۱)' ۲۷۰ وصفحات مابعد کے ترجمہ میں عہدِ اکبری کے صدروں کے متعلق یادداشت)۔

سلامی۔ کسی عہدہ دار کے سامنے حاضر ہونے کے وقت پیش کی ہوئی نذر۔

سرکار۔ سرگذشتوں میں اس کے معنی معمولاً بادشاہ یا کسی امیر کے خزانے کے ہیں شیر شاہ کے تحت اس سے مراد ایک انتظامی ضلع یعنی پرگنوں کا ایک مجموعہ تھا اور اکبر کے

تحت ایک مالی ضلع۔اس کا "حکومت" کا موجودہ مفہوم سرگذشتوں میں واضح طور پر نہیں ملتا۔

سیر۔ وزن کی اکائی جو ایک من کے چالیسویں حصے کے برابر ہوتی ہے من کی طرح وقت اور علاقہ کے ساتھ اس کی جسامت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

شق۔ قسمت۔شروع میں بظاہر ایک فوجی اصطلاح۔کسی مہم پر مامور لشکر کو پہلے بڑے حصوں (فوج) میں اور پھر انھیں چھوٹے حصوں (شق) میں تقسیم کرتے تھے۔ چودہویں صدی میں ایک انتظامی اکائی خواہ وہ ایک صوبہ ہو یا کسی صوبہ کی قسمت (ملاحظہ ہو باب ۲ فصل ایک) پندرہویں صدی میں ایک صوبہ۔اس کے بعد کے زمانے میں اس مفہوم میں استعمال نہ ہوا کرتا۔

شق دار۔ شروع میں ایک فوجی منصب (ملاحظہ ہو شق) بعد میں شعبۂ مال کا ایک ماتحت ملازم شیر شاہ کے تحت پرگنہ کے عملہ کا ایک عہدہ دار۔اور نیز جاگیردار کا ملازم رکھا ہوا مالگذاری کا وصول کرنے والا۔یہ اصلاح اٹھارہویں صدی میں شعبۂ مال کے مفہوم میں جو معمولاً جاگیردار کا نوکر ہوتا، برقرار رہی۔

صوبہ۔ مغلیہ عہد میں سلطنت کا ایک صوبہ۔

سیورغال۔ (سیوُرغاَل) مغلیہ عہد میں بادشاہ کے منظور کیے ہوئے گذارے۔خواہ وہ نقد ادا کیے جائیں خواہ زمین کی معافیوں کے ذریعہ۔

تفریق۔ اجتماعی تشخیص کے ذریعے قائم کیے ہوئے مطالبہ کی جماعت کے افراد پر تقسیم۔

تعلق۔ (تعلق)۔ ماتحت علاقہ۔سترہویں صدی کے خاتمہ پر (ملاحظہ ہو باب ۵ فصل ۵) زمین پر قبضہ کے مفہوم میں، خواہ جو بھی استحقاق ہو' استعمال شروع ہوا۔برطانوی عہد میں اس کا استعمال خاص حقوق کے مفہوم میں جو مختلف صوبوں میں مختلف ہوا کرتے مخصوص ہوگیا۔تعلقہ دار سے کسی تعلق پر قابض شخص مراد ہوتا ہے۔

ٹنکہ۔ ۱۳-۱۴ ویں صدیوں میں رقم کی خاص اکائی (ملاحظہ ہو طامس 'CHRONICLES OF THE PATHAN KING OF DELHI' جس میں اس اکائی پر تفصیلی بحث آئی ہے)

تیول۔ مالگذاری کی جاگیر۔مرادفات جاگیر۔اقطاع۔

عُشر۔ اسلامی قانون کے تحت عائد کیا ہوا دسواں حصّہ۔خراجی کے بالمقابل عُشری سے مراد وہ علاقہ جو دسویں حصے کی ادائیگی کا مستوجب ہوتا ہے۔

وکیل۔ ۱۳-۱۴ ویں صدی میں وکیل در دہلی دربار کا سب سے اونچا رسمی عہدہ تھا۔ مغلیہ عہد میں وکیل وزیر اعظم، اور وزیر سے بڑا ہوا کرتا۔ لیکن اس عہدے پر ہمیشہ تقرری نہ کی جاتی اور اس کے خالی رہنے کی صورت میں وزیر عملاً وزیر اعظم ہوتا۔

وزیر۔ ۱۳-۱۴ ویں صدیوں میں وزیر اعظم کا مرادف جو معمولاً مال اور مالیات کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوا کرتا۔ مغلیہ عہد میں جب کوئی وکیل (حوالہ سابقہ) رہتا تو وزیر (اعظم) مالی اور مالیاتی وزیر رہتا۔ اور اسے بعض اوقات دیوان کہتے۔ اور جب کوئی وکیل نہ ہوتا تو وزیر (اعظم) کے سپرد انتظام عامّہ اور نیز مالی نظم و نسق ہوتا وزارت سے مراد وزیر کا عہدہ ہوتا ہے۔

وفا۔ لفظاً: اعتماد، بھروسہ، ۱۴-۱۵ ویں صدی میں فصل کی پیداوار کے اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ 'ج'۔

والی۔ معمولاً صوبے دار (ملاحظہ ہو ضمیمہ 'ب')، بعض اوقات کسی غیر ملک کا حکمراں۔

وظیفہ۔ اسلامی قانون میں اس کا مفہوم، زمین پر قبضہ کے لیے معیادی ادائیگی ہوتی ہے اور اس سے جو ماخوذ لفظ 'موظّف'، قبضہ پر تشخیص یا میں جیسے ٹھیکہ اراضی داری کہتا ہوں کو ظاہر کرتا ہے (ملاحظہ ہو باب ۵ فصل ۳)۔ سرگذشتوں میں وظیفہ سے معمولاً بادشاہ کا خیرات کے طور پر ازراہ ترحم منظور کیا ہوا نقدی گذارہ مراد ہوتا ہے۔ یہ زمین یا مالگذاری کی معافی (مِلک یا مدد معاش) سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کا کبھی کبھی اطلاق مالگذاری کی معافی پر ہوتا ہے۔

ولایت۔ عام طور پر ۱۳-۱۴ ویں صدیوں میں کسی والی کے تحت ایک صوبہ (ملاحظہ ہو ضمیمہ 'ب')، لیکن اس کے معنی (۱) بادشاہت (۲) کوئی علاقہ یا خطہ، (۳) ایک غیر ملک (۴) کسی غیر ملکی کا وطن بھی ہو سکتے ہیں۔ مغلیہ عہد میں "صوبہ" کا مفہوم عملاً ختم ہو گیا تھا۔

ویران۔ اجڑا ہوا۔ اس کا اطلاق ایسے موضع پر ہوا کرتا جو ویران اور غیر مزروعہ ہو۔

ضبط۔ ضمیمہ 'د' میں بحث آئی ہے۔ اکبر کے عہد میں بذریعہ پیمائش تشخیص کا نظام

اس پر اس وقت جس طرح عمل ہوا کرتا۔ اس کی صفت ضبطی کو اس علاقہ کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے، جہاں یہ طریقہ رائج ہو۔ بعد کے دنوں میں ضبطی سے مراد مالگذاری یا لگان کی وہ شرحیں تھیں جو زیرِ تخم رقبہ پر عائد کی جاتیں اور جو پیداوار کے اعتبار سے تبدیل ہوا کرتیں۔

زمیندار۔ لفظاً: زمین پر قابض۔ اس لفظ سے لازمتہً کسی خاص دعوے یا حق کا مفہوم نہ ہوا کرتا اور اٹھارہویں صدی میں اسے بنگال میں کسی بھی قسم کے قابض کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے (ملاحظہ ہو باب ۷ فصل ۲)۔ شمالی ہندوستان کی تحریروں میں چودھویں صدی اور اس کے بعد سے اس کے وہ معنی تھے جسے میں سردار کہتا ہوں۔ یعنی زمین کا قابض جس کا حق یا دعویٰ مسلم حکومت سے قبل کا ہو۔ یعنی عام طور پر کوئی راجہ، راؤ یا کوئی دوسرا ہندو بادشاہ یا سابقہ بادشاہ جو مسلم ریاست کا باجگذار بن چکا ہو۔ کبھی کبھی اس کا اطلاق ایسے حکمرانوں پر بھی ہوا کرتا جو باجگذار نہ بنتے تھے۔

ضمیمہ ش

فہرست مآخذ

نوٹ۔ اس فہرست میں موضوع متعلقہ پر ایک مکمل کتابیات لکھنا مقصود نہیں، بلکہ اسے صرف ان مآخذ تک محدود رکھا گیا ہے جن کو مجھے ان کے مختصر ناموں سے قلم بند کرنا آسان معلوم ہوا۔ دوسری تصنیفوں کو جن کا حوالہ بہت کم آیا ہے، متن یا حاشیہ میں مکمل طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

ابو یوسف۔ ابو یوسف یعقوب۔ 'کتاب الخراج'۔ مترجمہ E. FAGNAN، پیرس، ۱۹۲۱ء۔

ایڈ (ADD) ایڈیشنل۔ برٹش میوزیم میں مخطوطات کے ایک سلسلہ کا مسلّمہ نام۔ اس لفظ کے بعد جو عدد آتا ہے وہ ریو (RIEU) کے کیٹیلاگ یا بعد کے اضافوں کی فہرست میں اس مخصوص مخطوطہ کا عدد ہے۔

عفیف۔ شمس سراج عفیف۔ 'تاریخ فیروز شاہی'۔ ببلیوتھیکا انڈیکا، ایلیٹ (۳)، ۲۶۹ میں اس کے جزو کا ترجمہ۔

آئین۔ شیخ ابوالفضل علامی، 'آئینِ اکبری'، ببلیوتھیکا انڈیکا۔ میں نے جن مخطوطات کو استعمال کیا ہے ان کی تفصیل ضمیمہ 'ذ' میں درج ہے۔ بلاکمین اور جیرٹ کا ترجمہ، ببلیوتھیکا انڈیکا۔

آئینگر۔ ایس۔ کرشنا سوامی آئینگر، ANCIENT INDIA، لندن اور مدراس، ۱۹۱۱ء۔

اکبر نامہ۔ شیخ ابوالفضل علامی، اکبر نامہ، ببلیوتھیکا انڈیکا۔ مترجمہ بیورج، ببلیوتھیکا انڈیکا۔

ارتھ شاستر۔ کوٹلیہ کا ارتھ شاستر، مترجمہ آر۔ شاما شاستری، طبع دوئم، میسور، ۱۹۲۳ء۔

بابر نامہ۔ شہنشاہ بابر۔ بابر نامہ مترجمہ اے۔ ایس۔ بیورج، لندن ۱۹۲۱ء۔

بدایونی۔ عبدالقادر البدایونی، منتخبات التواریخ، ببلیوتھیکا انڈیکا۔ مترجمہ رینکنؔ اور لوؔ، ببلیوتھیکا انڈیکا میں۔

بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری، بادشاہ نامہ، ببلیوتھیکا انڈیکا، ایلیٹ (۷)، ۳ میں جزوی ترجمہ

برنی۔ ضیاءالدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ببلیوتھیکا انڈیکا۔ میں نے اورنٹیل ۲۰۳۹ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ایلیٹ (۳) ۹۳ میں جزوی ترجمہ۔

بایزید۔ بایزید سلطان، تاریخ ہمایوں، انڈیا آفس میں قلمی نسخہ (ایتھے ۲۲۳)۔ مخطوطہ، ترجمہ ارسکائنؔ، ایڈ ۲۶۶۱۰۔

بیلے۔ سرای۔ سی۔ بیلےؔ THE LOCAL MUHAMMADAN DYNASTIES, GUJRAT. لندن ۱۸۸۶ء۔

برنیر۔ فرانکو آئس برنیر، 'TRAVELS IN THE MUGHAL EMPIRE' ترجمہ، مطبوعہ کانسٹیبل لندن ۱۸۹۱ء۔

ببل انڈ (BIBL. IND.) ببلیوتھیکا انڈیکا۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کو جاری کی ہوئی کتاب کی اصل عبارتوں اور ترجموں کے سلسلوں کا عام عنوان۔

بلاکمین۔ آئینِ جلد ایک کا ایچ۔ بلاکمین کا کیا ہوا ترجمہ (جس کا حوالہ گذر چکا ہے)۔

کیمبرج ہسٹری۔ دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد ۳، مطبوعہ سر ولزلے ہیگ کیمبرج، ۱۹۲۸ء۔

دہلی رکارڈس۔ پنجاب گورنمنٹ رکارڈس، جلد ایک، 'DELHI RESIDENCY & AGENCY' ۱۸۰۵ء ۵۷ء، لاہور، ۱۹۱۱۔

ڈنکن رکارڈس۔ اے۔ شیکسپیرؔ 'SELECTIONS FROM THE DUNCAN RECORDS' بنارس ۱۸۷۳ء

آرلی انیلز۔ سی۔ آر۔ ولسن "EARLY ANNALS OF THE ENGLISH IN BENGAL" کلکتہ ۱۸۹۵۔۱۹۱۷ء۔

E.C. BAYLEY ** ERSKINE * LOWE ** RENKIN *

ارلی ٹریولس۔ 'EARLY TRAVELS IN INDIA' ۱۵۸۳ - ۱۶۱۹ء مطبوعہ ڈبلو فوسٹر لندن ۱۹۲۱ء

ایلیٹ - 'THE HISTORY OF INDIA AS TOLD BY ITS OWN HISTORIANS'

سر اینچ - ایلیٹ کی وفات کے بعد ان کے کاغذات سے مطبوعہ' جے - ڈاؤسن

لندن ۱۸۶۷-۷۷ء

فرشتہ - محمد قاسم فرشتہ، 'تاریخ فرشتہ' لیتھو متن، کانپور ۱۸۷۳ء 'ترجمہ زیر عنوان

'HISTORY OF THE RISE OF THE MAHOMEDAN POWER IN INDIA TILL

THE YEAR A-D.1612' از جے - برگس* لندن ۱۸۲۹ء

فرمنگر - 'THE FIFTH REPORT FROM THE SELECT COMMITTEE OF THE HOUSE

OF COMMONS ON THE AFFAIRS OF THE EAST INDIA COMPANY'

مطبوعہ وینربل** ڈبلو - کے - فرمنگر، کلکتہ، ۱۹۱۷ء

فتوحات - سلطان فیروز شاہ 'فتوحات فیروز شاہی' مخطوطہ اورینٹل ۲۰۳۹، ایلیٹ (۳) ،

۳۷۴ میں ترجمہ -

گجرات رپورٹ - ۱۶۳۰ء کے قبل کی گجرات کی منڈیوں پر ولندیزی قلمی رپورٹ - ہیگ کے

محافظ خانہ میں ڈبلو، لیگنس، ڈی، یانگ کے کلکشن کا نمبر ۲۸ - متن کو اب لنشوٹن

سوسائٹی نے زیر عنوان 'DE REMONSTRANFIE VAN W.GELEYNSSEN

DE. JONG' ہیگ ۱۹۲۹ء جاری کیا ہے -

گلبدن - گلبدن بیگم، ہسٹری آف ہمایوں، متن مع ترجمہ از اے - ایس - بیورج لندن ۱۹۰۲ء

ابن بطوطہ - 'VOYAGES D' IBN BATOUTAH' C. DEFREMERY اور B.P. SANGUINETTI

متن اور ترجمہ پیرس، ۱۸۷۴ - ۷۹ء -

امپیریل گیزیٹر - دی امپیریل گیزیٹیر آف انڈیا، آکسفورڈ، ۱۹۰۹ء -

آئی - او (I.O.) دی انڈیا آفس - آئی - او (دیکھئے) فارسی مخطوطات کے ایتھے کے کیٹلاگ

کا اور آئی - او رکارڈس، انڈیا آفس میں محفوظ قلمی تحریروں کا مخفف ہے -

اقبال نامہ - معتمد خاں - اقبال نامہ جہاں گیری - لیتھو متن - لکھنؤ ۱۸۷۰ء - اقتباسات

VENERABLE W.K.FIRMINGER ** J.BRIGGS *

کا ترجمہ ایلیٹ (۶)، ۴۰۰۔

جیرٹ (JARRET) ۔ ایچ۔ ایس۔ جیرٹ کا آئین کی جلد ۲ و ۳ کا ترجمہ (جس کا حوالہ گذر چکا ہے)

جے۔ اے۔ ایس۔ بی۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ کلکتہ

جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن

خوانی۔ محمد ہاشم۔ خوانی خاں۔ منتخب اللباب۔ ببلیو تھیکا انڈیکا۔ ایلیٹ (۷)، ۲۰۷ میں جزوی ترجمہ۔

مآثر الامرا۔ شاہ نواز خاں۔ مآثر الامرا۔ ببلیو تھیکا انڈیکا۔

اولڈ فورٹ ولیم۔ سی۔ آر۔ ولسن۔ 'OLD FORT WILLIAM IN BENGAL' لندن ۱۹۰۶ء

اور (.OR) اورنیٹل۔ برٹش میوزیم میں مخطوطات کے ایک سلسلہ کا معروف نام۔ اس لفظ کے بعد جو عدد آتا ہے وہ ریئو کے کیٹیلاگ یا بعد کے اضافوں کی فہرست میں اس مخصوص مخطوطہ کا عدد ہے۔

پلسارٹ۔ 'THE REMONSTRANTIE OF FRANCISCO PELSAERT' کا ڈبلو۔ ایچ۔ مورلینڈ اور پی۔ گل* کا زیر عنوان 'JAHANGIR'S INDIA' ترجمہ۔ کیمبرج، ۱۹۲۵ء۔

ریوسل۔ (REV. SEL) 'SELECTION FROM THE REVENUE RECORDS,' NORTH-WEST PROVINCES جلد (۱)، بابتہ ۱۸۱۸-۲۰ء کلکتہ، ۱۸۶۶ء

رو۔ 'THE EMBASSY OF SIR THOMAS ROE TO INDIA' مطبوعہ سر ڈبلو۔ فوسٹر، لندن، ۱۹۲۶ء

آر۔ اے۔ ایس (مورے)۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں فارسی مخطوطات کا مورے کا کیٹیلاگ۔

صالح۔ محمد صالح کمبو۔ عمل صالح، ببلیو تھیکا انڈیکا۔ ایلیٹ (۷)، ۱۲۳ میں اقتباسات کا ترجمہ۔

ساقی۔ محمد ساقی مستعد خاں۔ مآثر عالمگیری۔ ببلیو تھیکا انڈیکا۔ ایلیٹ (۷) ۱۸۱ میں اقتباسات کا ترجمہ۔

---

* P. GEYL

ط۔اکبری۔ نظام الدین احمد۔ طبقاتِ اکبری' (یا اکبرشاہی)۔ ببلیوتھیکا انڈیکا میں ایک جز طبع ہوا۔ ایلیٹ (۵)، ۱۷۷ میں جز کا ترجمہ۔ غیر مطبوعہ حصّوں کے لیے میں نے اُور ۲۲۷۴، ایڈ ۳۴۴۶۵ اور آر۔ اے۔ ایس، ۴۶ (مورلے) کو استعمال کیا ہے۔

ت۔مبارک شاہی۔ یحیٰی بن احمد۔ تاریخ مبارک شاہی؛ مخطوطات اُور ۵۳۱۸، اُور ۱۶۷۳، ایلیٹ (۴)، ۶ میں جزُ کا ترجمہ۔

ط۔ناصری۔ منہاج السراج۔ طبقاتِ ناصری' ہندوستان کے متعلق حصّہ ببلیوتھیکا انڈیکا میں ہے ایلیٹ (۲)، ۲۵۹ میں جزُ کا ترجمہ۔

ت۔شیرشاہی۔ عباس خاں سروانی۔ تاریخ شیرشاہی' مخطوطات' اُور ۱۶۴۱ اور ۱۷۸۲۔آئی۔او (ایتھے) ۲۱۹ اور ۲۲۰۔ ایلیٹ (۴)، ۳۰۱ میں جزُ کا ترجمہ۔

ٹرپسٹرا۔ ایچ ٹرپسٹرا۔* 'DE OPKOMST DER WESTER-KWARTIEREN VAN DE OOST – INDISCHA COM. ہیگ، ۱۹۱۸ء۔

تزک۔ شہنشاہ جہانگیر۔ تزک جہانگیری؛ متن مطبوعہ سید احمد، علی گڑھ، ۱۸۶۴ء ترجمہ زیر عنوان 'MEMOIRS OF JAHANGIR" از اے۔ راجرس مطبوعہ ایچ۔ بیورج، لندن ۱۹۰۹ء-۱۴ء۔

*H. TERPSTRA